زندگی کے سماجی مسائل
ماہنامہ
چہارسو
راولپنڈی

..... ہماری قومی شناخت کا خوف .....

یادش بخیر، ایک زمانہ تھا جب اندھی قوت کے بل پر سلطنتیں قائم کی جاتی تھیں۔ برصغیر میں مغل سلطنت کا قیام اور صدیوں بعد اس کی جانشیں برطانوی سلطنت کا قیام اور استحکام بھی کُشت وخون اور قتل وغارت کا ہی نتیجہ تھا۔ پھر انسانی ارتقاء کے اگلے مرحلے پر جمہوریت کا چلن عام ہوا۔ نتیجہ یہ کہ آسٹرو ہنگیرین ایمپائر کے مانند سلطنتیں ٹوٹ پھوٹ کر آزاد اور خودمختار جمہوریتوں میں ڈھلنے لگیں۔ یورپ میں آسٹرو ہنگیرین ایمپائر ٹوٹی تو اُس کے اندر سے متعدد آزاد اور خودمختار ممالک نکلے۔ میں نے آج تک نہ کہیں پڑھا نہ کسی سے سُنا کہ ان آزاد اور خودمختار جمہوری ممالک کو پھر سے اُسی پرانی سلطنت میں واپس ضم کر دینا مناسب ہے۔ اس کے برعکس برٹش انڈین ایمپائر کے ٹوٹنے کے بعد سے دنیا کی چند بالادست قوتوں کو یہ غم ستائے چلا جا رہا ہے کہ برصغیر کی وحدت کیوں ٹوٹی؟ پاکستان کو مٹا کر پھر برصغیر کی اس سامراجی وحدت کو کیوں کر بحال کیا جائے؟ مگر گردشِ ایام ہے کہ پیچھے کی طرف لوٹنے کا نام ہی نہیں لیتی۔

اس کتاب میں شامل وقتاً فوقتاً لکھے گئے مضامین درج بالا سوالات پر مغربی سپاہ دانش کی فکرِ پریشاں سے پھوٹنے والے خیالات پر انسانی ارتقاء کی روشنی میں قومی اندازِ نظر سے غور وفکر کا حاصل ہے۔ ..... پروفیسر فتح محمد ملک

جنوری ۲۰۱۳ء کی یہ مجلد کتاب پورب اکادمی، اسلام آباد سے ایک صد پچانوے روپے میں دستیاب ہے۔

..... رہ نوردِ شوق .....

اکرام بریلوی نے ''راہ نوردِ شوق'' لکھ کر اپنی گزشتہ ناول نگاری سے ایک الگ فضا قائم کی ہے۔ اس میں ایشیا کے علاوہ یورپ اور شمالی امریکا کے تہذیبی اور سماجی مسائل کو انسانی نفسیات کے حوالے سے پیش کیا گیا ہے۔ میں نے اس ناول کے مطالعے سے اندازہ لگایا ہے کہ یہ ناول کسی موضوع کا نہیں بلکہ کرداروں کا ناول ہے۔ ان میں حسن حرمت، حسن مصباح، ریحان بانو، کرنیل سنگھ، اودھے سنگھ، فرخ زادہ، میرا، زویا، حمیرا سید، شازیہ، سرمد، ایستھر قابل ذکر ہیں۔ ناموں ہی سے اندازہ ہو گیا ہوگا کہ کلچر اور مذہب وعقیدہ ان کی شناخت نہیں۔ یہ ایک عالمی فضا میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ آج کے زردار معاشرے کے صاحبِ وسائل افراد شاندار ہوٹلوں میں ٹھہر کے شراب نوشی اور جنسی عیاشی کو حاصلِ حیات سمجھتے ہیں۔ اکرام بریلوی چونکہ Permissive Society کو عملاً برت رہے ہیں اس لیے اس کی تصویر کشی میں ان کا قلم رواں دواں نظر آتا ہے۔ ..... پروفیسر سحر انصاری

تین سو بیالیس صفحات پر مشتمل سالِ نو کی یہ مجلد کتاب چار سو روپے کے عوض ویلکم بک پورٹ، اردو بازار، کراچی سے دستیاب ہے۔

..... پھول عقیدت کے .....

ماسٹر سندر داس سُندرؔ ۱۵/ مارچ ۱۸۸۸ء تحصیل پھالیہ، گجرات (پاکستان) کے موضع سوہڑا میں پیدا ہوئے۔ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد خالصہ کالج گوجرانوالہ میں بطور اردو، فارسی پروفیسر تقرری ہوئی۔ ماسٹر سندر داس شعر بھی کہتے تھے اور سُندرؔ تخلص تھا۔ آپ اردو، فارسی اور پنجابی زبانوں میں شاعری کرتے تھے۔ عام شعری روش یعنی گل وبلبل کی داستانوں سے آپ کی شاعری کو کوئی سروکار نہیں بلکہ آپ کے جذبات واحساسات صالح قدروں کی ترجمانی کرتے ہیں۔ اشعار میں کہیں کہیں طنز کی چنگاریاں بھی موجود ہیں۔ بعض اردو نظموں میں فارسی کے مصرعے نگوں کی طرح جڑے ہوئے ہیں۔ آپ کی اکثر نظمیں گورو صاحبان کی تعلیمات اور ان کی زندگی کے اہم واقعات پر مبنی گلہائے عقیدت ہیں۔ زیرِ نظر مجموعہ کلام کو فن کی کسوٹی پر پرکھنے کی بجائے ماسٹر سُندر داس سُندرؔ کے جذبہ وخیال کی داد دینی چاہیے۔ ..... ڈاکٹر سلطان انجم

ایک سو بیس صفحات مجلد پر مشتمل ۲۰۱۲ء کی ادبی سوغات دو صد روپے کے عوض کوٹھی نمبر ۱/۵۰۲، فیز۔۶، سیکٹر ۵۵، موہالی سے دستیاب ہے۔

N.P.R- 063

زندگی کے ساتھ ساتھ

چہارسُو

جلد۲۲، شمارہ: مارچ، اپریل ۲۰۱۳ء

بانی مدیر اعلیٰ
سید ضمیر جعفری

مدیر مسؤل
گلزار جاوید

مدیران معاون
بینا جاوید
فاری شا
محمد انعام الحق

مجلسِ مشاورت

قارئین چہارسُو

زرِ سالانہ

دلِ مضطرب نگاہِ شفیقانہ

رابطہ: 537/D-1، ویسٹریج-III، راولپنڈی، پاکستان۔
فون: 5462495,5490181-51-(92+)
فیکس: 5512172-(92+)
موبائل: 0558618-336-(92+)
ای۔میل: chaharsu@gmail.com

۔ ویب سائٹ ۔

http://chaharsu.wordpress.com

پرنٹر: فیض الاسلام پرنٹنگ پریس ٹرنک بازار راولپنڈی

متاعِ چہارسو

سرِ ورق، پسِ ورق۔۔۔۔۔۔شعیب حیدر زیدی

تزئین۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔عظمیٰ رشید

کمپوزنگ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ تنویرالحق

قرطاسِ اعزازِ افضل

سلامت رہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔بیدل بیوطنی ۵

رشکِ قمر۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔عروب شاہد ۶

ابنِ شگوفہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ صاعقہ مقبول ۷

براہِ راست۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔گلزار جاوید ۹

سخن آزردہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔قمر علی عباسی ۱۲

میرے ہر قدم کا ساتھی۔۔۔۔۔۔نیلوفر علیم عباسی ۱۵

بنانے والے کی تعریف۔۔۔۔۔سلطان جمیل نسیم ۱۷

شام تجھے سلام۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔مامون ایمن ۲۲

گلاب کی سرخ کلی۔۔۔۔۔۔۔۔۔محمود شام ۲۴

دلی دور ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔اکرام بریلوی ۲۶

منظرِ اِک بلندی پر۔۔۔۔۔۔۔۔۔نورالسعید اختر ۲۸

بھاوج کا تحفہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔قمر علی عباسی ۳۱

تین دوست۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔قمر علی عباسی ۳۳

وطن کا محافظ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔فاری شا ۳۵

قرطاسِ اعزازِ اعلیٰ

غزلوں کا دیوان۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔قمر انجم ۴۰

وہی خدا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔نیلوفر علیم عباسی ۴۱

مجلس چہارسو۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔عطیہ سکندر علی ۴۲

میری نیلو باجی۔۔۔۔۔۔۔۔۔ڈاکٹر آصف فرخی ۴۶

فنونِ لطیفہ کی تاجدار۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔انجم خلیل ۴۸

کلیاں سر اٹھانا چاہتی ہیں۔۔۔۔۔۔نصرت انور ۴۹

گئے دنوں کا سراغ۔۔۔۔۔۔۔ نیلوفر علیم عباسی ۵۱

حسنِ عقیدت

سرور انبالوی، نسیمِ سحر، نورین طلعت عروبہ، عارف شفیق۔ ۵۳

افسانے

اندر کا رنگ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔نیلم احمد بشیر ۵۵

صنم تراشیدہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔آغا گل ۵۹

محبت کے افسانے۔۔۔۔۔۔۔۔ڈاکٹر رینو بہل ۶۳

ٹک ٹک دیدم۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔سید سعید نقوی ۶۴

جوشِ جنوں

محمود الحسن، آصف ثاقب، مشکور حسین یاد، خیال آفاقی، انتظار باقی، غالب عرفان، یوگیندر بہل، عبدالرحمٰن، حسن عسکری کاظمی، حنیف ساحل، صدیق شاہد، انوار فیروز، عاشق ہرگانوی، رب نواز مائل، جاوید زیدی، رومانہ رومی۔ ۶۸

افسانے

انتہائی مطلوب۔۔۔۔۔۔۔۔۔شہناز خانم عابدی ۷۶

خلیج سے واپسی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔تشنہ بریلوی ۸۰

آہ میرا بھائی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔شاہد جمیل ۸۴

جانِ آرزو۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔گلزار جاوید ۸۶

پندارِ نگیں

زہیر کنجاہی، نعیم الدین، مظہر بخاری، نور زمان، کرشن گوتم، شگفتہ نازلی، صابر عظیم، ندیم ہاشمی، عرش صہبائی، تصور اقبال، کرشن پرویز، نوید سروش، سلیم ناز، شبیر حسن، ایم۔زیڈ کنول۔ ۸۸

ہوا کے دوش پر

ایک عام کی داستانِ حیات۔۔۔۔۔۔۔فیروز عالم ۹۳

رنگوں بھری ممٹیاں

اقتدار جاوید، سعید نقوی/شوکت فہمی، صدف مرزا، جاوید زیدی، کرشن گوتم، طالب زیدی، عظمیٰ صدیقی، غالب عرفان، رب نواز مائل، انوار فیروز، شگفتہ نازلی، جہانگیر اشرف۔ ۹۸

آئینۂ فن

عالمی اردو مرثیہ کانفرنس۔۔۔۔۔۔۔۔۔راشد جمال ۱۰۶

نشانِ راہ

ہم زباں چپ ہوگئے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔نند کشور وکرم ۱۰۹

ایک صدی کا قصّہ

کے۔ایل۔سہگل۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ دیپک کنول ۱۱۳

رس رابطے

جستجو، ترتیب، تدوین۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ وقار جاوید ۱۱۷

○

کیا خوب اردو کو انداز دیا
رنگ سفرناموں میں نیا بھر دیا
سلامت رہے تُو اے قمر عباسی
ولولہ بچوں کو بھی جینے کا دیا

(بیدل بیوٹنی)

○
○○○

قرطاسِ اعزاز افضل

○

قمر علی عباسی

○

کے نام

○○○
○

''رشکِ قمر''

عروب شاہد
(اسلام آباد)

نام : قمر علی عباسی
پیدائش : ۱۳؍جون ۱۹۳۸ء
مقام : امروہہ (یو۔پی۔انڈیا)
والد : جناب یعقوب علی عباسی
والدہ : محترمہ کنیز فاطمہ
بہن بھائی : ذیشان عباسی، ثمر علی عباسی، ظفر علی عباسی، منور علی عباسی، درخشاں عباسی

جائے تعلیم:
کوہ مری (پرائمری تعلیم)، حیدر آباد سندھ، گورنمنٹ کالج حیدر آباد، جامعہ سندھ

تعلیمی اسناد:
بی۔اے آنرز، ایم۔اے معاشیات، ایم۔اے اُردو

ٹریننگ:
نیشنل براڈ کاسٹنگ اسکول لندن
اے آئی بی ڈی کورس (ملائیشیا)
انوسٹی گیٹر (Investigator)

ملازمت:
لیکچرر: معاشیات نیشنل کالج کراچی
مدیر اعلیٰ: پاکستان کالنگ، آہنگ شعبہ مطبوعات ریڈیو پاکستان
کنٹرولر/ اسٹیشن ڈائریکٹر: ریڈیو پاکستان کراچی
ایڈیٹر: انفولائن جنگ کراچی
چیف ایڈیٹر: ہفت روزہ عوام نیویارک

بچوں کی کتابیں:
۱۔رحمدل ڈاکو ۲۔بہادر شہزادہ ۳۔شیشے کی آنکھ ۴۔ایک تھا مرغا ۵۔بہادر علی ۶۔شرارتی خرگوش ۷۔سمندر کا بیٹا ۸۔کائیں کائیں میاؤں میاؤں ۹۔ہمارا پاکستان ۱۰۔عزم عالی شان ۱۱۔قوت عوام ۱۲۔منزل مراد ۱۳۔چوہدری رحمت علی ۱۴۔علامہ اقبال ۱۵۔قائداعظم محمد علی جناح

سفرنامے:
۱۔لندن لندن ۲۔دِلّی دُور ہے ۳۔چلا مسافر سنگاپور ۴۔امریکہ مت جیئو ۵۔برطانیہ چلیں ۶۔واہ برطانیہ ۷۔ایک بار چلو وینس ۸۔نیل کے ساحل ۹۔بغداد زندہ باد ۱۰۔لرنا کا آیا ۱۱۔لاپیرس ۱۲۔قرطبہ قرطبہ ۱۳۔جاناں سوئیزرلینڈ ۱۴۔اور دیوار گر گئی ۱۵۔ترکی میں عباسی ۱۶۔کینیڈا انتظار میں ۱۷۔شونار بنگلہ ۱۸۔ماریشس میں دھنک ۱۹۔میکسیکو کے میلے ۲۰۔سنگاپور کی سیر ۲۱۔عمان کے مہمان ۲۲۔صحرا میں شام ۲۳۔سات ستارے صحرا میں ۲۴۔شام تجھے سلام ۲۵۔ہندوستان ہمارا ۲۶۔لنکا ڈھائے ۲۷۔ساحلوں کا سفر ۲۸۔ناسوہرا ہے ۲۹۔ذکر جل پری کا ۳۰۔ہوا ہوائی

سوانح عمری:
۱۔32 ناٹ آوٹ
۲۔اِک عمر کا قصہ

کالموں کا مجموعہ:
دل دریا

اعزازات:

۱۔	اے پی این ایس بہترین کالم نگار ایوارڈ۔	۱۹۹۲ء
۲۔	بے نظیر ٹیلنٹ ایوارڈ۔	۱۹۹۵ء
۳۔	بہترین کالم نگار ایوارڈ۔	۱۹۹۶ء
۴۔	صوبائی اسمبلی ایوارڈ برائے ادب۔	۱۹۹۷ء
۵۔	پاکستان رائٹر گلڈ ایوارڈ برائے سفرنامہ ''سات ستارے صحرا میں''	۲۰۰۷ء
۶۔	پاکستان رائٹرز گلڈ ایوارڈ بچوں کا بہترین ادب	۱۹۷۳ء
	//	۱۹۷۶ء
	//	۱۹۸۲ء
	//	۱۹۸۷ء
۷۔	گولڈ میڈل ادبی ایوارڈ، ڈنمارک	۲۰۰۴ء
۸۔	طباطبائی ایوارڈ بہترین ادیب، لاس اینجلس	۲۰۰۷ء
۹۔	کراچی یونیورسٹی المنائی ایوارڈ۔کینیڈا	۲۰۱۱ء
۱۰۔	لٹریری سوسائٹی مکتا گاشا ایوارڈ، بنگلہ دیش	۲۰۰۲
۱۱	تمغہ امتیاز	۲۰۰۰ء

دیگر بے شمار ایوارڈز، جن کی فہرست بہت طویل ہے۔

☆

''ابنِ شگوفہ''

صاعقہ مقبول

(اسلام آباد)

۱۷ر مارچ ۱۹۹۶ء

کراچی

مشفق قمر علی صاحب، تسلیم۔

''دلی دُور ہے'' اس کتاب کو میں نے حرفاً حرفاً پڑھا۔ کتابیں کئی قسم کی ہوتی ہیں اور اس لحاظ سے ان کے پڑھنے کی تکنیک بھی الگ الگ ہوتی ہے۔ بعض کی سرسری ورق گردانی سے ان کا ماحصل مل جاتا ہے۔ بعض کو پڑھنے میں غور وفکر کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کتاب کو میں نے تفصیل سے پڑھا تو یہ مصنف کے اندازِ تحریر کا کمال تھا جس میں بڑی جاذبیت ہے۔ خواجہ حسن نظامی کی تحریر میں بھی (یادشِ بخیر) یہی خوبی تھی۔ معمولی واقعات میں ڈرامائی تاثر پیدا کر دینا یہ بڑی بات، بڑا آرٹ ہے اور فطری جوہر پڑھنی۔

اس کتاب کے ساتھ میں نے بھی ہندوستان کا سفر کر لیا۔ وہ مقامات بھی دیکھے جہاں کبھی جانا نہیں ہوا تھا اور وہ بھی جو دیکھے بھالے تھے۔ دونوں کا بیان یکساں، دلچسپ معلوم ہوا۔ صحیفہ نگاری ایک نقطہ پر آ کر ادب بن جاتی ہے۔ یہاں بھی بعض جگہ شعر کی سی تاثیر پیدا ہوگئی ہے۔ ہر تخیل پیرایۂ بیان بھی ہے الفاظ کے برتنے کا سلیقہ بھی۔ افسانوی دلکشی کے ساتھ واقعہ نگاری، مسکراتا ہوا انداز اور مزاح کی چاشنی اس پر مستزاد۔

اس تحریر کا مقصد جو بے اختیار قلم سے نکلی اُس رطب کا اظہار ہے جو مجھے اس کتاب کے مطالعے سے ملا۔ مبارکباد اور دلی شکریہ۔

شان الحق حقی

یکم اکتوبر ۱۹۸۴ء

لاہور

محترمی ومکرمی جناب قمر علی عباسی، سلام مسنون۔

آپ کا خط مورخہ ۲۵ر ستمبر ۱۹۸۴ء بمعہ فوٹو کاپی مسودہ ''شاعرِ اسلام مفکر پاکستان ڈاکٹر محمد اقبال'' موصول ہوگئے جن کے لیے میری طرف سے شکریہ قبول فرمایئے۔ میں نے مسودہ دیکھ لیا ہے حضرت علامہ اقبال کے سوانح حیات سے متعلق بچوں کے لیے ابھی تک کوئی مناسب کتاب تحریر نہیں کی گئی۔ آپ یہ بہت بڑی خدمت انجام دے رہے ہیں کہ بچوں کو کتابی شکل میں تفریحی ادب کے ساتھ ساتھ آسان زبان میں قیامِ پاکستان کے پس منظر کے بارے میں معلومات فراہم کی جاسکیں اور اسی سلسلے میں آپ نے حضرت علامہ اقبال کے سوانح حیات پر مشتمل کتاب شائع کرنے کا ارارہ کیا ہے جبکہ مسوّدے کی فوٹو کاپی مجھے ارسال کی گئی ہے۔

جاوید اقبال

۱۰ر مئی ۲۰۰۴ء

حیدرآباد، دکن

منکہ محبی قمر علی عباسی صاحب، تسلیمات۔

میں آپ کے سفرنامے نہایت ذوق وشوق کے ساتھ پڑھتا ہوں، کبھی کبھی اس نکتے پر غور کر کے حیران رہ جاتا ہوں کہ آپ نے ڈھیر سارے ملکوں کا سفر کرنے کے لیے اتنا سارا وقت کیسے نکال لیا اور جب سفر کرنے میں اتنا سارا وقت کھپا دیا تو سفرنامے لکھنے کے لیے آپ کو وقت کہاں سے مل گیا، اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے زندگی میں دو ہی کام کیے ہیں، آپ یا تو سفر کرتے رہتے ہیں اور جب سفر نہیں کر رہے ہوتے تو سفرنامہ لکھ رہے ہوتے ہیں۔

آپ کے سفرناموں کے تقریباً تیس سے زائد مجموعے شائع ہو چکے ہیں ماشاءاللہ کیا ذوقِ سفر ہے اور کیا شوق سفرنامہ نگاری ہے۔ سفرنامہ نگاری کے معاملے میں آپ کا سٹیمنا، لگن اور حوصلہ قابل رشک ہے۔ میں جغرافیہ کے مضمون میں یوں بھی کمزور ہوں، آپ کے سفرناموں کو پڑھ کر اندازہ ہوا کہ دنیا میں اتنے سارے ممالک موجود ہیں، واقعی دنیا کتنی بڑی ہے اور انسان کتنا چھوٹا جسے آپ اپنی تحریر کے ذریعہ بڑا بنانا چاہتے ہیں، کبھی کبھی تو ڈر ہوتا ہے کہ آپ کے سفرناموں کی وجہ سے دنیا میں سیر وسیاحت کی صنعت کو کوئی نقصان نہ پہنچ جائے، لوگ ملکوں ملکوں کے اسفار پر بے دریغ رقم خرچ کرنے کے بجائے اپنے گھروں میں بیٹھے بیٹھے آپ کے سفرناموں کو پڑھ کر سفر کے مزے لوٹنے کی کوشش کریں گے، وہ تو اچھا ہوا کہ سائنس دانوں نے ابھی تک مریخ کو تسخیر نہیں کیا ہے ورنہ آپ اس کی بھی سیاحت کر کے ایک سفرنامہ لکھ لیتے۔

آپ کے سفرناموں کی سب سے بڑی خوشی وہ شگفتگی زندہ دلی اور خوش دلی ہے جو جگہ جگہ پائی جاتی ہے، کوئی ملک کتنا ہی سنجیدہ اور وہاں کے باشندے کتنے ہی ثقہ کیوں نہ ہوں، خدا نے آپ کو جو یہ دولت بخشی ہے اس کے باعث آپ کا اسلوب تحریر بے حد رواں دواں، سُبک چابکدست، بے تکلف تروتازہ اور مزے دار بن گیا ہے۔ چھوٹے چھوٹے واقعات کو آپ اپنے منفرد اسلوب میں ایسی فنکارانہ مہارت کے ساتھ بیان کر جاتے ہیں کہ پڑھنے والا آپ کی تحریر کے سحر میں ڈوب جاتا ہے بلکہ جہاں آپ کا سفرنامہ ختم ہوتا ہے وہاں سے وہ اپنی زندگی کے ایک نئے سفر کا آغاز بھی کرتا ہے۔

آپ غالباً اردو کے واحد ادیب ہیں جس نے اپنے کراماً کاتبین کو بہت زیادہ محنت کرنے کی آزمائش میں مبتلا نہیں رکھا کیونکہ کراماً کاتبین کو آپ کے سلسلے میں جو کچھ لکھنا چاہیے تھا وہ آپ نے پوری سچائی اور نیک نیتی کے ساتھ

بزعم خود اپنے لاتعداد سفرناموں میں لکھ دیا ہے۔ اس اعتبار سے آپ اپنے سفر ناموں کے حوالے سے بھی جنت میں داخلہ پانے کے حقدار بن گئے ہیں، میری دلی مبارکباد قبول فرمایئے، میری دعا ہے کہ آپ کا ادبی سفر جوتا دیر جاری رہے گا اس میں سفرنامہ نگاری ہمیشہ شامل رہے۔

آپ کی بے مثال سفرنامہ نگاری کے علاوہ مجھے آپ ویسے بھی عزیز ہیں کہ آپ کا تعلق امروہہ جیسی مردم خیز سرزمین سے ہے، اگرچہ دکن کا ہوں لیکن امروہہ سے تعلق رکھنے والی کئی ہستیوں سے میرے گہرے مراسم رہے ہیں۔ صادقین، جون، ایلیا، پروفیسر نثار احمد فاروقی، زبیر رضوی، حکیم کلب علی شاہد، کن کن کا ذکر کروں! میں نے بھی غلطی سے کچھ سفرنامے لکھے ہیں لیکن آپ کے بے شمار سفرناموں کے آگے میرے ان مختصر سفرناموں کی حیثیت اونٹ کے منہ میں زیرے کے برابر والی بات بن گئی ہے یہی وجہ ہے کہ آپ کے سفرناموں کو پڑھ کر کبھی ذہن میں ''مسافرانہ چشمک'' کا خیال نہیں آیا بلکہ رشک کا جذبہ ضرور دل میں پیدا ہوا۔

مجتبیٰ حسین

۱۷ر مئی ۱۹۹۴ء

لاہور

یارِ دلربا قمر علی عباسی۔

تمہاری شخصیت وفن کے بارے میں آدمی کیا کہے اور کیا نہ کہے!

ایک ایسا شخص جو معاشرے سے نہ ڈرتا ہو۔ جو نقادوں سے نہ ڈرتا ہو۔ اور جو اپنی بیوی سے نہ ڈرتا ہو (ایک سے زائد کی صورت میں بیویوں سے نہ ڈرتا ہو) کیونکہ سفرنامہ ایک ایسی صنف ہے جو افسانے یا ناول کی طرح ''صاف چھپتے بھی نہیں'' پر یقین نہیں رکھتی۔ اس میں سامنے آنا پڑتا ہے۔ جو دیکھا ہے جو محسوس کیا ہے اُسے بیان کرنا پڑتا ہے اور گواہی آپ کی اپنی نہیں قمر علی عباسی کی ہوتی ہے۔ افسانے یا ناول کے کسی کردار سلیم یا شیخو کی نہیں ہوتی کہ بعد میں آپ مُکر جائیں اور کہیں کہ یہ تو میرے خیالات نہیں میرے افسانے کے ایک کردار کے ہیں۔ یہاں آپ ہر لفظ کے ذمہ دار ہیں۔ اور اگر آپ احتیاط نہیں کرتے تو یہ آپ کی FIR ہے اور آپ کے خلاف باآسانی حدود کا مقدمہ درج ہوسکتا ہے۔ ایک افسانے یا ناول کا کردار کچھ بھی کرسکتا ہے اور کچھ نہیں کہا جائے گا۔ سفرنامے کا ''میں'' اگر لڑکی کا ہاتھ پکڑ لے تو قیامت آجاتی ہے۔ چنانچہ آپ اگر سفرنامہ نگار ہیں تو ایک دلیر شخص ہیں۔ آپ معاشرے کا سامنا کرسکتے ہیں اور اپنی بیوی کا سامنا کرتے ہیں (اور اُسے ایک وفادار خاوند کی طرح یقین دلاتے ہیں کہ سفر نامے میں جن خواتین کا تذکرہ ہے وہ سب کی سب تو فکشن ہیں۔ اور اگر ایک آدھ سچ مچ کی تھی تو اُس کے ساتھ ابن خلدون کے فلسفۂ تاریخ کے بارے میں مذاکرات ہوتے تھے) اور نقاد کا سامنا کرتے ہیں۔ اور یہ نقاد ایک ایسی ''شے'' ہے جو بیہودہ ترین افسانے یا انشائیے کو تو ادب کی صنف مانتا ہے لیکن سفرنامہ چاہے قرۃ العین حیدر یا ٹالسٹائی کا لکھا ہوا ہو اُسے نہیں مانتا۔ کیونکہ وہ خود بے چارہ پتوکی سے پرے نہیں گیا اور اُسے مکمل یقین ہے کہ پتوکی سے پرے کوئی دنیا نہیں اور جو لوگ اُس دنیا کے بارے میں لکھتے ہیں وہ ادب سے مخلص نہیں ہوسکتے۔

چنانچہ صرف ایک بہادر شخص۔

قمر علی عباسی بھی ایک بہادر شخص ہے لیکن اسے بہادر بننے کا خیال دیر سے آیا ہے اور اس کی کتابوں کی ضخامت دیکھ کر خیال آتا ہے کہ دیر آید تندرست آید۔ اردو ادب میں کم ہی لوگوں نے اتنے مسلسل اور اتنے خوبصورت سفرنامے لکھے ہیں (جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے سنسکرت اور چینی ادب میں بھی یہی صورت حال ہے) قمر جتنا اچھا لکھتا ہے اُس سے شدید حسد کرنا چاہیے لیکن میں اُن تمام لوگوں سے محبت کرتا ہوں جو معاشرے سے نہیں ڈرتے، نقادوں سے نہیں ڈرتے اور بیویوں سے نہیں ڈرتے۔

مستنصر حسین تارڑ

۹ر مارچ ۱۹۸۴ء

اسلام آباد

برادرِ محترم قمر علی عباسی صاحب، احترامات۔

آپ کی گراں بہا کتاب پا کر دل باغ باغ ہوگیا۔ سادہ اور سلیس عبارت میں آپ کی یہ کتاب علامہ اقبالؒ کا خوبصورت تعارف ہے۔ اس کتاب کے پڑھنے والے کی عمر کی مناسبت سے واقعات کی نوعیت کا خیال رکھا گیا ہے اس کتاب کو بچے لُطف سے پڑھیں گے کیونکہ اس کی معلومات ان کے اُبھرتے ذہنوں کے لیے بوجھ اور الجھن نہیں بنتیں۔ علامہ اقبالؒ جیسے مفکر اور شاعر پر اس طرح لکھنا آسان نہیں۔ مجھے اس کتاب میں علامہ اقبالؒ کی شخصیت، بچوں کے لیے دلکش بن کر اُبھرتی معلوم ہوتی ہے۔

ہمارے ہاں بچوں کے اچھے ادب کی کمی ہے۔ آپ کی کوشش تحسین کے لائق ہے کہ آپ نے اس خلا کو محسوس کیا اور ہمارے بچوں کو ایک اچھی کتاب پڑھنے کو ملی۔

ڈاکٹر محمد افضل

(مرکزی وزیر تعلیم)

۷ر نومبر ۱۹۹۸ء

اسلام آباد

عزیزِ من عباسی صاحب! خوش رہیے۔

''لندن لندن'' کے مطالعہ کے بعد ہم نے آپ کو شوقیہ سفرنامہ نگار تصور کرتے ہوئے جس قدر ہلکا لیا تھا آپ اُس کے مقابلے میں کہیں زیادہ وزنی ثابت ہو رہے ہیں۔ اگر آپ کی رفتار اور انداز یہ ہی رہا تو ایک دن لوگ باگ ابن بطوطہ کو بھول کر ابنِ شگوفہ کو یاد کیا کریں گے۔

سید ضمیر جعفری

براہِ راست

اردو ادب کے مشرقی مزاج اور تہذیب وتمدن کے باعث ترقی یافتہ قوموں اور اُن کے ادب سے ہمرشتہ نہ ہونے کے باعث بہت سے نئے تصورات، خیالات، تھیوریز اُس قدر ہماری توجہ حاصل نہ کر سکے جس طور وقت کا تقاضا تھا۔ کچھ ایسی ہی کیفیت سفرنامے کے باب میں پائی جاتی ہے۔ خوشی اس بات کی ہے کہ آج کے دور کا اعلیٰ تعلیم یافتہ، روشن خیال اور روشن دماغ سفرنامہ نگار اس صورتِ حال سے دل برداشتہ ہوا نہ اُس نے کبھی ہتھیار پھینکنے کی بابت سوچا۔ قمر علی عباسی ایسے ہی روشن خیال اور روشن فکر کے حامل سفرنامہ نگار ہیں۔ وہ نہ صرف سفرنامہ نگار بلکہ اردو ادب کی تمام اصناف پر یکساں قدرت رکھتے ہیں۔ آپ کی کہانیاں، ڈرامے، کالم، مضامین بالخصوص بچوں کی کہانیاں ہر علاقے، عمر اور ماحول میں یکساں پسند کیے جاتے ہیں۔ آج کی نشست ہماری آواز میں آواز ملانے کا بہترین موقع ہے جسے آپ یقیناً گنوانا ہرگز نہ چاہیں گے۔

گلزار جاوید

☆ سب سے پہلے یہ فرمایئے کہ آپ کے نام کے ساتھ لفظ عباسی کی اضافت کس بنا پر لگی ہوئی ہے؟

☆☆ گلزار صاحب! کچھ سوالات ایسے ہوتے ہیں جن کا بیان تفصیل چاہتا ہے۔ اصولی طور پر تو یہاں میرا یہ حق بنتا ہے کہ میں اپنا شجرۂ نسب بیان کروں مگر میں آپ کو زحمت سے دوچار کرنا نہیں چاہتا مختصر طور پر اتنا جان لیجیے کہ یہ میرا خاندانی نام ہے اور اس کی نسبت عباسی خلفاء سے بنتی ہے۔

☆ آپ کا بچپن تحیر اور تجسس سے پُر رہا ہے کیوں نہ گفتگو کا آغاز امروہا کی یادوں سے کیا جائے؟

☆☆ جب میرے والد نے پاکستان آٹپ کیا تو میں چھوٹا تھا اس لیے امروہہ میں بچپن کی کوئی یاد ذہن میں واضح نہیں۔

☆ لازمی طور پر اس کے بعد پاکستان آمد، قیام اور جدوجہد کی روداد بیان ہونا چاہیے؟

☆☆ میں اپنے والد والدہ اور بہن بھائیوں کے ساتھ دسمبر ۱۹۴۷ء میں کوہ مری پہنچا، میرے والد سروے آفیسر تھے اور اُن کا ہیڈ آفس وہاں تھا میں نے وہاں پرائمری کی تعلیم حاصل کی اور پھر وہاں سے حیدرآباد سندھ سکونت اختیار کی اور اپنی تمام تعلیم وہیں مکمل کی۔

☆ بزمِ نوآموز مصنفین کی بنیاد کس شوق اور جذبے کے تحت ڈالی گئی انجام سے آغاز تک کی کہانی بیان فرمایئے؟

☆☆ بزمِ نوآموز مصنفین کی بنیاد جنگ اخبار کے بچوں کے صفحے کے انچارج شفیع عقیل (بھائی جان) نے رکھی تھی اور میں اُس میں دوسرے نوعمر ادیبوں شاعروں کے ساتھ سرگرم تھا۔

☆ ادب سے آپ کے تعلق کی ابتداء بچوں کی کہانیاں لکھنے سے ہوتی ہے اس جانب رجحان کے اسباب بتلایئے اور کچھ روشنی ابتدائی کہانیوں کی اشاعت اور پذیرائی پر بھی ڈالیے؟

☆☆ میں امروہہ میں پیدا ہوا، وہاں کے لوگ شاعری کرتے ہیں افسانے لکھتے ہیں یا مُصور ہوتے ہیں بس اسی وجہ سے میں نے بھی لکھنا شروع کیا، روزنامہ جنگ بچوں کے صفحے پر میری کہانیاں شائع ہوتی تھیں یہ وہ زمانہ تھا کہ روزنامہ جنگ ہر گھر میں پڑھا جاتا تھا۔ اس لیے مجھے بھی اپنی کہانیوں کے بارے میں بہت کچھ اچھا سننے کو ملتا جس کی وجہ سے یہ سلسلہ جاری رہا۔

☆ اس کے بعد انجم کے تخلص سے آپ شاعری پر مہربان ہوئے مگر کچھ عرصے بعد ہی تائب ہو گئے؟

☆☆ امروہے میں پیدا ہونے کی وجہ سے اور دھیال ننھیال میں ہر شخص کے شاعر ہونے کی وجہ سے میری گھٹی میں بھی دائی نے شعر ڈالے تھے۔ اس لیے اسی سے ابتدا کی اور حیدرآباد، سکھر، میرپور خاص کے بہت سے مشاعروں میں شرکت کی۔ اُس زمانے میں حیدرآباد سندھ میں قابل اجمیری، حمایت علی شاعر، محسن بھوپالی، صبا اکبرآبادی، رعنا اکبرآبادی، برگ یوسفی، ارتضیٰ عزمی، سوز شاہ جہاں پوری، پیکر واسطی اور اختر سکندروی، غنی دہلوی جیسے پائے کے شاعر موجود تھے۔ میں نے بہت سوچا اور یہ یقین پختہ ہو گیا کہ میری شاعری میں شاید وہ بات پیدا نہ سکے جو ان شاعروں کے کلام میں ہے اس لیے کوچۂ شعر وسخن سے باہر نکل آیا اور میرے خیال سے اچھا ہی کیا۔

☆ کم از کم ہم آپ سے اس شعر کے مخاطب کی بابت ضرور جاننا چاہیں گے:

کیا قیامت ہے قمر انجم
چاند پورا ہے روشنی کم ہے

☆☆ یوں سمجھ لیں:

گل کو چوما چاند کو دیوانہ وار آواز دی
اِک پردہ اُن کے اپنے درمیان رہنے دیا

☆ اس کے بعد آپ نے خود کو قمر امروہوی کے نام سے موسوم کر لیا اور جلد ہی خدا حافظ کہہ دیا۔ اس کی بھی کوئی وجوہات رہی ہوں گی؟

''چہارسُو''

☆☆ ایک زمانہ تھا کہ لوگ اپنے نام کے ساتھ آبائی نام فخریہ لگاتے تھے پھر یہ ہوا کہ وہ دور آہستہ آہستہ دُور ہوتا گیا ہم نے اپنے آبائی شہر، بزرگوں کی سرزمین کو نام سے ہٹا کر دل میں اُتار لیا جو مستقل ہے۔

☆ اگلا دور اعلیٰ تعلیم کا آتا ہے جہاں تقریری مقابلوں، مباحثوں اور انعامات کی تفصیل کا ذکر ضروری ہے؟

☆☆ تعلیم حاصل کی جتنی ممکن ہو سکی تھی۔ بی۔اے آنرز، ایم۔اے معاشیات اور اُردو ادب میں ماسٹرز کی ڈگریاں حاصل کیں۔ مباحثوں میں حصہ لیا، سندھ، پنجاب کے بیشتر کالجوں میں اس سلسلے میں جانا ہوا۔ اُس زمانے کے ممتاز مقررین محمد عارف، علی مختار رضوی، معراج محمد خاں، ظہور الحسن بھوپالی، دوست محمد فیضی، شفیق پراچہ، علی رضا شاہ نقوی اور بہت سے ساتھیوں کے ساتھ ان گنت تقریری مقابلوں میں حصہ لیا اور بے شمار انعامات اور ٹرافیاں حاصل کیں۔

☆ متروکہ املاک وقف بورڈ کی ملازمت اور لیکچرر شپ آپ کی چوائس تھی یا مجبوری؟

☆☆ ملازمت کوئی بھی ہو معاشی مجبوری ہوتی ہے لیکن ہم نے پہلے محکمۂ اوقاف میں تقریباً ملازمت کی اور شوقیہ لیکچرر شپ کی۔

☆ جوانی سب پر ٹوٹ کر آتی ہے مگر آپ کی جوانی کو منہ زور اور سرکش کیوں گردانا گیا؟

☆☆

جنوں کا نام خرد رکھ دیا خرد کا جنوں
جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

☆ C.S.S کا امتحان پاس کرنے کے بعد لوگوں کی خواہش ڈپٹی کمشنر یا کمشنر بننے کی ہوا کرتی ہے آپ نے ریڈیو کا انتخاب کس جذبے کے تحت کیا؟

☆☆ دراصل زندگی میں جب انتخاب کا موقع ملے تو گنوانا نہیں چاہیے۔ اسی لیے میں نے ریڈیو پاکستان میں شمولیت کو ترجیح دی۔

☆ ضیاء الحق کے اقتدار کے دوران آپ پر جو کڑا دور آیا اُس کے اسباب کیا تھے اور اس سے نجات کیونکر مل سکی؟

☆☆

نہ چھیڑ اے نکہت باد بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹھکھلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

میں ماضی کے اُن لمحوں کو یادوں کے البم میں نہیں سجاتا جو اندھیرے ہیں اور دُکھ دیتے ہیں۔

☆ یونیسکو سے ایوارڈ یافتہ ڈرامہ ''بہادر علی'' کس تحریک اور جذبے کے ساتھ لکھا اور اُس کی اس قدر پذیرائی کیونکر ہوئی اس کے علاوہ ریڈیو ٹیلی ویژن پر کیا کچھ تحریر کیا اور اُسے کس نظر سے دیکھا گیا؟

☆☆ جب بھی کچھ لکھا جاتا ہے تو وہ دراصل مِن جانب اللہ ہوتا ہے۔ بہادر علی ایک خیال تھا جو کاغذ پر آیا تو بہت سے لوگوں تک پہنچا اور پذیرائی ہوئی یہ بھی اللہ کا کرم تھا۔ ٹیلی ویژن پر بے شمار ڈرامے لکھے اور بہت سے سیریل تحریر کیے۔ جب تک پاکستان میں رہا یہ سلسلہ جاری رہا پھر امریکہ آ گیا اور یہ سلسلہ رک گیا۔

☆ آپ کا پہلا سفر نامہ ''لندن لندن'' بتلایا جاتا ہے۔ آپ ہمیں اس جانب توجہ کے اسباب اور احباب کے ردِعمل سے آگاہ کیجیے؟

☆☆ آپ کا خیال درست ہے میرا پہلا سفر نامہ ''لندن لندن'' ہے۔ اُسے کچھ اس طرح پذیرائی ملی کہ سفر نامے لکھنے کا سلسلہ جاری رہا اور ابھی تک اللہ کے کرم سے سفر نامے لکھ رہا ہوں۔

☆ ''لندن لندن'' کا پہلا ایڈیشن اغلاط سے پُر کیوں تھا اس سہو کا ذمہ دار کون ہے اور دوسرے ایڈیشن میں درستگی کرنے والے اعظمی صاحب کی بابت آپ کے احساسات کیا ہیں؟

☆☆ ''لندن لندن'' کی پہلی اشاعت میں کتابت کی غلطی کے تین لوگ ذمہ دار ہیں۔ کاتب، پبلشر اور مصنف۔ جہاں تک دوسرے ایڈیشن میں غلطیوں کا نہ ہونا ہے اس کا الزام حمید اعظمی صاحب کو نہ دیا جائے ان کا اس معاملے میں کوئی لینا دینا نہیں ہے۔ اس میں بھی کاتب، پبلشر اور مصنف ذمہ دار ہیں۔

☆ آپ کی تحریر میں تجزیہ نگاری جس قدر نمایاں ہے اس کی روشنی میں آپ کے اندر ایک افسانہ نگار تلاش کرنا نامناسب تو نہیں؟

☆☆ بالکل مناسب ہے۔ افسانہ نگار تلاش کریں مجھے اطلاع دیں میں بھی مل کر خوش ہوں گا۔

☆ جوں جوں آپ کی سفر نامہ نگاری کا سفر آگے کی طرف بڑھتا ہے آپ کا قلم رواں اور بیباک نظر آتا ہے مگر آپ کی فطرت اور ذوقِ سلیم کے برخلاف جب جب جہاں جہاں صنفِ نازک کا ذکر آتا ہے تو آپ کے قلم کی روانی اور بیبا کی مدھم پڑ جاتی ہے؟

☆☆ آپ نے بالکل درست سوال کیا ہے اکثر جب صنفِ نازک نظر آتی ہے تو قدم رک جاتے ہیں تو پھر بھلا قلم کیوں نہ رُکے۔ یہ دراصل احترام حُسن اور ستائشِ زیبائی ہے۔

☆ بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ آپ کے پیشِ نظر معیار کی نسبت رفتار رہا کرتی ہے جو قاری کو اکثر کھلتی ہے؟

☆☆ رفتار، معیار یہ سب کچھ لکھنے والے کے پیشِ نظر نہیں ہوتا۔ قاری اگر ایسا محسوس کرتا ہے تو وہ میرے سفر نامے کو رک رک کر پڑھے اُسے تیز رفتاری کا گمان نہیں ہوگا۔

☆ بہت سے پڑھے لکھے لوگ Travel اور Travel louge

Guaid کوایک ہی دستاویز کے زمرے میں کیوں شمار کرتے ہیں؟

☆☆ اگر کچھ لوگ امرود اور سیب کو ایک سمجھتے ہیں تو کیا کیا جا سکتا ہے۔ بہتر ہے وہ قاری سفرنامے کے بجائے ٹریول گائیڈ پڑھیں اور خوش رہیں۔

☆ ایک حلقے کا خیال یہ بھی ہے کہ آپ کا تمام تر تحرک اور جستجو شہرت کی تلاش میں ہے؟

☆☆ دنیا میں ہر شخص کے دل میں بظاہر یا چھپا ہوا جذبہ شہرت کا ہوتا ہے جس کے لیے لوگ نہ جانے کیا کیا پاپڑ بیلتے ہیں۔ اگر ایک سفرنامہ نگار کسی ملک کی روداد لکھ کر یہ سمجھتا ہے کہ اُسے شہرت مل جائے گی تو اُسے یہ سوچنے کا حق ہے اور خیال پر کوئی پابندی نہیں۔

☆ سفرنامے کو ابھی تک ادب کی صنف تسلیم نہیں کیا گیا آپ کے خیال میں اس کے اسباب کیا ہیں نیز ناول کی طرح یہ صنف کب تلک اپنا آپ منوانے میں کامیاب ہو سکے گی؟

☆☆ ہر لکھنے والا اپنی خوشی، اطمینان، سکون اور دوسروں سے کچھ کہنے کے لیے لکھتا ہے اگر کوئی اسے ادب سمجھے نہ سمجھے لکھنے والے کو اس سے کوئی واسطہ نہیں۔ سفرنامہ ادب ہے نہیں ہے یہ صرف لکھنے والا فیصلہ کر سکتا ہے کوئی تنقید نگار، مبصر یہ فیصلہ صادر نہیں کر سکتا کیونکہ وہ اُس کی عدالت میں اپنا مقدمہ لے کر نہیں گیا ہے۔

☆ پاکستان میں موجود سفرنامہ نگاروں میں آپ کی کتب کی تعداد سب سے زیادہ ہے یقیناً آپ کو پسند کرنے والے بھی بے شمار ہوں گے۔ اس نشست میں آپ ہمیں اپنے پسندیدہ سفرنامہ نگاروں کی بابت بتلایئے؟

☆☆ مجھے شفیق الرحمٰن، ابن انشاء، مجتبیٰ حسین بہت پسند ہیں اور باقی لکھنے والوں کو بھی میں شوق سے پڑھتا ہوں۔

☆ آپ نہیں سمجھتے کہ زندگی کا قیمتی حصہ سفر اور سفرناموں کی نذر کر کے آپ نے اہلِ خانہ اور اردو ادب سے ناانصافی کی ہے؟

☆☆ میں سمجھتا ہوں کہ نہ میں نے اہل خانہ کا حق مارا نہ اُردو ادب کو کوئی نقصان پہنچایا نہ اپنا وقت ضائع کیا۔ میں نے جو کیا سوچ سمجھ کر کیا۔ آئندہ بھی ایسا ہی کروں گا۔

☆ ''تھرٹی ٹو ناٹ آؤٹ'' ایک طرح سے آپ کی سوانح عمری گردانی جا سکتی ہے مگر اس میں آپ حقیقت سے زیادہ مصلحت پسند دکھائی دیتے ہیں؟

☆☆ میرا خیال ہے تھرٹی ٹو ناٹ آؤٹ میں میں نے مصلحت سے نہیں حقیقت سے کام لیا ہے کوشش یہ کی ہے کہ قلم سچ لکھے ورنہ بند رہے۔

☆ ریڈیو کی ملازمت سے سبکدوشی کے بعد ادارہ جنگ نے آپ کو اہم ذمہ داری سونپ دی تھی آج کی نشست میں آپ ہمارے قارئین کو وہ حالات و واقعات بتلایئے جس کے باعث سب کچھ چھوڑ کر آپ کو امریکہ آنا پڑا؟

☆☆ ایک طویل داستان ہے مختصراً یہ کہ بس حالات کو دیکھتے ہوئے فیصلہ کیا چلو امریکہ چلیں۔

☆ اتنا عرصہ گزرنے کے بعد بھی آپ نے اس کی جستجو نہیں کی کہ آپ جیسے صلح جو انسان سے کسی کو کیا خطرہ لاحق ہو سکتا ہے یعنی اُن لوگوں کی نشاندہی ہو سکی کہ نہیں جن کے باعث آپ بے وطن ہوئے؟

☆☆ نو کمنٹس (No Comments)

☆ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ ساری کہانی یا ڈرامہ امریکہ نیشنلٹی حاصل کرنے کے لیے رچایا گیا؟

☆☆ اس طرح کی سوچ کے حامل اپنے مہربانوں کے لیے میں دعا ہی کر سکتا ہوں البتہ! آپ کی اور اُن کی تسلی کے لیے یہ عرض کرتا چلوں کہ میں امریکن شہریت ۱۹۹۱ء میں حاصل کر چکا تھا اُس کا استعمال میں نے چند ناخوش گوار حالات و واقعات کے باعث ۱۹۹۹ء میں کیا۔

☆ اگر پاکستان میں حالات قطعی طور پر سازگار ہو جائیں تو امریکہ اور پاکستان میں سے آپ کا انتخاب کیا ہوگا؟

☆☆ پاکستان میری منکوحہ ہے اور امریکہ محبوبہ۔۔۔ دونوں ضروری ہیں۔

☆ نیا سال آپ کی زندگی میں بہت اہمیت کا حامل ہے اور اس کو آپ خوش آمدید بھی اپنے طریقے سے کہتے ہیں۔ ہمارے قارئین کو امریکہ میں گزرے نئے سالوں کی تفصیل بتانا پسند کریں گے؟

☆☆ چراغاں، جشن، شاپنگ اور خوشیاں ہر قدم، ہر گام، ہر جگہ۔

☆ آج کل آپ اور آپ کے صاحبزادے کالم نگاری کی جانب مائل ہیں۔ نجانے کیوں دونوں شخصیات میں احباب آپ کا پرتو تلاش کرتے ہیں؟

☆☆ احباب بالکل صحیح کرتے ہیں بیٹے میں باپ کا پرتو ہونا ضروری ہے وہ وارث ہوتا ہے ہر روایت کا۔

☆ اردو ادب میں کتاب خرید کر پڑھنا ایک طرح سے معیوب سمجھا جاتا ہے آپ کا شمار اسٹال ویلیو کے اہلِ قلم میں ہوتا ہے۔ کتب کی رائلٹی اور پبلشر کے رویے کی نسبت آپ کا حسنِ ظن کیا ہے؟

☆☆ میں اُن خوش نصیب لوگوں میں ہوں جنہیں ویلکم بک پورٹ کراچی جیسا ادارہ ملا ہے جو ایمانداری سے کتاب چھاپتے رائلٹی دیتے اور ہر طرح سے کتاب فروخت کرنے کا اہتمام بھی کرتے ہیں۔

☆ آپ نے جس قدر بھی علمی، ادبی، سیاحتی اور صحافتی کام کیا ہے اُس کے بدلے اردو ادب سے آپ کی توقعات کیا ہیں اور اُن کے پورا ہونے کے امکانات کس قدر ہیں؟

☆☆ اردو ادب کی وجہ سے مجھے ان گنت ایوارڈ ملے، انعامات سے نوازا گیا ہر سطح پر پذیرائی ہوئی۔ صدر مملکت، وزیراعظم نے اعزازات سے نوازا۔ مجھے میری توقع سے زیادہ سراہا گیا۔

''سخن آزردہ''

قمر علی عباسی

ہم لندن کے علاقے کوئینز وے کے ہوٹل اپالو میں بڑے سکون سے رہتے تھے۔ بی بی سی کے ہارون جعفری کو یہ اچھا نہیں لگا، انہوں نے یہ خبر شعیب فاروقی کو پہنچادی۔ یہ صاحب ہمارے ساتھ سندھ یونیورسٹی میں تھے۔ یہ بھی لیڈر تھے۔۔۔ او ہم بھی اسی کام میں مصروف تھے۔ یونیورسٹی سے نکلے تو سب ہی دنیا کے بازار میں ادھر اُدھر ہو گئے۔ لندن پہنچے تو ہارون جعفری نے بتایا کہ شعیب یہاں رہتے ہیں۔۔۔ اتنے عرصے سے کہ بعض گوروں سے زیادہ پرانے ہیں۔

ایک دن شام کو ہارون جعفری ہمارے پاس شعیب فاروقی کو لے آئے، دیر تک پرانی باتیں دہراتے رہے۔ اُن سارے لوگوں کو یاد کیا جو نجانے کس بھیڑ میں گم ہو چکے تھے۔ رات جب اچھی طرح بھیگ گئی تو یہ لوگ جانے لگے اور شعیب نے کہا میں کل شام کو آ کر تمہارا ساماں لے جاؤں گا۔ اب میرے ساتھ رہنا ہوگا۔۔۔! ہم اسے تکلف سمجھے۔۔۔ اکثر احباب اور جاننے والے پردیس میں یہ پیش کش کرتے ہیں۔ دوسرے دن ہم ذرا دیر سے ہوٹل پہنچے۔۔۔ استقبالیہ پر شعیب فاروقی بیٹھے تھے۔ ہم انہیں لے کر کمرے میں آئے۔۔۔ وہ ادھر اُدھر بکھرا ہوا سامان سمیٹنے لگے۔ ہم نے پوچھا تو بولے بس میرے ساتھ چلو۔ اُنہیں بہت سمجھایا بتایا کہ اس کا کرایہ برٹش کونسل دیتی ہے۔ یہاں ناشتہ مفت ملتا ہے۔ اس علاقے میں کئی پاکستانی ریسٹورنٹ ہیں، ہمارے ساتھ رعایت بھی کرتے ہیں۔ شعیب فاروقی نے ہماری بات نہ سنی۔۔۔ اور ہم نے مجبور ہو کر کہا کہ کل کمرے کی ادائیگی کر کے ساتھ چلیں گے۔ وہ بولے کہ میں اس ہفتے کی ادائیگی کر چکا ہوں۔۔۔ یہ کہہ کر جیب سے رسید نکال کر دکھائی۔ ہم نے اُنہیں پھر سمجھایا وہ کہنے لگے ٹھیک ہے۔۔۔ مجھے یہ فکر ہے کہ کہیں تمہارا کردار اور چال چلن خراب نہ ہو جائے۔ کوئینز وے اس معاملے میں ایک عالم میں بدنام ہے۔ ہم نے کہا۔۔۔ ''پہلے ہی بگڑے ہوئے ہیں۔۔۔!'' شعیب فاروقی نے سامان کمرے سے باہر گھسیٹتے ہوئے کہا۔۔۔

''مزید کی اجازت نہیں ہے۔۔۔''

شعیب فاروقی شیفرڈ بس میں نارلینڈ ہاؤس میں رہتے تھے۔ دو کمرے کا اپارٹمنٹ، ایک کمرہ ہمارے حصے میں آیا۔ صبح کا ناشتہ، رات کا کھانا مفت۔ دوپہر کو ہم نیشنل براڈ کاسٹنگ اسکول کے کینٹین سے کچھ کھا لیا کرتے تھے۔

ہم صبح سویرے اُٹھتے ہیں۔ شعیب فاروقی ہم سے بھی پہلے اُٹھنے کے عادی تھے۔ ہم جب بھی کچن کے برابر ڈرائنگ روم میں آتے تو شعیب کو میز کے گرد کرسی پر بیٹھا دیکھتے۔۔۔ سامنے بڑا سا کافی کا مگ بھرا ہوا۔۔۔! ٹیبل لیمپ جلائے، چشمہ لگائے ایک کتاب پڑھتے، کبھی مسکراتے۔۔۔ کبھی چہرے پر آزردگی آ جاتی۔۔۔ کبھی سپاٹ۔۔۔! اس وقت نہ وہ ادھر اُدھر دیکھتے نہ بات کرتے۔ آدھے گھنٹے تک کتاب کے مطالعے کے بعد اُسے بند کر دیتے اور دیوار سے لگی ایک دراز کھولتے، کتاب رکھتے اور تالا لگا کر چابی جیب میں ڈال لیتے۔۔۔ شروع میں ہم سمجھے یہ کوئی متبرک کتاب کا مطالعہ کرتے ہیں۔ ایک دن چپکے سے دبے پاؤں ان کی پشت سے آ کر دیکھا تو وہ کوئی اردو کی کتاب تھی۔ جب یہ پڑھ چکے تو ہم نے پوچھا

''یہ کون سی کتاب پڑھتے ہو۔۔۔؟''

فرمایا۔۔۔ ''یہ پڑھے لکھوں کی کتاب ہے۔ تمہارا اس سے کوئی تعلق نہیں۔۔۔!''

ہم نے کہا۔۔۔ ''یہ اردو میں ہے، ہم اردو پڑھنا جانتے ہیں۔۔''

فرمایا۔۔۔ ''یہ اردو نہیں اردوئے معلیٰ ہے۔۔۔'' اور بات ختم کر دی۔ ہمیں تشویش ہوئی اور اس کھوج میں لگ گئے کہ یہ کون سی کتاب ہے۔۔۔؟

شعیب فاروقی ایک گولڈ رفائنری میں کام کیا کرتے تھے اور ساڑھے سات بجے صبح موسم کی پرواہ کئے بغیر نکل جاتے اور رات گئے واپس آتے۔ ہم نے بازار سے ایک پتلی نوک کا اسکروڈرائیور خریدا اور ایک دن اِن کے جانے کے بعد اُن کی دراز کھولنے کی کوشش کی جس میں وہ متبرک کتاب رکھتے تھے، لیکن وہ دراز کھل نہ سکی۔ ایک دن ڈسکاؤنٹ پر ایک ٹول بکس مل گیا اُس میں مختلف سائز کے اسکروڈرائیور تھے، ہم نے وہ خریدا اور ذرا سی کوشش کے بعد دروازہ کھولنے میں کامیاب ہو گئے، جو کتاب وہ پڑھتے تھے۔۔۔ سامنے رکھی تھی۔ ہم نے جلدی سے اُٹھا کر دیکھا۔۔۔ اُس کتاب کا نام تھا ''آگ کا دریا''۔ شعیب فاروقی کے ذوق پر افسوس ہوا۔ کوئی ایسی کتاب بھی ہے جسے ہر روز عقیدت سے پڑھا جائے۔ آگ کا دریا ہم نے کئی سال پہلے پڑھی تھی اور پسند بھی کی تھی۔۔۔ لیکن اس حد تک نہیں۔۔۔!

شام کو بی بی سی کینٹین میں ہارون جعفری سے ہم نے اس واقعے کا ذکر کیا۔۔۔ وہ کہنے لگے۔۔۔ ''شعیب فاروقی تو پاگل ہے۔۔۔!''

ہم نے کہا ''تمہیں کیسے معلوم ہوا؟''

اُس نے کہا ''اُس کی حرکتوں سے''

ہم نے کہا ''کچھ تفصیل بتاؤ۔۔۔ ہم اُس کے ساتھ رہتے ہیں۔۔ کسی دن حملہ نہ کر دے۔۔۔!''

ہارون جعفری نے کہا۔۔۔ ''وہ ایسا پاگل نہیں ہے۔۔۔!''

ہم نے پوچھا''پھر۔۔۔؟''

انھوں نے کہا''وہ قرۃ العین حیدر کی تحریروں کا پاگل ہے۔تمہیں پتہ ہے پچھلے سال اُس نے کیا کیا۔۔۔''

ہم نے کہا''نہیں ہم تو یہاں تھے ہی نہیں''

جعفری کہنے لگا۔۔۔''شعیب فاروقی عمرہ کرنے گیا تھا۔ایک قرۃ العین حیدر کا بھی کیا۔۔۔''

ہم نے کہا''واقعی۔۔؟''

وہ بولا''ہر روز''آگ کا دریا'' پڑھ کر قرۃ العین حیدر کے لیے سو سال زندہ رہنے کی دعا مانگتا ہے۔''

ہم نے کہا''تمہیں یہ سب کچھ کیسے معلوم ہوا۔۔۔؟''

وہ بولا۔۔۔''پچھلے سال میں، تین مہینے تک اُس کے گھر میں تھا۔اس کے پاگل بننے کی وجہ سے گومتم کے اپارٹمنٹ میں شفٹ ہوا ہوں۔ہم پریشان ہو گئے اور پوچھا کہ ہم کیا کریں۔۔۔؟

وہ بولا۔۔۔''تمہارا کیا ہے۔۔۔ دو مہینے کے بعد چلے جاؤ گے۔۔۔اُسی کے یہاں ٹکے رہو''

ایک رات کو گیارہ بجے ٹیلی فون آیا۔گھنٹی بجی تو ہمیں پتہ چلا کہ شعیب کے گھر میں ٹیلی فون بھی ہے جو خاموش رہتا تھا۔شعیب نے ریسیور اٹھایا اور کہا۔

''اس وقت تو رات کے گیارہ بجے ہیں کل میں کام پر جاؤں گا، پرسوں رات آٹھ بجے آجاؤ۔۔۔کھانا کھا کر آؤ گے چلو کافی ساتھ پئیں گے۔۔۔خدا حافظ۔۔!''

ہم نے فون پر اتنی مختصر بات چیت کبھی نہیں سنی تھی۔ہم نے پوچھا کون تھا۔۔۔؟

فرمایا۔۔۔''اپنا طلعت حسین۔۔۔!''

''کیا وہی، اپنے ریڈیو والے۔۔۔؟''

کہنے لگے۔۔۔''ہاں بھئی۔۔''

ہم نے کہا۔۔۔''بلا لیا ہوتا۔۔۔!''

شعیب بولے۔۔۔''رات کے گیارہ بجے۔۔۔؟ صبح مجھے جاب پر جانا ہے بیکار کے تکلف مجھے پسند نہیں۔پرسوں وہ آئیگا پھر لمبی گپ لڑائیں گے''

تیسرے دن رات کو آٹھ بجے اپارٹمنٹ کی گھنٹی بجی، شعیب نے بلڈنگ کا انٹر کام اُٹھا کر کہا۔۔۔''بس دو منٹ میں آتے ہیں۔۔۔''اور بند کر دیا۔

ہم نے کہا''کون ہے۔۔۔؟''

وہ بولے۔۔۔''اپنا فنکار ہوگا۔۔۔لندن میں ٹائم پر آیا ہے۔''

ہم نے کہا۔۔۔''اوپر بلا لیا ہوتا۔۔۔!''

انہوں نے کوٹ پہنا اور ہمیں باہر لے کر نکل لیے۔استقبالیہ پر پہنچے تو طلعت حسین کھڑے تھے۔وہ ہمیں اور ہم اُنہیں دیکھ کر خوش ہوئے۔ پاکستان کی خبریں معلوم کرنے لگے۔بلڈنگ سے باہر نکلے تو سرد ہوا نے استقبال کیا۔نزدیک ہی ایک ریسٹورنٹ تھا، چھوٹا لیکن سلیقے سے سجا ہوا صاف ستھرا۔ ایک میز کے گرد بیٹھ کر شعیب نے کافی کا آرڈر کیا۔طلعت حسین اُن فنکاروں میں سے ہیں، جنہیں ادب سے گہرا لگاؤ ہے۔دانشوری کی حد تک یہ نثری نظم کے خالق قمر جمیل اور نقاد ضمیر بدایونی کے حلقے میں تھے۔اس لئے پوچھا ۔۔۔''(آگ کے دریا) کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے۔۔۔''

طلعت حسین نے کہا'' بکواس ہے۔اس قسم کی تحریروں سے مجھے ہمیشہ کوفت ہوتی ہے۔یہ کون چھاپتا ہے اور کون پڑھتا ہے۔۔۔''شعیب فاروقی نے یہ سنا تو اُٹھا اور واش روم کی طرف چلا گیا۔ہم نے کہا''طلعت تم نے غضب کر دیا۔یہ آدمی تو''آگ کا دریا'' کے لیے پاگل ہے۔روز صبح وہ ناول اس طرح پڑھتا، اگر وہ مذہبی کتاب ہوتی تو کسی درجے کا پیر ضرور ہو جاتا۔طلعت حسین گھبرا گئے اور بولے مجھے تو مارچ کے مہینے میں دوبارہ لندن آنا ہے اور اسی کے گھر ٹھہرنے کا پروگرام ہے۔اب کیا کروں؟ ہم نے کہا وہ آرہا ہے۔ہم دوبارہ باتیں کریں گے۔تم تعریف کر دینا۔۔۔!

شعیب آکر بیٹھا اُس کے چہرے پر کافی پیئے بغیر تلخی تھی۔ہم نے کہا ''طلعت حسین تم''آگ کے دریا'' کے بارے میں اس قسم کی خیالات کیوں رکھتے ہو۔۔۔؟''

طلعت حسین ذہین آدمی ہیں۔۔بولے''دراصل مجھے شمیم آراء کی اداکاری پسند نہیں آئی۔''شعیب کے ہاتھوں سے کافی کا کپ گرتے گرتے بچا۔ اس نے اپنے چشمے کے پیچھے حیران آنکھوں سے گھورتے ہوئے پوچھا تم فلم ''آگ کا دریا'' کی بات سمجھ رہے تھے۔؟''

طلعت حسین نے کہا۔۔۔''پھر۔۔۔؟''

شعیب فاروقی نے کہا۔۔''میں قرۃ العین حیدر کے ناول''آگ کا دریا'' کی بات کر رہا تھا۔۔۔!''

طلعت نے کہا۔۔۔''تو پھر یوں کہو نا۔۔۔اُس عظیم مصنفہ کی ہمیشہ زندہ رہنے والی تحریر کی بات کر رہے ہو نا۔۔۔؟''

شعیب فاروقی کے چہرے پر چیر بلاسم کھل اُٹھے اور پھر طلعت حسین تکلف کرتے رہے مگر شعیب فاروقی اصرار کرتا رہا۔۔۔اپنی جان کی قسمیں دیتا رہا۔

بی بی سی کے رضا علی عابدی کو ایک موقع مل گیا، انہوں نے ہمیں، طلعت حسین اور شعیب فاروقی کو ادبی پروگرام میں بلایا اور ساتھ ہارون جعفری کو بٹھا دیا۔موضوع تھا''اردو میں ناول نگاری'' شعیب فاروقی نے قرۃ العین کی ناول نگاری پر بات شروع کی۔اُن کے اندازِ بیان، کہانی کے تانے بننے کا طریقہ اور الفاظ کے چناؤ پر گفتگو شروع کر دی۔طلعت حسین نے اپنی رائے کا اظہار

کیا۔ہمیں کیونکہ لندن سے آنے میں چند ہفتے رہ گئے تھے اس لئے کہا قرۃ العین حیدر گیتا، شکنتلا اور رامائن سے متاثر ہیں۔بعض وقت تو احساس ہوتا ہے جملے تک وہی ہیں کرداروں کے۔یہ بات شعیب فاروقی کے لیے آگ پر تیل کا کام کر گئی۔اُس نے ذرا سی دیر میں اردو ادب کے افسانہ نگاروں اور ناول نگاروں کا تجزیہ کر دیا۔ڈپٹی نذیر احمد سے لے کر جمیلہ ہاشمی تک ہر افسانہ نگار اور ناول نگار کی خوبیوں کو بیان کر کے یہ ثابت کیا کہ قرۃ العین حیدر اردو کی ممتاز افسانہ نگار اور ناول نگار ہیں، جن کے انداز و معیار کو کوئی دوسرا چھو نہیں سکتا۔طلعت حسین بھی بھول گئے کہ مارچ میں آ کر انہیں شعیب کے گھر ٹھہرنا ہے۔ہارون جعفری ہائیں ہائیں کرتے رہے۔۔۔لیکن مذاکرہ میدانِ کارزار بن چکا تھا۔شیشے کی دوسرے طرف بیٹھے رضا علی عابدی کبھی ہنستے اور کبھی سر پکڑ کر بیٹھ جاتے۔اُس دن ہم نے اور طلعت حسین نے یہ بات دل سے تسلیم کر لی کہ قرۃ العین حیدر اردو ادب کا وہ روشن مینار ہیں جو اردو کے ہر جہاز کو راستہ دکھاتی ہیں۔

مذاکرے نے سنجیدہ رخ اختیار کر لیا۔ہارون جعفری بولے قرۃ العین حیدر صرف ''آگ کا دریا'' لکھ دیتیں تو اردو ادب کے لیے کافی تھا۔شعیب نے کہا اُنھوں نے گیارہ سال کی عمر سے لکھنا شروع کیا، پھر اتنا کچھ لکھ رہی ہیں کہ اُن کا کوئی ثانی نہیں۔''آگ کا دریا'' ہی کیا ''آخرِ شب کے ہمسفر''، ''میرے بھی صنم خانے''، ''پت جھڑ کی آواز''، ''گردشِ رنگِ چمن''، ''سیتا ہرن'' ''چاندنی بیگم''، ''کارِ جہاں دراز'' وغیرہ وغیرہ کا مطالعہ کریں تو ایک طرف ان کے ذہنی ارتقا کا سفر نظر آتا ہے اور دوسری طرف اُن کا مطالعہ مشاہدہ اور نئے انداز سے افسانہ لکھنا اور ناول تحریر کرنے کے فن کی بلندی کا احساس ہوتا ہے۔اُن کی تحریر میں ہجرت کا دکھ بھی ہے اور انسانوں کی تقسیم کا افسوس بھی۔وہ تمام عمر لکھتی رہیں اور لکھتی رہیں گی۔

طلعت حسین نے کہا اردو ادب میں ایسے کم مصنف ہیں جنہیں اُن کی زندگی میں ہی ان کے کام کو قدر و منزلت ملی، اُن کو ہندوستان میں ''گیان پیٹھ''، ''پدم شری'' اور ''پدم بھوشن'' جیسے اعلیٰ اعزازات ملے۔شعیب نے جملہ کاٹا ''حالانکہ انہیں کسی ایوارڈ کی ضرورت نہ تھی۔کسی ادیب کے لیے سب سے بڑا ایوارڈ پڑھنے والوں کی پسندیدگی ہوتا ہے اور دنیا میں جہاں جہاں اردو پڑھنے والے ہیں وہ قرۃ العین حیدر کی تحریروں کو پسند کرتے ہیں''۔

ہم نے کہا ''کسی ادیب کو اعزاز ملنا اُس کی نہیں ایوارڈ کی قدر و منزلت کو بڑھانا ہے۔''پدم شری'' ہو یا ''پدم بھوشن'' یہ اسی وقت معتبر ہوتے ہیں جب ان سے بڑا نام منسلک ہو جائے لیکن اُن کا سب سے بڑا ایوارڈ ہم ''آگ کا دریا'' سمجھتے ہیں۔یہ چھٹی قبل مسیح سے آج تک کی تہذیبی دستاویز ہے۔اُجاڑ مندروں کے صحن سے آج کے ماڈرن ڈرائینگ روم تک کی آپ بیتی ہے۔یہ کہانی۔۔۔یہ داستان۔۔۔یہ تہذیبی سفر آج تک جاری ہے۔یہ دنیا کا واحد ناول ہے جسے مصنفہ ہر سال آگے بڑھا سکتی ہے۔

یہ مذاکرہ اتنا طویل ہوا کہ رضا علی عابدی نے بتایا کہ اسے دو قسطوں میں نشر کریں گے۔

ہم شعیب کے سامنے قرۃ العین حیدر کی مخالفت اور پھر حمایت کر چکے تھے، اس لئے گھر پہنچے تو اُس نے مقفل دراز کھول کر ہمیں قرۃ العین حیدر کی وہ کتابیں بھی دکھا دیں جو اب کسی بک اسٹال پر دستیاب نہیں ہیں۔ان کتابوں کو حفاظت سے پلاسٹک کے کور میں رکھا گیا تھا۔

ہم نے زندگی میں کسی قاری کو اپنے پسندیدہ مصنف کی اس طرح قدر و منزلت کرتے نہیں دیکھا تھا۔۔۔!

ہم پاکستان لوٹ آئے۔۔۔کچھ عرصے بعد شعیب فاروقی بھی گوروں سے خفا ہو گئے۔ممکن ہے کسی برطانوی نے غلطی سے قرۃ العین حیدر پر تنقید کر دی ہوگی۔پاکستان آ کر ہم سے ملے اور منصوبہ بنانے لگے میں دامنِ کوہ میں ایک چھوٹی سے کٹیا بنا کر رہوں گا۔۔۔جہاں میری پسند کی کتابیں ہوں گی اور باہر گنگناتے، گاتے بہار اور پت جھڑ کے موسم ہوں گے۔ہم نے اندازہ لگایا کہ شعیب کا پاگل پن ابھی دور نہیں ہوا ہے۔لندن جیسے شہر سے نکل کر پاکستان کے چھوٹے سے گاؤں میں رہنا ناممکن ہے۔

ایک دن اُن کا خط ملا کہ میں نے ایبٹ آباد سے دور ایک پہاڑی گاؤں میں زمین خریدی ہے اور مکان بنا رہا ہوں۔پھر عرصہ گزر گیا۔اُن کا خط آیا کہ مکان بنا لیا ہے۔

''ایک لائبریری، ڈرائنگ روم جس کے آتش دان پر قرۃ العین حیدر کی کتابیں ہیں۔میں ہوں اور برستے موسم۔میں نے مکان کے آگے لوکی کی بیل لگائی ہے جس میں پیلے پھول لگائے ہیں۔تمہیں یاد ہے کہ ''آگ کا دریا'' میں یہی بیل جگہ جگہ نظر آتی ہے''

شعیب کے خط بہت طویل ہوتے تھے اُنہیں پڑھنے کے لیے کافی وقت درکار ہوتا تھا، جس میں وہ قرۃ العین حیدر کی تحریر پر تبصرہ کرتا تھا۔ہم سوچتے تھے اگر کسی ادیب کو شعیب فاروقی جیسا ایک قاری بھی مل جائے تو یہ منافع کا سودا ہے۔ہم جواب میں اُسے چند لائن لکھتے تھے۔

''تمہارا خط مل گیا۔۔۔تمہیں تفصیل جلد لکھیں گے۔۔۔لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا۔اُس کے خطوں کا سلسلہ بند ہو گیا۔اب سولہ سال گزر گئے جانے وہ اب ہے کہ نہیں۔۔۔؟''

کل لندن سے سلطانہ مہر کا فون آیا تھا کہ عینی آپا اسّی برس بعد چلی گئیں۔شعیب فاروقی اُن کے لیے سو سال جینے کی دعا کرتا تھا۔ہم سب سے یہ درخواست کریں گے۔۔۔خدارا قرۃ العین حیدر کے جانے کی خبر ایبٹ آباد نہ پہنچنے دیں۔۔۔ورنہ یہ شہر سے نکل کر کسی کچی پگ ڈنڈی سے ہوتی ہوئی شعیب فاروقی کے پہاڑی مکان تک پہنچ جائے گی تو شعیب پر کیا گزرے گی۔۔۔اس کا ہم تصور کرنا نہیں چاہتے۔

میرے ہر قدم کا ساتھی

نیلوفر علیم عباسی
(نیویارک)

قمر علی عباسی میری زندگی میں داخل ہوئے تو ایک ہلچل مچ گئی۔ زندگی و توانائی سے بھرپور، گھنٹوں کا کام منٹوں اور منٹوں کا سیکنڈوں میں انجام دینے والے، پارہ صفت اور میں ٹھہری ہمیشہ کی سہل پسند شاید دس برس کی عمر تک اکلوتی اولاد ہونے کی وجہ سے جو ناز نخرے میرے اُٹھائے گئے تھے یہ اُس کا نتیجہ تھا لیکن اس کا جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ اس ہر دم چاق و چوبند رہنے والے کا ساتھ دینے کے لیے مجھے عادتیں بدلنی ہوں گی۔ آج تک اسی کوشش میں لگی ہوں قمر علی عباسی صبح پانچ بجے اُٹھ جاتے ہیں تو میں سات بجے اُٹھ کر سمجھتی ہوں تیر مار لیا۔

عموماً ماتحتوں کو اپنے افسران سے اور افسران کو اپنے انڈر کام کرنے والوں سے شکایتیں رہتی ہیں لیکن یہاں میں ایک اقتباس سید علیم گیلانی کی تحریر سے حوالے کے طور پر پیش کروں گی کہ اندازہ ہو کہ جو لوگ صدقِ دل اور محنت سے کام کرتے ہیں افسران کا اُنہیں پسند کرنا ''مجبوری'' بن جاتا ہے۔

سید علیم گیلانی براڈ کاسٹنگ اور شعر و ادب کا ایک بڑا نام ہے کہ جنہوں نے ریڈیو ٹیلی ویژن اور فلم کو مہدی حسن، ریشماں، شہناز بیگم، مہدی، ظہیر، افتخار عارف، عبداللہ بیگ قریش پوری جیسے متعدد فنکار، موسیقار، کمپوزر، اینکرز دیئے۔ وہ لگی لپٹی نہیں رکھتے تھے، ریڈیو پاکستان کے ڈائریکٹر جنرل بنے تو اس کی کارکردگی کو عروج پر پہنچایا۔ قمر علی عباسی کے بارے میں لکھتے ہیں:

''عباسی نے بہت کچھ کیا، ہر طرح کے پروگرام کئے اور نام کمایا، چاق و چوبند، بہت جاگے ہوئے، محنتی جو کام سونپا گیا اُسے پوری ذمہ داری سے نبھانے کی کوشش کی، خود تو عباسی کو نہ جانے اپنی کون سی ادا پسند ہو گی مگر میرے خیال میں ان کا سب سے بڑا اور منفرد کارنامہ ریڈیو کے رسالے ''آہنگ'' کی ترتیب نو ہے، جب میں نے یہ کام ان کے سپرد کیا تو مجھے گمان بھی نہیں تھا کہ وہ اسے اس بلند معیار تک پہنچا دیں گے''۔

قمر علی عباسی ایک وقت میں کئی مختلف کام یکساں خوش اسلوبی سے انجام دیتے ہیں، ۱۹۹۸ء کی بقر عید کا تیسرا دن تھا عباسی نے کچھ کاغذات دیئے ''انہیں پڑھ لیجیے'' پڑھنا شروع کیا تو پتہ چلا کہ انہوں نے ریڈیو کی ملازمت کے آغاز کا تذکرہ کرتے ہوئے اپنی یادوں کو قلمبند کیا ہے، میں خوش ہو گئی کیونکہ میں چاہتی تھی کہ بہت سی بکھری ہوئی باتیں یادیں اور واقعات یکجا ہو جائیں۔ آٹو بائیو گرافی قسم کی کوئی چیز ہو مگر اُنہوں نے اس کو اپنی بتیس سالہ ریڈیو کی ملازمت تک محدود رکھا۔

قمر علی عباسی کا ایک کمال یہ ہے کہ نہایت تیز لکھنا اور سینکڑوں مصروفیات کے درمیان لکھنا ہر قسم کے ماحول، گرد و پیش سے بے نیاز ہو کر، ایک خوشگوار حیرت سے میں اُس وقت دوچار ہوئی جب گیارہویں دن اُنہوں نے اپنی ریڈیو کی یادداشت ''32 ناٹ آوٹ'' پڑھنے کو دی۔ کتاب کا مسودہ مکمل تھا، اِن گیارہ دنوں میں دفتری مصروفیات، ہفتہ وار کالمز، تقریبات کا سلسلہ بدستور تھا، نہ جانے کس وقت لکھتے تھے؟

قمر علی عباسی کسی سفر پر نکلیں کوئی چیز نوٹ بک میں تحریر نہیں کرتے دماغ کے کمپیوٹر میں محفوظ کر لیتے ہیں پھر بھی واقعات کو جس تواتر اور شگفتگی سے بیان کرتے ہیں وہ ان ہی کا خاصہ ہے۔ مشکل اور بھاری بھر کم الفاظ، تشبیہات و استعارات کا سہارا لے کر اپنی تحریر کو پُر اثر بنانے کی کوشش نہیں کرتے سیدھے سادھے الفاظ میں سچائی بیان کرتے ہیں۔ شگفتگی، بے ساختگی دلچسپی صرف تحریر کا نہیں شخصیت کا بھی حصہ ہیں اس لیے عام قاری ان کو اپنے قریب تر محسوس کرتا ہے اور یہی سب سے بڑی وجہ ہے کہ بغیر کسی سفارش بغیر کسی بیکنگ یا گروپ سے وابستہ ہوئے قمر علی عباسی کو اللہ تعالیٰ نے پانچ بار رائٹرز گلڈ ایوارڈ، وزیر اعظم کے اے پی این ایس ایوارڈ اور صدارتی تمغۂ امتیاز کے علاوہ بھی متعدد ایوارڈز سے نوازا۔

مشکل سے مشکل وقت میں بھی قمر علی عباسی گھبراتے نہیں۔ جنرل ضیاء الحق کے دور کا آغاز تھا شاہ سے زیادہ ''شاہ کے مصاحب'' ایکٹو تھے۔ ٹیلی ویژن کے پروگرام سات رنگ میں لکھے ایک خاکے پر ان کو سسپنڈ کر دیا کیونکہ معین اختر نے اُس خاکے میں جو گیٹ اپ کیا تھا وہ مصاحب کے خیال میں جنرل ضیاء الحق سے ملتا جلتا تھا۔ اگر ایسا تھا تو اس میں رائٹر کا کیا قصور؟ یہ تو پروڈیوسر اور میک اپ آرٹسٹ اور آرٹسٹ کا معاملہ تھا بہر حال

برق گرتی ہے تو بیچارے مسلمانوں پر

قمر علی عباسی کو نہ صرف Suspend کیا گیا بلکہ Demote بھی کیا حالانکہ وہ پبلک سروس کمیشن سے آئے تھے اور اس طرح کی تنزلی ڈیپارٹمنٹ نہیں کر سکتا تھا لیکن ہر قاعدے قانون میں ترمیم ہو جاتی ہے۔ کیا مشکل ہے۔ کچھ لائنیں کچھ Clause ہی تو اِدھر اُدھر کرنے ہوتے ہیں اور اس ''اِدھر اُدھر'' میں قمر علی عباسی کی کئی سال کی Seniority اِدھر اُدھر ہو گئی گورنمنٹ یا نیم سرکاری اداروں میں ترقیاں ویسے بھی دیر سے ہوتی ہیں اور کئی طرح کے طریقہ کار کی مرہونِ منت ہوتی ہیں ایسے میں یہ ہو جانا کسی کو بھی ذہنی اور جذباتی طور پر توڑ دینے کے لیے کافی ہے لیکن قمر علی عباسی کا کہنا بلکہ یقین تھا میں نے کچھ غلط نہیں کیا انشاء اللہ میری پوزیشن بحال ہو گی''۔

کئی بار ایسا ہوا کہ باہر کا ٹور باہر کی ٹریننگ ہے قمر علی عباسی کا نام جانے والوں میں سب سے اوپر ہے مگر کسی کی ''اوپر'' سے سفارش آ گئی اور وہ

افسر چلا گیا جس نے واپس آ کر ریڈیو پاکستان کو اس ٹریننگ سے کوئی فیض نہ پہنچایا۔ قمر علی عباسی کو لندن (بی بی سی) ٹریننگ پر بھیجا تو واپس آ کر ''لندن لندن'' تحریر کیا جس میں نہ صرف جو وہاں دیکھا سیکھا اُسے ری پروڈیوس کیا بلکہ ریڈیو پاکستان کے ایک افسر کی بطور سفرنامہ نگار بھی پذیرائی ہوئی۔

قمر علی عباسی ان باتوں کی پرواہ نہیں کرتے ''میرا نصیب'' کہہ کر بات ختم کر دیتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے ایک بہت بڑے انعام سے اُنہیں نوازا ہے اور وہ ہے کسی سے جیلس نہ ہونا، اپنا قد اونچا کرنے کے لیے دوسروں کی Achivements کو نظر انداز نہیں کرتے، دوسروں کی کامیابیوں سے خوش ہوتے ہیں، تعریف کرتے ہیں اور سب سے بڑھ کر منافقت نہیں کرتے جس کے نتیجے میں اس فانی دنیا میں بڑے دھوکے اور نقصان بھی اُٹھاتے ہیں۔

قمر علی عباسی فرشتہ نہیں انسان ہیں اُن میں کمزوریاں بھی ہیں، اُن سے کوتاہیاں بھی ہوئی ہیں، غصہ بھی آتا ہے مگر ان سب پر وہ بہت جلد کنٹرول کر لیتے ہیں۔ یہی سب سے اچھی بات ہے۔

قمر علی عباسی نے تمام عمر اعتماد سے بسر کی فیصلے کیے تیزی سے یقین کے ساتھ جب ریڈیو پاکستان کراچی کے کنٹرولر اور اسٹیشن ڈائریکٹر کے عہدے سے ریٹائر ہونے کا وقت آیا تو ڈائریکٹر جنرل صاحب نے ملازمت میں توسیع (Contract) کی بات کی، جواب میں قمر علی عباسی کا کہنا تھا ''ہم چاہتے ہیں دوسروں کو موقع ملے، تبدیلی آنی چاہیے، جہاں ہم ہیں وہاں کوئی دوسرا آنا چاہیے نظام بدل جانا چاہیے۔ یہ قدرت کا اصول ہے، صبح، شام، رات، سردی، گرمی، برسات، بہار، خزاں تبدیلی کے نام ہیں''۔

قمر علی عباسی نے زندگی کو ہمیشہ مثبت انداز سے لیا کسی کے ریٹائرمنٹ کا دن یقیناً افسردگی کا دن ہوتا ہے ایک ادارے سے طویل وابستگی کا دن، داخل ہوتا ہے اُس انسٹوٹیٹ میں تو جوان توانا ہوتا ہے اُمنگیں، ولولے ہوتے ہیں۔ بہت سے اچھے دوست ساتھی بنتے ہیں۔ پاور، کرسی کام کرنے کے مواقع حاصل ہوتے ہیں اور پھر ایک دن۔۔۔ یہ سب چند لمحوں میں ماضی ہو جاتا ہے۔ میں جب کسی کے بھی ریٹائرمنٹ کا سنتی تو قریب قریب اُتنی ہی افسردگی اور ملال محسوس کرتی جتنا شاید وہ شخص کر رہا ہوتا لیکن قمر علی عباسی اس موقع پر بھی اپنی روایتی شگفتگی، مثبت سوچ اور مستقبل کی منصوبہ بندی پیش نظر رکھے ہوئے ہیں۔ ''32 ناٹ آوٹ'' میں لکھتے ہیں:

''آج 13 جون ہے ہم ساٹھ سال کے ہو گئے زندگی کی ساٹھ بہاریں دیکھیں، ایک لمبا سفر کیا، اسکول کے دن شرارتوں سے بھر لمحے کالج کے کوریڈور ایک کھلنڈرا نوجوان امرودوں سے بھرے درختوں کے نیچے خواب بُنتا ہے، خواہشیں کرتا ہے، اُمیدیں باندھتا ہے، یونیورسٹی کی کینٹین ہے، زور زور سے باتیں، قہقہے، گرما گرم مباحثوں کے تذکرے، ٹرافیاں جیتنے کی خوشی، ستاروں کے قصے، بہاروں کے افسانے زندہ ہوتے ہیں۔ زندگی کے بازار میں لوگوں کی بھیڑ ہے، مقابلہ ہے، پھر ملازمت، تبادلے، اجنبی انجان صورتیں، چاند چہرہ ستارہ آنکھیں، پھولوں کا موسم، برستی بارشوں کے جل ترنگ، ہمارے لیے زندگی پل پل محبتوں، مسرتوں اور کامیابیوں کا نام ہے۔ عزت، شہرت، دولت، صحت، محبت کرنے والی بیوی نیلوفر۔۔۔ سعادت مند بچے ثوبیہ، وجاہت، ماریہ اور باوفا دوستوں کو زندگی کہتے ہیں۔

ہم نے 32 سال ریڈیو میں خدمت کی اور آج یوں محسوس ہو رہا ہے ہم 32 سال کے ہیں، جوان گرم خون جسم میں دوڑ رہا ہے۔

ہمارے پاس بہت سے منصوبے ہیں، کام ہیں، کتنے ملک ہیں جہاں جانا ہے۔۔ ابھی تو بہت لکھنا ہے، بہت بولنا ہے۔ اس کے لیے نیک تمنائیں درکار ہیں، آپ کی دعائیں چاہیں درازیٔ عمر کی کہ میرا رب بڑی دعائیں سننے والا ہے''۔

بے شک اللہ تعالیٰ دعائیں سنتا ہے اور صدقِ دل سے مانگی دعائیں اُس کے در پر ضرور پہنچتی ہیں یہی وجہ ہے کہ قمر علی عباسی جب ایک بالکل اجنبی شہر، اجنبی دیار نیویارک پہنچے تو اللہ تعالیٰ نے اُنہیں وہاں بھی عزت وقار اور محبتوں سے سرفراز کیا۔ ایسے دوست اور چاہنے والے دیئے جنہوں نے اُنہیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔۔۔ آج تک سر آنکھوں پر بٹھا کر رکھا ہے۔

یہ میرا اعزاز ہے کہ مجھے قمر علی عباسی کا ساتھ ملا جنہوں نے ہمیشہ میری چھوٹی سی چھوٹی خوشی اور خواہش کو افضل جانا۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ میں زندگی کا آخری سانس بھی اُس دنیا میں لوں جہاں قمر علی عباسی کا توانائی سے بھرپور مہربان وجود ہو:

کچھ اور مانگنا میرے مشرب میں کُفر ہے
لا اپنا ہاتھ دے میرے دست سوال میں

○

''ہم جس بازار میں داخل ہوئے اس کی سڑک اتنی تنگ تھی کہ ایک گاڑی آ سکتی تھی، دوسری بالکل برابر سے جا سکتی تھی۔ یوں سمجھیں ٹریفک کی آمد و رفت ہو سکتی تھی لیکن جب سب طریقے سے چلیں اور دکانیں آگے نکلی ہوئی نہ ہوں، خریداروں کی بھیڑ نہ ہو، ٹھیلے، رکشا اور چھابڑیاں نہ ہوں اور یہ سب ہو تو اسے ڈھاکہ کا سب سے معروف اور انسانوں سے بھرا ''شنکر یہ بازار'' کہتے ہیں۔

(شونار بنگلہ سے منتخبہ)

''بنانے والے کی تعریف''

سلطان جمیل نسیم
(کینیڈا)

کسی نثر نگار کا قول ہے کہ شاعر اپنے محبوب کا قصیدہ لکھے تو داد سے نوازا جاتا ہے، اگر افسانہ نگار اپنے محبوب کی خوبیاں بیان کرے تو پڑھنے والے پتا پوچھنے لگتے ہیں۔۔۔اب میں پتا کیا بتاؤں۔۔۔قمر علی عباسی کو دیکھ لیجیے۔

آج میں اور قمر عباسی ایک دوسرے کا آئینہ بنے ہوئے ہیں اور اس آئینہ میں جو چہرے نظر آ رہے ہیں وہ اپنے ہونے کے باوجود اپنے نہیں لگتے۔ گذرے ہوئے دن، اُن دنوں کی باتیں اور اپنے چہرے۔۔۔اب کہانی لگتے ہیں۔۔۔تو چلئے پھر کہانی ہی سہی۔

وقت، دن، ہفتہ، مہینہ، سال معلوم کرنے کے لیے کسی جنتری یا حساب داں کا سہارا لینے کی ضرورت نہیں۔۔۔ یہ سب تو ہمارے چہروں سے ہماری باتوں سے معلوم ہو جاتا ہے کہ ہماری دوستی کی عمر جوانی کی حدوں کو پیچھے چھوڑ کر اتنا آگے بڑھ چکی ہے جیسے ایک کامیاب سفرنامہ نگار کی حیثیت سے قمر عباسی کی شہرت پاک و ہند کی اردو دنیا سے نکل کر امریکہ و یورپ سے ہوتی ہوئی بنگلہ دیش اور ماریشس تک پہنچ گئی ہے۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے بارے میں اتنا کچھ جانتے ہیں کہ بہت کچھ بھول بھی گئے ہیں۔ اتنا یاد ہے یہ جب ہم پہلے پہل ملے تھے تو بہت خوش تھے، نہ پیٹھ پر یادوں کا پشتارہ تھا نہ دل و دماغ پر اُس نقصان کا بوجھ کہ جوانی کا ریلا اپنے ساتھ بچپن کی معصومیت کو بہالے گیا ہے۔ ہم تو بس جوانی سے گلے مل کے ایسے سرشار ہو گئے تھے کہ اپنے سوا کسی کو گردانتے ہی نہیں تھے، کوئی نظروں میں جچتا ہی نہیں تھا۔ میں تو پھر بھی جوانی کے منہ زور گھوڑے پر سنجیدگی کی زین کسے باگ بھی ہاتھ میں تھامے اور پا بھی رکاب میں جمائے اُس کا رخ ادب کی طرف موڑنے کی کوشش میں لگا تھا قمر علی عباسی۔۔۔اُف توبہ۔۔۔اس کی جوانی کے شب و روز بیان کرنے کے لیے اپنی لڑکھڑاتی نثر کا سہارا لینے کے بجائے رواں دواں شاعری کا ہاتھ تھام کے پورا پس منظر بیان کیے دیتا ہوں۔

کیا کیا کروں شباب کی رنگینیاں بیاں
قدموں میں کہکشاں تھی تو رگ رگ میں بجلیاں
پیری کا احتمال نہ اندیشۂ خزاں
دل کو یہ اعتبار رہیں گے یوں ہی جواں
دریائے خوں کی تن سے روانی نہ جائے گی
جیسے تمام عمر جوانی نہ جائے گی
(صبا اکبر آبادی)

جیسے تمام عمر جوانی نہ جائے گی۔۔۔اسی یقین کے بل بوتے پر کوئی وقت ایسا نہیں جاتا تھا جب ہنسی مذاق، ٹھٹھول، چھیڑ خوانی نہ ہوتی ہو۔ کبھی اس کے ساتھ مذاق کبھی اُس کے ساتھ۔۔۔ بقول مشفق خواجہ۔۔۔ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ابھی کلیاتِ نظیر اکبر آبادی سے برآمد ہوا ہو۔۔۔

اسی چنچل پن کے ساتھ ہائی اسکول بھی پاس کر لیا۔۔۔اسی چلبلے انداز کو لے کر کالج میں بھی داخل ہو گیا۔ مذاق ہی مذاق میں ایک اسکول میں استادی بھی کر لی۔۔۔ ہنستے ہنساتے۔۔۔لکھنے لکھانے کی طرف توجہ کی تو اخبارات میں بچوں کے صفحات پر سیکڑوں مضمون اور کہانیاں لکھ ڈالیں۔ بزم نو آموز مصنفین کا عہدہ بھی سنبھال لیا۔ اچانک دھیان شاعری کی طرف گیا۔ لیجیے شاعری بھی شروع۔۔۔قمر نے اپنا تخلص ''انجم'' رکھا۔۔۔ایک شعر مجھے اب تک یاد ہے۔

کیا قیامت ہے اے قمر انجم
چاند پورا ہے روشنی کم ہے

اس پورے چاند کی کم روشنی کو ن سے مہ جبینوں اور کن خورشید شمائلوں کے آنگن تک پہنچی۔ اس عمر کی کہانیاں اتنی رنگین ہوتی ہیں کہ اکثر ایک اَن کہی کہانی بن کے رہ جاتی ہیں۔۔۔اپنی کہانی بیان کرنے میں تو مزہ آتا ہے لیکن دوستوں کی کہانیاں اس عمر میں جب وہ نانا اور دادا بن چکے ہوں، مجھے کچھ مناسب نہیں لگتا۔ (پھر اُن ''لڑکیوں'' کے بارے میں بھی سوچئے جو اپنی نظروں کو اپنی بیٹیوں کے بعد اپنی پوتیوں اور نواسیوں کی جوانی کا نگہبان بنائے ہوئے ہوں)۔ قمر اپنی روشنی اور ستاروں کی جھلملاہٹ لئے یونیورسٹی کی کشادہ فضا میں جا پہنچا۔ کالج ہی کی زندگی کے دوران مقرر بننے کی ٹھان لی تھی سو کالج اور پھر یونیورسٹی کے لیے بے شمار مقابلوں میں اولیت کا سہرا سجائے۔۔۔ ٹرافیاں اٹھائے۔۔۔ سینے پر گولڈ میڈل لگائے اپنے تعلیمی اداروں کے وقار میں اضافے کا سبب بنتا رہا۔ یہاں یہ بتانا شاید بے محل نہیں ہوگا کہ اُن تقریری مقابلوں کے ذریعے قمر علی عباسی کے مراسم جن حضرات سے قائم ہوئے اُن میں کراچی کے ایک سیاسی ستون اور مسلم لیگ کے رہنما دوست محمد فیضی ایک نہایت اعلیٰ مقرر اور اپنے وقت کے کامیاب صحافی مرحوم ظہور الحسن بھوپالی۔ محرم کی مجالس میں منبرِ حسینؓ سے کفر و ظلم کے خلاف آواز بلند کرنے والے ذاکر علی رضا نقوی، ایک بیوروکریٹ اور کراچی کا سابق کمشنر شفیق پراچہ اور شہر کراچی میں تھنکر زفورم کا بانی جاوید صدیقی کے علاوہ حیدر آباد کے ساتھی مقرروں میں، ایک شاعر اردو کالج کا استاد اور امریکہ میں گم ہو جانے والا یونس شرر اور کئی اداروں میں افسر تعلقات عامہ (PRO) رہنے والا تین چار کتابوں کا مصنف، نعتِ رسول ﷺ کی محفلوں کی میزبانی کی سعادت حاصل کرنے والا رضوان صدیقی بھی شامل ہے، قمر عباسی اپنے مراسم کو سنبھال کر رکھنا ہی نہیں انھیں نبھانا بھی جانتا ہے۔

یونیورسٹی کی روشن فضا سے نکل کر ریڈیو پاکستان سے وابستگی اختیار کی یہ شاید ۶۷۔۱۹۶۶ء کی بات ہے لیکن اپنے دورِ طالبِ علمی میں کچھ عرصے کے لیے متروکہ املاک (Claims & Settlement Dept) کے دفتر میں بھی اپنی شگفتہ مزاجی کے پھول کھلائے۔ایک کالج میں بھی استاد بن کر شاگردوں کے دل جیتے اور سچی بات یہ ہے کہ عباسی کو دل جیتنے میں مہارت حاصل ہے،اس مہارت نے ہی یہ وصف پیدا کیا ہے کہ جس سے ایک بار ملاقات ہوگئی وہ اس کا ہی ہوگیا۔یہی خوبیاں تحریر میں بھی ہیں۔بچوں کے لیے ایک ناول لکھا''بہادر علی'' یونیسکو کی جانب سے انعام بھی ملا دنیا کی کئی زبانوں میں ترجمہ بھی ہوا، وہ ناول بچوں میں ''ہیری پورٹر'' کی طرح آج بھی مقبول ہے۔پاکستان ٹیلی ویژن کے لیے جب اس ناول کی ڈرامائی تشکیل کی تو یہ سیریل چھے مہینے تک ناظرین کی توجہ کا مرکز بنی رہی جبکہ اچھی سے اچھی سیریل بھی تیرہ قسطوں یعنی تین مہینے سے زیادہ نہیں دکھائی جاتی (اگر انڈیا کے کسی چینل پر آتی تو وہ چھے سال سے زیادہ عرصے تک دکھاتے ہی رہتے) پھر یہی ایک سیریل نہیں بچوں کے لیے وہ پانچ چھے سیریل لکھے جو پسند کیے گئے۔اب اگر بچوں کے لیے لکھے جانے والی کتابوں کی تعداد ہی کو دیکھا جائے تو وہ بھی چار کم چالیس ہے۔

بچوں کے ادیب کی حیثیت سے جب شہرت میں کمال حاصل کر چکا تھا، بہت سی کتابوں پر بہت سے انعامات مل چکے تھے۔

اُس وقت ملاقات ہوئی ''نیلوفر علیم'' سے جس طرح قمر بچوں کے ادیب کی حیثیت سے صفِ اول میں شمار کیا جاتا تھا اُسی طرح نیلوفر علیم ریڈیو پاکستان کی ایک ایسی آواز کی مالک تھیں جن کے بغیر کوئی ڈرامہ مقبولیت حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکتا تھا بلکہ ڈراموں کے علاوہ جس پروگرام میں بھی آواز شامل ہوتی سامعین ہمہ تن گوش ہو جاتے۔۔۔پھر ٹیلی ویژن کے ایک ڈرامے ''شہزوری'' میں اپنی آواز اور اپنی فنی صلاحیتوں کا جو بھرپور مظاہرہ کیا اُس نے نیلوفر کو ریڈیو پاکستان کے ساتھ ٹیلی ویژن کے لیے بھی باعثِ افتخار بنا دیا۔نتیجہ کچھ قمر عباسی کی کشش اور بہت کچھ نیلوفر علیم کی خوبیاں اور جاذبیت دونوں ایسے ملے کہ ایک ہوگئے۔

جب کبھی بات نکلتی ہے تو قمر عباسی اپنی شادی کے تعلق سے یہ بات بہت ہنس ہنس کے بتاتا ہے کہ ہر اخبار نے شادی کی خبر کے لیے سرخی جمائی ''نیلوفر علیم کی شادی قمر علی عباسی کے ساتھ ہوگئی'' صرف ایک اخبار نے یوں لکھا ''قمر علی عباسی نے نیلو علیم سے شادی کرلی''۔

جب قمر اور نیلوفر۔۔۔دو سے ایک۔۔۔پھر دو سے تین۔۔۔ جب دو اور تین مل کر پانچ ہوگئے اُس ''عالمِ شباب'' میں قمر عباسی کو ریڈیو پاکستان کی طرف سے انگلستان بھیجا گیا۔یہ ستمبر ۱۹۸۱ء کی بات ہے لندن کے سرد موسم میں اپنے دوستوں، ساتھیوں اور اپنے اعزاز میں منعقد ہونے والی تقریبات کو تین مہینے تک اپنی باتوں اور تقریروں سے گرماتے رہنے کے بعد۔۔۔واپسی ہوئی تو لندن میں گزارے ہوئے وقت کو زندانِ قرطاس وقلم کے سپرد کر دیا۔۔۔ یوں وقت کے ساتھ یادیں بھی اسیر ہوگئیں۔

لندن کا سفرنامہ ہفت روزہ ''اخبارِ خواتین'' میں مسلسل تین برس تک شائع ہوتا رہا، ''اخبارِ خواتین'' کے مدیر حسن عابدی تھے، قلم کے دھنی، نظریہ کے پختہ، بچوں کے لیے بھی نظمیں لکھنے والے اور نہایت مرنجاں مرنج انسان، خیر حسن عابدی ایک مضمون کا موضوع ہیں۔ان پر پھر کبھی سہی۔۔۔فی الحال بات قمر علی عباسی تک ہی رہے تو مناسب ہے۔قمر کے سفرنامہ لندن کی مقبولیت بچوں کے ساتھ خواتین میں بھی دیکھ کر لاہور کے ایک ناشر نے کتابی صورت دینے کے لیے مانگ لیا۔یہ ناشر قمر عباسی کی لکھی ہوئی بچوں کے لیے بہت سی کتابیں بھی شائع کر چکا تھا۔یوں پہلا سفرنامہ ''لندن لندن'' ۱۹۸۶ء میں عوام کے ہاتھوں میں پہنچا۔''لندن لندن'' کا پیش لفظ عباسی نے کسی اور سے لکھوانے کے بجائے خود تحریر کیا جس کے آخیر میں ایک جملہ اپنے اختصار کے باوجود نہایت لطیف و بلیغ ہے اور اسی لئے مجھے تقریباً حفظ ہے۔

> ''لندن جانے سے نو سال پہلے شادی اور ایک سال پہلے حج کی سعادت حاصل کی۔ جب لندن پہنچے تو بے تکلف دوستوں نے پوچھا۔۔۔اب کیا کرنے آئے ہو۔۔۔''

اب دو باتیں ہوئیں۔۔۔ایک یہ کہ مروجہ قسم کے سفرناموں کی بھیڑ میں ایک نئے لب ولہجہ کے ساتھ تحریر کی دلچسپی اور لطیف مزاح کی چاشنی پڑھنے والوں کو میسر آئی۔۔۔کتابت کی بے شمار غلطیوں کے باوجود یہ سفرنامہ قارئین میں نہایت مقبول ہوا۔اس سے پہلے کہ عباسی کے سفرنامے کے بارے میں کچھ اور کہوں مجھے کتابت کی غلطیوں کے حوالے سے اپنے ایک مرحوم دوست سیدار تضا عزمی یاد آ گئے۔

''لندن لندن'' شائع ہوئے زیادہ دن نہیں ہوئے تھے۔ناشر نے رائلٹی کے ساتھ شاید پچاس کتابیں مصنف کو دی تھیں جو عباسی نے اپنے خاص خاص دوستوں کو بطور تحفہ دیدیں۔ارتضا عزمی حیدرآباد سے آئے اور قمر سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ہم دونوں ریڈیو اسٹیشن پہنچے حیدرآباد کے حوالے سے عزمی صاحب سے قمر کی بھی شناسائی تھی۔میرے اشارے پر قمر عباسی نے دراز میں رکھی ہوئی لندن لندن کی آخری کاپی انہیں پیش کر دی۔

اپنے ایک مضمون میں عزمی صاحب کے بارے میں دو باتوں کا تذکرہ کر چکا ہوں۔ایک تو یہ کہ وہ ہر موضوع پر ہمہ وقت گفتگو کرنے کے لیے مستعد ہو جاتے تھے۔ان کی اس عادت کو کچھ لوگ پسند نہیں کرتے تھے اور اسی لیے ملنے سے گریزاں رہتے، دوسری بات یہ کہ وہ عیال دار آدمی تھے، پڑھنے لکھنے کا شوق تھا لیکن کتاب خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتے تھے اُن کو جو کتاب بھی ہاتھ لگ جاتی اُسے نہات انہماک سے پڑھتے۔۔۔حاشیئے پر لکھتے بھی جاتے۔۔۔مجھ سے بہت سی کتابیں پڑھنے کے لیے لے گئے اور سب کے ساتھ انھوں نے یہی سلوک کیا تھا جو آج بھی اُن کی یاد تازہ کرتی رہتی ہیں۔آدمی محبت

والے تھے۔قمر عباسی کو چاہتے تھے اپنے مجموعۂ کلام ''چہرہ نما'' پر عباسی کی رائے فلیپ پر دی تھی۔''لندن لندن'' لے کر بہت خوش ہوئے۔مہینہ بھر کے بعد حیدر آباد سے آئے تو ''لندن لندن'' ساتھ تھی انھوں نے حسبِ عادت کتاب نہایت توجہ سے پڑھی تھی۔کتابت کی ساری غلطیاں درست کی تھیں اور آخر میں رائے دیتے ہوئے یہ لکھا تھا ''ہم کبھی لندن گئے ہی نہیں اس لئے کچھ جاننے ہی نہیں، قمر علی عباسی صاحب کے بارے میں یہ رائے رکھتے ہیں کہ وہ سچے انسان ہیں اس لئے جھوٹ لکھا ہی نہیں ہوگا''۔

یہاں تک تو سب ٹھیک تھا تصحیح شدہ کتاب قمر نے رکھ لی تو وہ مُصر ہوئے کہ انہیں کتاب کے بدلے کتاب چاہیے۔عباسی کے پاس اب کوئی کتاب باقی نہیں تھی چنانچہ اپنے دفتر کے ایک آدمی کو اردو بازار بھیجا کہ وہ کتاب خرید کر لائے۔کسی کتب فروش کے پاس کتاب باقی نہیں رہی تھی۔یہ معلوم ہونے کے بعد عزمی صاحب نے صبر کرلیا اور قمر علی عباسی کو یہ فائدہ ہوا کہ دوسرے ایڈیشن میں ننانوے فیصد غلطیاں راہ پانے سے رہ گئیں۔

''لندن لندن'' کی مقبولیت نے جہاں مصنف کا حوصلہ بڑھایا وہاں ناشر کو اصرار پر مجبور کیا کہ وہ قمر عباسی سے ایک اور سفرنامہ کا مطالبہ کرے۔قمر کے سامنے سب سے بڑی رکاوٹ محکمے سے بیرونی ملک کے سفر کا اجازت نامہ حاصل کرنا تھا مگر ادارے کی پختگی نے ہمیشہ قمر کا ساتھ دیا ہے۔یہ مرحلہ بھی طے ہوا اب سفر کرنے کے لیے جب تمام اسباب موجود ہوں تو پھر بقول شاعر:

سفر میں کوئی شریکِ سفر بھی ہوتا ہے

حوصلہ بھی تھا، وسائل بھی اور شریکِ سفر بھی۔چنانچہ زندگی بھر کے ہمسفر کو ساتھ لیا اور اپنی ماتر بھومی کا رُخ کیا یعنی امروہہ کے سفر پہ نکل کھڑے ہوئے۔حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی دلی میں زیادہ وقت گزارا، تاج محل دیکھنے آگرہ بھی گئے۔ فتح پور سیکری جا کے حضرت شیخ سلیم چشتیؒ کو بھی سلام پیش کیا۔شملہ اور مسوری کے سرد موسم کو بھی جانچا۔کلیئر شریف جا کے حضرت صابرؒ کے مزارِ مبارک کی بھی زیارت کی۔پاکستان واپس آئے تو ایک کسک سی دل میں لئے ہوئے کہ اب ''دلی دور ہے'' اس کے بعد تُو چل میں آیا کہ مصداق ہر سال ایک نئے ملک کی سیر اور ایک نئے ملک کا سفرنامہ۔۔۔

قمر کو سفرنامہ لکھنے کا سلیقہ ہی نہیں آتا بلکہ اپنے شوق اور اپنی ذمہ داریوں کو قرینے سے نبھانا بھی آتا ہے۔مجھے اعتراف کرنے میں کوئی جھجک نہیں کہ میں یہ لکیر نہیں کھینچ سکا۔۱۹۶۸ء سے ۱۹۷۸ء تک پورے دس سال تک میں ادب کی ذمہ داری کو پوری طرح نہیں نبھا سکا۔مشکل سے سات آٹھ افسانے لکھے جو سیپ، اوراق اور فنون میں شائع ہوئے جب کراچی میں سر چھپانے کا سہارا ہو گیا یہ اطمینان ہو گیا کہ اب بچوں کی تعلیم میں کوئی رکاوٹ نہیں آئے گی اس کے بعد پوری طرح خود کو ادب کے لیے وقف کر دیا۔

(یہاں میں کچھ اپنی باتیں کرنا چاہتا ہوں۔میرے والد نے جتنا لکھا ہے میں نے اُس کا عشرِ عشیر بھی نہیں لکھا، انھوں نے لکھنے پر تو پوری توجہ دی مگر اشاعت کی طرف ذرا بھی دھیان نہیں دیا۔چنانچہ میں نے یہ طے کیا ہے اور اس کو میں اپنی وصیت بھی کہتا ہوں کہ میرے بعد جو بھی میرا اثاثہ ہو، اس میں سے شرعی طور پر میں جتنا اپنی مرضی سے رکھ سکتا ہوں وہ کتابوں کی اشاعت پر خرچ کیا جائے جس میں میری اور میرے والد حضرت صبا اکبر آبادی کی کتابیں بھی شامل ہیں۔باقی ورثاء میں تقسیم ہو۔)

قمر عباسی نے اپنی تحریر اور تقریر سے جو مقبولیت حاصل کی ہے وہ اپنی جگہ لیکن اُس نے اپنی کتابوں کی اشاعت کے معاملے میں کچھ ادھار نہیں رکھا لکھنے سے پہلے اشاعت کا انتظام کرلیا۔مراسم اور تعلقات کو برتنے کے ساتھ اُن کو نبھانا بھی جانتا ہے۔دوستوں سے محبت بھی کرتا ہے لیکن اہمیت صرف اُن لوگوں کو دیتا ہے جو اُس سے ہر لحاظ سے مرتبے میں بلند ہوں۔

اپنے پہلے سفرنامے کی تقریب کے لیے اُس نے ادیبوں شاعروں کو مدعو کیا لیکن دوسری کتاب کی تقریب کے لیے چند ناواقف کاروں کے علاوہ کسی ادیب شاعر کو بلانے کا روادار نہیں تھا۔مثلاً سندھ کے گورنر سے کتابوں کی تقریب میں صدارت کے لیے درخواست کی جاتی ہے یا پھر کوئی وزیر صرف ایک مرتبہ (شاید پہلی کتاب کی تقریب) کے لیے ڈاکٹر جمیل جالبی سے صدارت کی درخواست کرنے میرے ساتھ گیا تھا وہ بھی شاید اس لیے کہ اُس زمانے میں جالبی صاحب کراچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے۔

دوسرے اہلِ قلم کی طرح عباسی کو بھی شہرت پسند ہے۔یہ پسند اُس وقت ایک امتحان بن گئی جب اُس کی شادی ہوئی، وہ ریڈیو پر افسر تھا۔بچوں کے ادیب کی حیثیت سے رائٹرز گلڈ کے انعامات بھی حاصل کر چکا تھا، شہرت میں بھابی نیلوفر بہت آگے تھیں۔شاید اُن کی شہرت نے ہی مہمیز کا کام لیا۔اب نیلوفر علیم کا نام ایک خواب ایک یاد بن کر رہ گیا ہے۔اب قمر کی کتابوں کی رونمائی میں معلن کی حیثیت میں نیلوفر عباسی شریک ہوتی ہیں۔وہ بھی ابتدائی دو چار کتابوں کی تقریبات کے بعد۔۔۔اور

میرے ہر نفس کی راحت
میرے ہر سفر کی ساتھی

ہر نفس کی راحت۔۔۔عباسی کی بیماری کے بعد ہر سفر کی ساتھی بنی ہیں۔''دلی دور ہے'' کے سفر میں تو یقیناً بیوی بچے شریکِ سفر تھے البتہ ''شونار بنگلہ'' اور اس کے بعد لکھے گئے تمام سفرناموں میں ہر سفر کی ساتھی شریکِ حیات تھی۔

میں نے کہا نا۔۔۔عباسی کو تعلقات نبھانے اور برتنے آتے ہیں۔ یہ ہنر بہت کم لوگوں کو آتا ہے۔

قمر علی عباسی نے جتنے سفر کئے ہیں اُتنے سفرنامے نہیں لکھے ہیں مثلاً ہندوستان دو مرتبہ جانا ہوا مگر سفرنامہ صرف ایک یعنی ''دلی دُور ہے'' لکھا۔سفر ناموں کے علاوہ قمر علی عباسی نے دو کتابیں اور تصنیف کی ہیں ''ایک عمر کا قصہ'' اور

''33 ناٹ آوٹ''۔ میں ان دونوں کتابوں کو بھی اُس کا سفرنامہ کہتا ہوں۔ ایک زندگی کے ماہ وسال کا سفرنامہ ہے تو دوسرا ملازمت کے سفر کی روداد۔ لیکن میں ان دونوں کتابوں میں بڑی تشنگی محسوس کرتا ہوں۔ عباسی کی زندگی دھوپ چھاؤں کا مرقع ہے اس کو بے پناہ محبت بھی ملی ہے اور اپنوں کی جانب سے بے رخی اور دکھوں کا ڈھیر بھی۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ خوشی کے مواقع ملنے پر آپے سے باہر نہیں ہوتا اور پریشانیوں کو بھی اکیلے جھیلنے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے، ان کتابوں میں مجھے یہ کمی محسوس ہوتی ہے کہ ہر بات کے بیان میں اس نے بہت اختصار سے کام لیا ہے جب وہ ایک مہینے یا دو ماہ کے لیے سفر پہ نکلتا ہے تو ایک سفرنامہ لکھ دیتا ہے۔ زندگی کی کتھا تو آدھی صدی سے زیادہ کی تھی، اسی طرح مدتِ ملازمت بھی تیس سال سے زیادہ تھی، عباسی کو اپنے دکھ اور اپنی خوشیوں میں سے بھی اپنے قارئین کو اسی طرح شریک کرنا چاہیے تھا جس طرح سفرنامہ لکھتے ہوئے سفر کی تمام تر دلچسپیوں میں پڑھنے والے کو ساتھ ساتھ رکھتا ہے، اس بات کو سب ہی جانتے ہیں کہ زندگی دھوپ چھاؤں کا کھیل ہے اور زندگی یہ کھیل کم وبیش سب کے ہی ساتھ کھیلتی ہے لیکن جو لوگ قوتِ اظہار رکھتے ہیں اُن کو وہ تمام مرحلے اپنے پڑھنے والوں سے شیئر کرنے چاہئیں جو ناگفتنی رہ گئے ہوں۔ کتاب لکھنے کا ایک مقصد یہ بھی ہوتا ہے کہ اپنے تجربات میں دوسروں کو شریک کیا جائے وہ تجربات خوشی کے ہوں یا غم کے، دراصل ہم سب نے بڑے لوگوں کی باتوں سے ہی سیکھا ہے۔

قمر علی عباسی کی شخصیت میں جو صبر وضبط کا جذبہ فطرت نے شامل کیا ہے وہ اپنے قریب رہنے والوں تک ہی کیوں محدود رہے لیکن ایک حقیقت یہ بھی ہے کہ ہر لکھنے والا اپنی خوشی کے لیے لکھتا ہے۔ اگر ''ایک عمر کا قصہ'' میں بہت سی باتیں بیان کرنا ضروری نہیں سمجھا تھا تو ''تھرٹی تھری ناٹ آوٹ'' میں دفتری ساتھیوں ان کی محبتوں اور سازشوں کے علاوہ اُن تمام لوگوں سے بھی اپنی تفصیلی ملاقات کا احوال لکھا ہوتا جو ریڈیو سے ایک فنکار کی حیثیت سے وابستہ تھے۔ یا اپنے شعبہ کی بڑی اہم شخصیت تھے اور اُن سے ریڈیو اسٹیشن پر ملاقات ہوئی تھی۔ بہرحال میرے نزدیک یہ کتابیں ذرا تشنہ سہی لیکن ان مین کشش اور دلچسپی اُتنی ہی ہے جو قمر عباسی کی تحریر کا خاصہ ہے اور پڑھنے والوں کو اپنی طرف پوری طور سے منہمک رکھتی ہیں۔

جس طرح ریل کے سفر میں مختلف اسٹیشن آتے ہیں جہاں انسانی زندگی کے بہت سے مضحکہ خیز یا عبرت انگیز واقعات اہلِ نظر کو دکھائی دیتے ہیں ایسے ہی واقعات کا سفرنامہ ''دل دریا'' ہے۔ جو بظاہر اخبارات میں شائع ہونے والے کالموں کا ایک انتخابی مجموعہ ہے لیکن یہ کتاب بھی سماجی، معاشی اور کبھی کبھی سیاسی زندگی کا ایسا سفر کراتی ہے جیسے ریل کے سفر میں باہر کے منظر نظر آتے ہیں۔

یہ کوئی لگا بندھا اصول یا کلیہ نہیں ہے لیکن دیکھا یہی گیا ہے کہ چھوٹے شہروں سے بڑے آدمی اُٹھے ہیں۔۔۔ ہندوستان میں ایک شہر ہے امروہہ۔۔۔ روایت یہ ہے کہ وہاں آم اور رہو مچھلی کثرت سے ہوتی تھی اسی رعایت سے شہر کا نام امروہہ پڑ گیا۔ آم اور مچھلی کی شہرت تو پیچھے رہ گئی، ادب آگے آ گیا۔۔۔ اب یہی دیکھئے۔۔۔ مصحفی جیسا شاعر۔۔۔ رئیس امروہوی جیسا دانشور، ادیب، شاعر اور قطعہ نگار۔۔۔ ڈاکٹر نثار احمد فاروقی جیسا عالم اور محقق۔۔ ڈاکٹر محمد علی صدیقی جیسا نقاد۔۔۔ اور ہمارے قمر علی عباسی جیسا اعلیٰ پائے کا سفرنامہ نگار کہ وہ بچوں کے لیے کہانیاں لکھے یا سب کے لیے سفرنامہ لفظ بے مزہ ہوتے ہیں نہ بے حرمت۔ یہ سب امروہہ کے ہیں۔ بات کیونکہ قمر عباسی کی ہو رہی ہے اس لیے یہ کہنا بھی ضروری معلوم ہوا کہ قمر عباسی کی زندگی میں ایک اور چھوٹے شہر کا حصہ ہے وہ ہے حیدرآباد سندھ۔۔۔ جہاں وہ قمر امروہوی سے قمر عباسی بنا۔

قصہ یوں ہے کہ امروہہ کے قاضی شہر تھے محمود علی عباسی انھوں نے اپنے فرزند یعقوب علی عباسی کی شادی اپنے ایک واقف کار ابرار الحق عثمانی کی صاحبزادی سے کر دی جن کا نام کنیز فاطمہ تھا۔ ان کے یہاں ۱۳ر جون ۱۹۳۸ء میں ایک بیٹا ہوا۔ یہ پہلا بیٹا نہیں تھا بلکہ چار بہن بھائیوں کے بعد ہوا۔ اور اُس سے چھوٹے بھی پانچ بہن بھائی ہوئے مگر جس کا کام بڑا اُس کا نام بڑا۔ والدین کا نام روشن رکھنے کی سعادت قمر کے حصے میں آئی۔۔۔ ابھی عمر دس سال ہی تھی کہ پاکستان کی طرف ہجرت کی اور پاکستان میں بھی ایک چھوٹے سے پہاڑی مقام پر پڑاؤ ڈالا یعنی ''کوہ مری'' دو برس کوہ مری میں گزرے پھر رزق ریگزارِ سندھ کے ایک خوبصورت شہر حیدرآباد میں لے آیا۔ یہاں ۱۹۵۰ء میں قمر عباسی نے جامعہ عربیہ ہائی اسکول سے اپنی تعلیم کا آغاز کیا اور اپنے والدین کو اسی شہر کی مٹی کے سپرد کیا۔ جب قمر علی عباسی جامعہ عربیہ سے میٹرک پاس کر کے نکلا تو میری ملاقات ہوئی۔

اس طویل رفاقت کے دوران میں نے یہی دیکھا کہ خوش مزاج وزندہ دل قمر علی عباسی انتظامی معاملات میں سخت گیر رہا ہے لیکن کسی کے ساتھ دشمنی کا جذبہ اُس کے دل میں کبھی نہیں رہا۔ انسان ہے بری باتیں بری لگتی ہیں۔ جتنی جلدی روٹھ جاتا ہے اُتنی جلدی مان بھی جاتا ہے۔ جن احباب کے ساتھ برسوں دانت کاٹے کی دوستی رہی ہے اللہ تعالیٰ نے ان ہی کے سلسلے میں اس کا امتحان لیا ہے۔

اردو زبان کے ایک مشہور ومعروف مزاح نگار تھے شوکت تھانوی ان کا ایک افسانہ ''سودیشی ریل'' اردو ادب میں خاصے کی چیز ہے۔ شوکت تھانوی کے ایک بیٹے کا نام تھا رشید عمر تھانوی۔ وہ لاہور میں عباسی سے ملا اور دونوں میں گاڑھی چھننے لگی میری کبھی رشید عمر تھانوی سے ملاقات نہیں ہوئی لیکن قمر سے ذکر اتنا سنا اور اتنی بار سنا کہ وہ مجھے بھی اپنا دوست معلوم ہونے لگا۔

ایک اور اس کا ہم عمر اور ہم شہر تھا یعنی حیدرآباد سندھ کا ساتھی، جب یہ قمر امروہوی کے نام سے لکھتا تھا تو وہ کوکب عتیق کے نام سے۔ دونوں نے تقریباً ایک ساتھ ریڈیو کی ملازمت کی۔ کوکب عتیق نے عتیق اللہ شیخ کے نام سے ریڈیو اور اسٹیج کے لیے بیشمار کامیاب اور مقبول ڈرامے لکھے، عتیق اللہ شیخ سے بھی قمر علی عباسی کی طرح میرے دیرینہ مراسم تھے، وہ ریڈیو پاکستان کی ملازمت کے

سلسلے میں زیادہ تر لاہور، راولپنڈی اور اسلام آباد میں رہا۔ ایک بار تبادلہ حیدر آباد کا بھی ہوا مگر جب میں کراچی میں تھا لیکن ۱۹۹۹ء میں تقریباً دو مہینے میں نے اسلام آباد میں گزارے اُن تمام دنوں میں ہر روز اُس کے ساتھ اور مشہور شاعر ناصر زیدی کے ساتھ ملاقات رہی۔

ریڈیو کی ملازمت کے دوران ہی قمر علی عباسی کی دوستی ایک نہایت سُریلے گلوکار سے ہوئی جس نے بے حد مقبول گانے ریڈیو، ٹی وی اور فلموں کے لئے بھی گائے۔ مجیب عالم۔۔۔ مجیب کے ساتھ بھی قمر عباسی کے آفس میں اکثر ملنا رہا۔ ریڈیو ہی کے دو اور ساتھی گل حسن پٹھان اور اسلم بلوچ تھے۔۔۔ یہ سب کے سب قمر عباسی کے بہت قریب رہے اور ایک ایک کر کے آنکھ سے اوجھل ہوتے گئے۔ قمر اپنے دوستوں کی دائمی جدائی کو بھی رضائے دوست سمجھ کر قبول کرتا رہا۔ ممکن ہے چھپ کے رویا بھی ہو، دراصل یہ تو رونے والوں کے آنسو پونچھنے اور گلے لگا کر غم غلط کرنے کی ہر ممکن کوشش کرنے والا ساتھی ہے۔

یہاں کینیڈا میں ایک مرتبہ ٹیلی ویژن پر سکھوں کے عقیدے کے بارے میں ایک ڈاکومنٹری دکھائی جا رہی تھی۔ ایک گورا (شاید امریکی) ایک سکھ نوجوان کے ساتھ گردوارہ دیکھنے جاتا ہے سکھ اُس کو سارے آداب بتاتا ہے کہ یہاں ہاتھ منہ صاف کرو، اب سر پر رومال باندھ لو اب جوتے اتارو، اب گھٹنوں کے بل بیٹھ جاؤ اور اب متھا ٹیکو۔۔۔

تو ساری بات متھا ٹیکنے کی ہے۔۔۔ زندگی گزارنے کے لیے کوئی نہ کوئی ایسا در چاہیے جہاں آدمی ہاتھ باندھ کر متھا ٹیک دے۔ یہ نکتہ اپنی تمام تر حقیقت کے ساتھ قمر علی عباسی نے سمجھ لیا ہے۔ چنانچہ اپنے ہر دن کا آغاز اللہ کے نام سے کرتا ہے۔۔۔ اسی حوالے سے مجھے ایک پرانی بات یاد آ گئی۔

ایک مرتبہ دسمبر کی آخری شام کو میں اپنے بیوی بچوں کے ساتھ اس کے گھر بیٹھا تھا جب اٹھنا چاہا۔۔۔ روک لیا۔۔۔ رات کا کھانا کھاتے وقت پروگرام بنا کہ نئے سال کا استقبال دیکھنے کے لیے کراچی کے ساحلی علاقے کلفٹن جایا جائے جہاں بیحد رونق ہوتی ہے۔ اس درمیان قمر کے اشارے پر ایک ایک کر کے اُس کے بیوی بچے اُٹھتے اور پھر آ کر بیٹھ جاتے۔ ادھر نئے سال کی آمد پر سائرن بجا اُدھر سب ایک ساتھ اٹھے۔ قمر نے مجھ سے کہا میں ہر نئے سال کا استقبال دو رکعت شکرانے سے کرتا ہوں، آیئے۔۔۔

دیکھئے انسانوں سے تعلق نبھانے والا۔۔۔ بڑے اور بااثر لوگوں کو ''فائیو اسٹار'' ہوٹل میں اپنی کتابوں کی تقریبات میں مدعو کرنے والا عباسی اپنے خالق سے بھی اپنی ''پی آر'' رکھنا نہیں بھولتا۔

ایک بات اور یاد آ گئی۔

۸۰۔۱۹۷۹ء کی بات ہے۔ کراچی کے ترقیاتی ادارے (K.D.A) نے ایک نئی اسکیم ''گلستان جوہر'' کا اعلان کیا۔ اُس میں شاعروں ادیبوں اور فنکاروں کے لیے بھی ایک مختصر قطعۂ زمین مخصوص کر دیا۔ بہت سے لوگوں نے الاٹ منٹ کے لیے فارم بھرے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے چار سو گز کے پلاٹ کی قیمت اسی (۸۰) ہزار روپے تھی، درخواست کے ساتھ پچیس فیصد قیمت ادا کرنا تھی، الاٹ ہونے کے بعد باقی پچھتر فیصد تین مساوی قسطوں میں ادا کی جانی تھی۔

قمر علی عباسی نے بھی اپنے اور اپنی بیوی کے نام سے فارم بھر دیئے۔

بھٹو صاحب کے دورِ حکومت میں جیب مشرقِ وسطیٰ کے علاوہ دیگر ممالک میں بھی پاکستانیوں کے لیے ملازمت کے دروازے کھل گئے تھے تو زرِ مبادلہ کثرت سے آنے لگا تھا۔ بھٹو صاحب کے بعد جنرل ضیاء کے زمانے میں روس نے افغانستان پر چڑھائی کر دی تو امریکی امداد میں اضافہ ہو گیا تھا۔ اسی زمانے میں یہ کہا جانے لگا کہ آج کل پاکستان میں زمین اور کمین کی قیمت بڑھ گئی ہے تو کے ڈی اے کی طرف سے الاٹ کئے جانے والی زمین کم از کم دوگنی قیمت میں بک جاتی تھی اسی لئے اسی (۸۰) گز سے لے کر ہزار گز کے پلاٹ کے لیے وہ لوگ قرض لے کر درخواست دے دیا کرتے تھے جن کی حیثیت نہیں بھی ہوتی تھی۔ یہ بھی ایک طرح کی لاٹری تھی۔ کھل گئی تو سبحان اللہ۔۔۔ درخواست نامنظور ہونے پر اصل رقم تو مل ہی جاتی تھی۔ اب اتفاق دیکھئے عباسی کی دونوں درخواستیں منظور ہو گئیں۔ دوست مبارکباد کے ساتھ مٹھائی کا مطالبہ کرتے۔۔۔ عباسی کہتا۔۔۔ بیشک مٹھائی کھاؤ مگر دوستو میرے پاس دو پلاٹوں کی قیمت جمع کرانے کے لیے رقم نہیں ہے۔

آخر دوستو کے سمجھانے کے باوجود کہ ایک پلاٹ بیچ کے دوسرے پر مکان بنا لو۔۔۔ اُس نے دوسرا پلاٹ کے ڈی اے کو واپس کر دیا۔ خدا نے اس کا اجر ایسے دیا کہ باقی رہ جانے والا پلاٹ اتنی ہی قیمت میں فروخت ہو گیا کہ کلفٹن کے علاقے میں بننے والی ایک کثیر المنزلہ عمارت میں ایک فلیٹ بک کرا لیا۔ وقت پر قسطیں ادا ہوتی رہیں۔۔۔ میں بارہا اُس فلیٹ کو دیکھنے عباسی کے ساتھ گیا تھا۔ ایک دن اُس بلڈنگ کے پروموٹر نے دوگنی قیمت ادا کر کے وہ فلیٹ لے لیا۔

اکثر قمر کی باتیں سنتے ہوئے اُس کے بہت سے اعمال دیکھتے ہوئے جی چاہتا ہے کہ میں بھی اُس جیسا ہو جاؤں مگر یہ ممکن کیسے ہو؟ ہر آدمی تو بس ویسا ہی ہوتا ہے جیسی اُس کی سرشت بنا دی جاتی ہے، سب ایک جیسے ہوتے تو پھر جنگل کے جانوروں کا ریوڑ ہر طرف دکھائی دیتا۔ انسان نظر ہی نہیں آتے۔ انسان تو پروردگار کی وہ خاص مخلوق ہے جس کو بنانے والے نے بھی ''احسن تقویم'' کے خاص اور حسین لقب سے نوازا ہے۔ اس وقت مجھے حضرت صبا اکبر آبادی کا ایک شعر یاد آ رہا ہے جو میں عباسی کو بھی کئی مرتبہ سنا چکا ہوں۔

اپنے بنانے والے کی تعریف کیا کروں
سر تا قدم کمال کا اُس کے قصیدہ ہوں

قمر علی عباسی کی اتنی باتیں میرے دل میں بسی ہوئی ہیں کہ ان کے بیان کے لیے ایک دفتر بھی ناکافی ہے۔

باقی صفحہ ۲۵ پر ملاحظہ کیجیے

''شام تجھے سلام''

مامون ایمن

(نیویارک)

یہ باتیں من چلوں کی ہیں کہ وہ حروف سے، لفظوں سے اور متون سے کھیلتے ہیں۔ دنیا سے بے خبر ہو کر، خود سے بے خبر ہو کر، اِدھر سے بے خبر ہو کر، اُدھر سے بے خبر ہو کر۔ اس بے خبری کی تہہ داری سے آشنا دِل اپنے دماغ کو باور کراتا رہتا ہے۔ ''میں باخبر ہوں''۔

قمر علی عباسی کے نئے سفر نامہ ''شام تجھے سلام'' کی بے خبری میں خبر کے رنگ دار چھینٹے ہیں۔ اس میں سحر آمیز خوش بوئیں، آئینہ نما چہرے اور تعاقب کرنے والی سایہ اور دھوپ بن کر ساتھ چلنے والی آوازیں ہیں۔ بہ الفاظِ دیگر یوں کہیے کہ اس سفر نامہ میں خوش بوؤں، چہروں اور آوازوں کا چرچا ہے۔ یہ چرچا ماضی سے مربوط ہے، حال سے منسوب ہے اور مستقبل کا مطلوب ہے۔ یعنی وہی ''کل، آج، کل'' بات۔ لمحات، خوابوں اور آرزوؤں کا ایک دائرہ جو کسی رستہ، سراب، موڑ یا منزل کے خیال اور نشان سے ایک خواب زاد رشتہ استوار کرنے کے بعد، ہر مسافر کو ایک مسلسل سفر میں گرفتار رکھنے کا ہنر سکھاتا ہے اور گُر بتاتا ہے۔ اس سفر نامہ میں مسافر کا سفر کم، وقت کا سفر زیادہ نظر آتا ہے۔ اس روش کے لیے زبان اور بیان کو اختراعی وجوہ ٹھہرایا جا سکتا ہے۔ زبان اور بیان دو الگ الگ کنارے نہیں، بلکہ یک جان سائے ہیں جن کی ہم راہی میں فنا ہو جانے والا جسم، خود کو اور زمانہ کو ساتھ لے کر چلتا نظر آتا ہے۔ ''یک جان'' نامی یہ شوخ، چنچل، دل رُبا، اٹھکھیلیاں کرتی، جادوئی ادا قاری کو اسلوب کے محل لے جاتی ہے۔ اس ادا کی آہٹ پر محل کے بام و در جاگ جاتے ہیں، دریچے کروٹیں لیتے ہیں اور تازہ ہوا کے آوارہ جھونکے اپنے اپنے وجود کے ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ ان میں سے ہر جھونکا ایک رستہ، ایک گلی ہے، ایک ریستواں ہے، ایک چہرہ ہے، ایک صدا ہے۔ ہر جھونکا خواب ہونے کے باوجود ایک حقیقت ہے۔ وہ خواب جو بند افسانوں کو کھلے سچ کی دید اور تائید کی دعوت یوں دیتے ہیں کہ خفی تر دید بھی بیان کی دیوار پر آرام کرتے سایہ کا چہرہ دھوپ کی طرح روشن کر دے۔

''شام تجھے سلام'' میں سایہ کا چہرہ بھی روشن ہے۔ کیوں؟ اس سفر نامہ میں شام کی اُداسی نہیں، صبح کی شگفتگی ہے۔ جواز؟ جس شام کو سلام کا مژدہ مل جائے وہ خوشی سے دیوانی نہ ہو جائے گی کیا؟ مسافر نے حروف ابجد کی مروجہ ترتیب بدل کر، صوتی غنائیت کا ایک خوش گوار ماحول فراہم کیا ہے۔ حرف ''شین'' کو حرف ''سین'' پر مقدم رکھتے ہوئے اس نے حرف ''میم'' کی تکرار سے فہم کے گنبد میں ایک بار، نہایت معصومیت کے ساتھ، ایک نغمہ گو آواز کا بادل اُچھال دیا ہے جو تکرار کی فطرت پا کر آنکھوں میں ازل سے بسے ریگ زاروں پر وجدان کی بارش کرنے کے لیے ہمہ وقت تیار، مستعد اور کوشاں ہیں۔ اس بادل کی زندگی میں بے قراری کا ایک رقص ہے۔ اس رقص کی دید میں ایک انجانا سا قرار ہے۔ اس قرار کا تعلق اس دنیا سے بھی ہے اور اُس دنیا سے بھی۔ شاید نہیں، یقیناً۔ الفاظ کی چادریں اوڑھے متون اور پیغامات برہنہ بھی ہیں اور برملا بھی۔ ان چادروں میں حقیقت اور صاف گوئی کی علامتیں بھی ہیں، دلیلیں بھی ہیں، تاویلیں بھی ہیں، آراء بھی ہیں اور تاثرات بھی ہیں۔ یہ بات قمر علی عباسی وثوق کے ساتھ دہراتا ہے۔ ''وقت کے پر ہوتے ہیں۔ وہ بے آواز اُڑتا ہے/ دیکھتے ہی دیکھتے صدیاں گذر جاتی ہیں''۔ اور یہ باتیں بھی اُس کے لبوں کی رہین ہیں۔ ''امید کی کوئل کوکتی ہے/ دنیا انتظار میں ہے/ آنکھوں سے دجلہ اور فرات بہتے ہیں/ فرد بیماری کا بہانہ کر کے ہسپتال جاتا ہے، نرسیں دیکھنے کے لیے/ فرد کے لیے چھتیس سال کی عمر، چاند چھونے، پھول پینے اور خواب دیکھنے کی عمر ہے/ شیش کباب کا ایک اور نام بھی ہے، موٹا چمڑا/ چپاتی میں بھی نمک زیادہ ہو سکتا ہے''۔ اور یہ بات بھی کراچی سے نیویارک آ کر بس جانے والا، گندمی رنگت رکھنے والا، کعبہ کو اپنی دھڑکنوں کا مرکز کہنے والا، ایک اُمّی کو سب جہانوں اور زمانوں کا مدرّس و رہبر جاننے اور رب کی ذات بغیر دیکھے ماننے والا قمر علی عباسی ہی اس کرب کے ساتھ کہہ سکتا ہے۔ ''ہندوستان میں مسلمان تھے، پاکستان میں مہاجر تھے''۔

یہ بھی ممکن ہے کہ وہ اپنے آئندہ سفر نامہ میں یہ بھی اعلان کرے ''قمر علی عباسی نامی ایک بدیسی، نیویارک کے اجنبی ہجوم میں ایک ''دیسی'' ہے۔ تنہا دیسی۔ وہ دیسی جو دیدہ و دل کے جواہر سے مالا مال ہونے کے باوجود، اپنی ذات میں پنہاں شخصیت کے چہرہ سے آشنائی کے لیے تادمِ نزع کوشاں رہے گا۔ یہ تگ و دو علاقائی نہیں، عالمی ہے۔ یہ ایک الگ بات ہے کہ اس تگ و دو کا احساس انسان کو ہجرتوں کے دوش پر اُڑ اُڑ کر اب شدید ہوا ہے۔ ملک شام کے باسیوں کو بھی شاید اس حقیقت کا احساس ہو کہ وہ بھی اپنے گھروں میں، غیر ملکی، نو آبادی نظام کے لمحات اور استبدادانہ اصولوں سے معمور زنداں میں، زندانی رہ چکے ہیں۔ اس جملہ میں لفظ ''شاید'' کا استعمال دانستہ ہے کہ وقت کی فضا میں اُڑ کر فرد ہوا کے دوش کے سہارے کو بھی اپنے مقدر ہی کا ایک خوش گوار حصہ سمجھ کر، ذہنوں پر پڑی زنجیروں کی جھنک نہ سننے کی عادت اپنا لیتا ہے۔ اس سفر نامہ میں اُس عادت کی ایک غیر شعوری نشان دہی بھی ہے۔ یہ نشان دہی یک جہت نہیں، ہمہ جہت ہے کہ اس کا وجود علاقوں اور حدود سے ماوراء ہے۔

بنیادی طور پر، طرز نگارش کی چار اقسام ہیں۔ بیانیہ، دورانیہ، ترغیبانہ اور تنقیدانہ۔ ان اقسام کی وضاحتوں میں جائے بغیر، اس بات کا اعلان

بہ آسانی کیا جاسکتا ہے کہ اس قلم کار نے یہ چاروں اقسام ہی نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ اس سفر کے جھومروں اور جھالروں میں ٹانک دی ہیں۔ قاری ان جھومروں اور جھالروں کی آوازوں سے آواز ملا کر خود کو اپنی ذات کا ہم نوا بھی بنا سکتا ہے۔

قمر علی عباسی کے اسلوب میں جزئیات کو بنیادی درجہ حاصل ہے، مثلاً ''پتلی گلی، چند کمرے، رات، کپڑے، جوتے، کھمبا، بازار، دکانیں، ٹریفک، ڈالر، شیشے، میزیں، تھال، میز پوش، چوراہا، سڑک، راہ داری، باغ، پھل، قالین، دروازے، کرسیاں، کھڑکیاں'' ان الفاظ کو ایک اور نام سے بھی پکارا جاسکتا ہے دریچہ۔۔۔ دل و نظر کا دریچہ۔ وہ آلتی پالتی مار کر اپنے ہی ڈھنگ سے، کوسوں دُور، دھول جھاڑی میں بسے منظروں میں نہاں دھڑکنیں شمار کرتا ہے۔ ان دھڑکنوں میں ''کاجل بھری آنکھیں، غزال، لہراتے بال، چاند چہرے'' رقصاں ہیں۔ اس رقص میں جسموں کا تغیر ہے، اذہان کا تبدّل ہے اور تیزی سے بنتے، بگڑتے ماحول کا تمدّن۔

قمر علی عباسی ''گرفتارِ ویزا'' ہے جو ''معجزہ، مدد، کرامت، دعا'' سے ''قبولیت'' کا طالب نظر آتا ہے۔ قبولیت سے متعلق طلب کی شعوری اور غیر شعوری، دانستہ اور نادانستہ کاوشات کے آئینہ میں اس کا عکس واضح طور پر نظر آتا ہے۔ ''وہ تعال ہے۔/ غیروں سے مایوس ہو کر، وہ اپنی تلاش میں نکلتا ہے/ وہ عربی زبان سے ناواقف ہونے باعث، ایک محتاط انداز میں اشاروں اور کنایوں سے مافی الضمیر ادا کرنے کی سعی کرتا ہے/ وہ انگریزی زبان کا ایک لفظ ہی سُن کر خوش ہو جاتا ہے/ وہ کسی لڑکی کو بھاری بوجھ اُٹھاتا دیکھ کر مدد کر لیے تیار ہو جاتا ہے/ وہ اللہ سے ویزا کی دعا مانگتا ہے/ وہ بعض اوقات دھڑکتے دل سے قدم آگے بڑھاتا ہے/ وہ کسی بیوہ کا سہارا بننے کے لیے نکاح ایسے نیک کام کے لیے تیار نہیں/ وہ لوگوں کی ہنسی میں کوئل کی کوک سنتا ہے/ اُسے سیاہ رنگ کا قہوہ ناپسند ہے/ وہ بزرگوں کے سامنے ادب سے کھڑا ہوتا ہے/ وہ اگلی منزل کی جانب روانگی کے وقت سکون سے آنکھیں بند کر لیتا ہے۔'' وغیرہ وغیرہ

''شام تجھے سلام'' میں دل اور دیدے کے ساتھ وانظر آتے ہیں۔ مناظر، ماحول، تہذیب، ثقافت، تاریخ اور خود آگاہی کے لیے احتسابِ جہاں اور احتسابِ ذات کے لیے۔ ان احتسابوں میں، دہانہ پر پہنچ کر، تحریر کا دریا بچھڑ جانے والی موجوں کو وصل کی دعوت دیتا نظر آتا ہے۔ ان میں سے چند موجوں کو حیرت، حسرت، عبرت اور عزلت سے بھی موسوم کیا جاسکتا ہے۔ دوسری جانب چند دیگر موجوں کو عقیدت، محبت، قربت اور دولت کے ناموں سے بھی یاد کیا جا سکتا ہے۔ انحراف، اتفاق/ آزادی، غلامی/ شعیہ، سُنّی/ عرب، عجم/ موت، زندگی/ ادھوری، پوری/ حلال، حرام/ قدیم، جدید/ ممکن، ناممکن/ دُور، قریب'' کے پرتو بھی انہی موجوں کی انگلی تھامے، خوابِ خرام میں، کسی انجانی، بے سمت منزل کے خواہاں ہیں۔

اب ایک دو سخن گسترانہ باتیں۔۔۔ صلاح الدین زنگی کو ہر بار ''زنگی'' ہی کہیے۔ اُسے ''زندگی'' کے ایک نئے نام سے نہ ''کمپوز'' کیجیے/ لفظ ''پتا'' کا آخری حرف ہائے ہوّز نہیں، الف ہے/ لفظ ''دین'' کی جمع ''ادیان'' لکھیے/ نیز، جب جمع کا صیغہ مطلوب ہو، لفظ ''ڈالر'' کو ''ڈالرز'' ہی لکھیے، جیسے ''ایک روپیہ'' اور ''دو روپے''۔

اور ہاں، اس سفر نامہ کا نام اگر ''شام تجھے سلام'' کے بجائے ''شام تجھے سلام ہے'' ہوتا تو یہ نام ایک باقاعدہ موزوں مصرع میں ڈھل جاتا یعنی:

ش م ث جے س لا م ہے
مُف ت عِ لُن مَ فا عِ لُن

(بحر رجز مُربع مُطوّی مجنون)

اب ایک موذیانہ درخواست۔۔ محرّرِ سفر نامہ نثر میں شاعری کریں، بلکہ نثر میں ساحری کریں لیکن کسی شعر سے اپنی نثر کا رُخ نہ سجائیں۔ اس سفر نامہ میں صرف ایک شعر ہے ''میرے ہر قدم کے ساتھی/ میرے ہر نفس کی راحت''۔ یہ شعر بے وزن ہے کہ دونوں مصرعوں میں پہلا لفظ ''میرے'' استعمال ہوا ہے یعنی ''سببِ خفیف'' کے ساتھ۔ اسے ''سببِ ثقیل'' کی صورت میں ہونا چاہیے۔ اس طرح یہ شعر وزن میں یوں ہوگا ''مرے ہر قدم کے ساتھی/ مرے ہر نفس کی راحت''۔ اس شعر کی تقطیع یوں ہوگی۔ فَ عِ لاتُ، فاعِ لاتُن/ فَ عِ لاتُ، فاعِ لاتُن (بحر رَمل مُربّع مشکول سالم)

قمر علی عباسی! ''شام تجھے سلام'' کی تحریر سے ہمارا ذوقِ ادب سجانے پر مبارک باد قبول کیجیے۔

○

''ہم نفس، ہم قدم'' والے مصرعوں کے ضمن میں، چند مَن چلوں نے یہ خبر اُڑائی ہے۔ ''قمر علی عباسی اور مامون ایمن کے درمیان ''مُک مُکا'' ہو گیا ہے''۔ ثبوت؟ قمر نے اپنے نئے سفر نامے کا نام ''لنکا ڈھائے'' رکھا ہے۔ ان لفظوں سے ''فَع لُن، فَع لُن'' کے وزن پر ایک مصرع موزوں ہوتا ہے۔ یہ مصرع بھی بحرِ متقارب ہی میں ہے لیکن چار رُکنی صورت میں۔ سو اب دونوں ہی کے چہروں پر جیت کا رقص نمایاں ہے۔ قمر نے ایمن کو اور ایمن نے قمر کو خوش کیا ہے۔ اُس خوشی کا اظہار اس غیر مقفّہ نظم میں اعتراف کے ساتھ اپنا رنگ جماتا نظر آتا ہے۔

(لنکا ڈھائے سے منتخبہ)

''گلاب کی سرخ کلی''

محمود شام
(کراچی)

خواتین وحضرات!

''آؤ برطانیہ چلیں'' کی افتتاحی تقریب میں قمر علی عباسی صاحب کی ہم سفری کا قرض چکانے کے لیے شرکت کرنا پڑی تھی۔ اس سفرنامے کو پڑھ کر بات کرنے کی ضرورت اس لیے نہیں پڑی تھی کہ یہ سارا دوران سفر ہم سنتے رہے تھے۔ جتنی کہنے سننے کی باتیں تھیں۔ یہ برطانیہ کی مختلف وادیوں میں اور جہازوں میں کر چکے تھے۔ ان میں اچھی بات یہ ہے کہ جو کہنا ہے منہ پر کہہ ڈالتے ہیں ہم تو خیر (برطانیہ میں خزاں) اس سے پہلے ہی لکھ چکے تھے۔ کوئی اگر اور سفرنامہ نگار ہوتو وہ ان کی دن بھر کی باتوں کو ساتھ کے ساتھ لکھتا رہے۔ تو ان سے پہلے سفرنامہ مارکیٹ میں لاسکتا ہے۔ انہیں بھی شاید اس بات کا احساس ہے۔ اس لیے یہ اگلے سفر سے پہلے ہی سفرنامہ چھپوا بھی لیتے ہیں۔ اس کی تقریب بھی منعقد کر ڈالتے ہیں۔

لیکن ایک بار چلو وینس کی تقریب کے انعقاد میں کچھ نہیں کافی تاخیر ہوگئی ہے۔ وینس کا یہ سفر انہوں نے برطانیہ کے سفر کے ساتھ ہی کیا تھا۔ یہ ہمیں گلاسکو میں خالد عزیز اور ایک عفیفہ کے رحم وکرم پر چھوڑ کر اٹلی چلے گئے۔ ایک ٹکٹ میں دو مزے لے لیے۔ ایک سفر کے دو سفرنامے لکھ ڈالے برطانیہ سے راہ فرار کے اسباب پر اگر بات کی جائے تو اس عفیفہ کے علاوہ کوئی اور سبب دکھائی نہیں دیتا۔ میرے خیال میں یہ حق بجانب بھی تھے کہ یہ اسلام آباد ائیر پورٹ سے ہی اس ہم سفر خاتون سے بیزار ہوگئے تھے۔ حالانکہ ان کے پورے سفرنامے پڑھ لیجیے نوجوان خواتین بھی ان کا کچھ بگاڑ نہیں سکیں۔ بے چاری بزرگ خاتون ان کو کیا صدمہ پہنچا سکتی تھی۔ لیکن اپنے آپ کو کم تر ثابت کرنے کے لیے عباسی صاحب نے اس خاتون سے بیزاری عام کا اعلان کر دیا۔ اٹلی کا سفر پہلے سے ان کی منصوبہ بندی میں نہ ہوتا۔ تو یہ شاید خالد عزیز کے کمرے کے باہر احتجاجی دھرنا مارنے کا اعلان کر دیتے۔

حال ہی میں افغانستان کے نئے وزیر اعظم حکمت یار نے اعلان کیا ہے کہ کابل کے سینماؤں میں صرف اسلامی فلمیں چل سکیں گی۔ کسی زمانے میں پاکستان سے مسلمان انڈین فلمیں دیکھنے کشاں کشاں کابل جایا کرتے تھے، اب گھر گھر انڈین فلمیں ڑی ای ایل جین وغیرہ وغیرہ کے توسط سے چل رہی ہیں۔ اس لیے مسلمان حسب توفیق یہیں مادھوری اور تبو کو دیکھ کر اللہ کا شکر بجا لاتے ہیں۔ کابل والے اب کس کے لیے انڈین فلمیں چلائیں اسلامی فلمیں بنی ہی نہیں چلیں گی کیسے طالبان نے فوراً اعلان کر دیا کہ فلم اسلامی یا غیر اسلامی نہیں ہوتی اسلام میں فلم کی گنجائش ہی نہیں ہے۔ حکمت یار جن اسلامی فلموں کی بات کر رہے ہیں ان کے اسکرپٹ کے لیے انہیں قمر علی عباسی سے بات کرنی چاہیے۔ کیونکہ ان کے سفرنامے خالصتاً اسلامی سفرنامے ہوتے ہیں۔ غیر محرم عورتوں سے ہمیشہ دور رہتے ہیں۔ اگر انہوں نے اپنے چہرے پر پردہ نہیں ڈالا ہے تو یہ خود اپنی آنکھوں یا عقل پر پردہ ڈال لیتے ہیں۔ یہ عین ممکن ہے کہ ایسا یہ اپنے ہر سفر کی منزل اور ہر سفر کی ساتھی کے ڈر سے کرتے ہوں۔ لیکن محققین یہی کہتے ہیں کہ یہ ایسا اسلامی تعلیمات کے سبب کرتے ہیں۔ ایک زمانے میں کراچی یونیورسٹی میں بھی طلبہ وطالبات کے درمیان کم از کم تین فٹ فاصلے کی شرط رکھی گئی تھی۔ ممکن ہے عباسی صاحب نے اس زمانے میں گریجویشن کی ہو۔ یہ تین فٹ کا فاصلہ انہیں ہر ملک میں پارسائی اختیار کرنے پر مجبور رکھتا ہے۔

ایک بار چلو وینس کی چوا۔ حنا ایلز بتھ اور جتنی بھی خواتین ہیں وہ جب اپنے اپنے ملک گئی ہوں گی تو انہوں نے یقیناً اسلامی معاشرے کی بہت تعریف کی ہوگی کہ نظریاتی اسلامی ملک پاکستان کے ایک مرد مومن ہمارے ہم سفر تھے۔ انہوں نے جتنی صالحانہ اخلاقیات کا مظاہرہ کیا اس سے احساس ہوتا ہے کہ اسلامی معاشرے کے کیا خدوخال ہوں گے۔

میں یہ سب کچھ ایک بار چلو وینس کے مطالعے کی بنیاد پر کہہ رہا ہوں۔ چوا۔ حنا۔ ایلز بتھ اپنے اپنے شہروں میں یقیناً اپنے تجربات کی بنیاد پر کہہ رہی ہوں گی۔ اگر ان کے تجزیئے اور اس سفرنامے کی روداد میں اختلاف ہے تو دروغ بر گردن عباسی۔

قمر علی عباسی اپنی پارسائی کو ہر سفرنامے میں ثابت تو کرتے ہیں۔ لیکن مسلط کرنے کے انداز میں نہیں بالواسطہ طور پر۔ میرے خیال میں پارسائی سے زیادہ موزوں لفظ یہاں بے گناہی رہے گا۔ کیونکہ پارسائی کے لیے بھی پہلے گناہوں کا تجربہ ضروری ہے۔ لذت گناہ حاصل کرنے کے بعد گناہ سے اجتناب زیادہ مشکل ہے۔

عباسی صاحب ٹک دیکھ لیا دل شاد کیا اور چل نکلے کے مصداق زمانے کے سرد وگرم، سیاہ سفید کو دیکھتے، مسکراتے گزرتے رہتے ہیں۔ کوشش کرتے ہیں کہ آپ بھی ساتھ ساتھ مسکراتے رہیں نہ قہقہے کی نوبت آنے دیتے ہیں نہ ہی رونے کی۔ رونا دھونا وہ وطن واپسی پر ملتوی رکھتے ہیں۔ اس کا موقع یہاں بہت ملتا ہے اور وافر مقدار میں ملتا ہے پھر رونے کا مزا بھی اپنوں میں ہی ہے۔

وہ جہاں بھی جاتے ہیں اس دیس کی تاریخ ان کے ذہن میں رہتی ہے۔ ماضی کے حوالے سے وہ حال کے مشاہدے کی کوشش کرتے ہیں اور اپنے قاری کو بھی دھیمے دھیمے انداز میں تاریخی پس منظر سے آگاہ کرتے چلے جاتے ہیں۔ جہاں ضرورت ہو وہاں تفصیلات اور جزئیات بیان کرنے میں بخل سے کام نہیں لیتے۔ لیکن غیر ضروری طور پر بھی تفصیلات میں نہیں جاتے اور خاص طور

پر جب ذکر اس پری وش کا ہو۔ تو عباسی صاحب کا بیان ''غالب والا'' نہیں رہتا۔ ایک دم گریز کر جاتے ہیں۔

دیکھئے صفحہ 87 آخری پیراگراف

''ہمارے ساتھ سفر کرنے والی خواتین شاپنگ کر رہی تھیں۔ مرد حضرات سیلز گرل کی نوک پلک دیکھ رہے تھے۔ اور ہم ان سب کے تماشائی کی''

کس قدر خوبصورتی سے انہوں نے کام کو تقسیم کیا ہے۔ خواتین اور حضرات کے درمیان۔ اور خود بالکل الگ تھلگ کھڑے ہو گئے ہیں۔

لیکن کہیں کہیں کمال کی علامت نگاری ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

''واپس آئے تو ایک خوبصورت مکان کی منڈیر سے گلاب کی ایک سرخ کلی ہوا سے کھیل رہی تھی۔ ہمارا راستہ روکنے لگی۔ چند لمحے ہم اسے دیکھتے رہے وہ مسکرانے لگی اور ہم نے ہاتھ بڑھا کر اسے توڑ لیا وہ اور کھل گئی''

ہم شاعر لوگ ہیں استعاروں اور تشبیہوں سے کھیلتے ہیں۔ لیکن یہاں قمر علی عباسی کھیلنے میں شاعروں کو بھی مات دے گئے ہیں۔ آپ اس عبارت کو اگر ڈرامائی تشکیل دیں گے تو گلاب کی سرخ کلی کا کردار کون ادا کرے گا۔ توڑنے اور کھلنے کا منظر کیسے پیش کیا جائے گا۔

اس منظر کی فلمبندی اسلامی اور غیر اسلامی دونوں طریقوں سے ہو سکتی ہے۔ صرف علامات تک رہیں تو کابل اور لاہور کے سینما میں دکھائی جا سکتی ہے۔ اگر حقائق تک جائیں تو یہ فلم روم، لندن حتیٰ کہ کوپن ہیگن کے سینماؤں میں بھی دکھائی جا سکتی ہے۔ بہر حال سنسر سے ایک جگہ کچھ چوک ہو گئی ہے۔ صفحہ 123 اور 124 پر ڈانس کا سین چل گیا ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ مصنف میں اتنی ہمت کیسے آ گئی۔ آپ پوچھیں گے کس چیز کی ''ڈانس کی'' نہیں صاحب ڈانس تو وطن سے باہر پاکستانی کر ہی لیتے ہیں لیکن اس سین کو یعنہ بیان کر دینے کی۔ ایک ایک تفصیل بیان کی گئی ہے خاتون کے الٹے ہاتھ سے ان کی ہتھیلی پکڑنے سے لے کر ڈریئے مت نزدیک ہو جایئے تک کے مکالمے۔

اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔

''ایک بار چلو وینس'' کو اپنے اسلوب اور زبان کے حوالے سے میں نے ان کے دوسرے سفرناموں سے زیادہ دلچسپ اور پر تاثیر پایا ہے، اس میں صرف روم کے مناظر کا ہی نہیں ان کی اپنی تحریر کا بھی کمال ہے۔ پھر وہاں ان کے ساتھ کوئی پاکستانی نہیں تھا۔ اس لیے انہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق پکڑے جانے کا کوئی خدشہ نہیں تھا۔ انہوں نے کھل کر دیکھا اور کھل کر لکھا۔ کتاب کے نام سے لے کر الوداعی کلمات تک ایسے نغمگی موج تہ نشیں کی طرح رواں رہتی ہے۔ میری دعا ہے کہ قمر علی عباسی وینس جیسے اور دو چار خوبصورت مقامات آہ و فغاں پر ہو آئیں تو اردو کو دو چار اور یادگار سفرنامے مل جائیں گے۔

بقیہ
بنانے والے کی تعریف

قمر عباسی کو میرے دل نے دو مرتبہ دعائیں دی ہیں۔

ایک مرتبہ ۱۹۹۱ء کے اکتوبر کی آخری تاریخ کو۔۔۔

عباسی کی ایک عادت یہ ہے کہ وہ سحر خیز ہے۔ اپنے کالم اور سفرنامے بھی علی الصبح لکھتا ہے۔ جب تک ملازمت پر تھا سب سے پہلے ریڈیو اسٹیشن پہنچنے والوں میں شامل تھا۔ دفتر کے لوگوں پر بھی وقت پر آنے کی پابندی عائد کر دی تھی۔ اور اوقاتِ کار ختم ہونے کے بعد پھر نہیں ٹھہرتا تھا۔ گھر پہنچا اور گھنٹے دو گھنٹے کی نیند لے لی، شام کو پھر چاق و چوبند یعنی دوپہر کی نیند وہ کسی قیمت پر قربان نہیں کرتا تھا۔ نیند قربان کر کے وہ اپنے افسرانِ اعلیٰ تک کو لینے یا چھوڑنے کے لیے ایئر پورٹ تک نہیں جاتا تھا اور اس بات سے تمام ہی لوگ واقف تھے۔

میں نے اکتوبر کی تیسویں تاریخ کی رات کو اسلام آباد سے فون کر کے اطلاع دی کہ میں دوسرے دن دوپہر کو اپنے والد کے جسدِ خاکی کو لے کر کراچی پہنچ رہا ہوں، میرے بھائی تاجدار عادل اور بیٹے جنید بختیار کو بتا دو شاید وہ لوگوں کو اطلاع دینے میں مصروف ہیں اور مجھے اُن کے فون نمبر نہیں مل رہے ہیں۔

اسلام آباد سے فلائٹ کراچی دوپہر ساڑھے تین بجے پہنچی۔ قمر علی عباسی ایئر پورٹ پر موجود تھا۔ اسے دیکھ کر میرے دل کو جو ڈھارس ہوئی میں اُسے ڈھارس نہیں اپنے دل کی دعا سمجھتا ہوں۔

دوسری مرتبہ پھر میرے دل نے عباسی کے لیے دعا کی۔

۵/اپریل ۲۰۰۳ء کی دوپہر کو نیویارک سے بھابھی نیلوفر نے ٹورنٹو مجھے ٹیلی فون کیا اور بتایا کہ تین دن پہلے قمر کی اوپن ہارٹ سرجری ہوئی ہے ابھی آئی سی یو میں ہیں، سلطان بھائی آپ صحت کے لیے دعا کیجیے، یہ سن کر۔۔۔ میری جو کیفیت ہوئی وہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔

قمر علی عباسی کے ساتھ جو خوبصورت الفاظ کے ساتھ اس طرح کھیلتا ہے کہ پڑھنے والوں کے دل خوش ہوتے ہیں اور الفاظ کی عصمت و حرمت بھی قائم رہتی ہے۔ مجھے اپنی محبت کے اظہار کی کوئی نہ کوئی صورت تو نکالنی ہی پڑے گی۔ اظہار بھی ضروری ہے ورنہ لوگ عبادت کیوں کرتے۔۔۔

''دلّی دُور ہے''

اکرام بریلوی
(کناڈا)

فوجی مطلق العنان بادشاہت سے بیزار ہو کر دو سال پہلے ریٹائرمنٹ لے لی تھی اور کناڈا جیسے جمہوری اور بین الثقافتی ملک میں جانے کے لیے پر تول رہا تھا۔ وطن کو خیر باد کہنے سے پہلے احباب و انصار سے ملنا ملانا ضروری تھا۔ایک دن ویلکم بک پورٹ کے قمر زیدی صاحب سے ملنے پہنچا تو ایک نوجوان سے ملاقات کا موقع مل گیا۔قمر زیدی نے متعارف کراتے ہوئے کہا
''آپ قمر علی عباسی ہیں۔ریڈیو پاکستان میں اعلیٰ منصب پر فائز ہیں''

باتوں کا سلسلہ شروع ہوا تو معلوم ہوا کہ موصوف ''لندن پلٹ'' ہیں اور اور سیر وسیاحت کے بعد وطن واپس آئے ہیں اور لندن کا سفر نامہ لکھنے کی تیاری کر رہے ہیں۔قمر علی عباسی صاحب جیسے بھرے بیٹھے تھے رواں ہوئے تو مجھے اور قمر زیدی کو بولنے کا موقع ہی نہیں دیا۔بس فراٹے بھرتے رہے۔قمر زیدی دوست نواز اور کھرے کاروباری شخص ہیں۔ویسے ہم بھی دلکشا رکھتے ہیں اور لب کشائی سے حددرجہ گریز کرتے ہیں کہ بھرم قائم رہے۔ملاقات کے اس خوشگوار و یادگار حادثے کو ایک مدّت گزر گئی۔نام تو نام، یادِ یارِ گرم گفتاری بھی ماند پڑ گئی۔

پھر یوں ہوا کہ ہمارے ایک بہت ہی عزیز دوست اور کرم فرما مشہور ومعروف افسانہ نگار سلطان جمیل نسیم کناڈا آئے تو اُن کے ذریعے بھولی ہوئی ملاقات کی تجدید ہوئی۔ان کی زبانی قمر علی عباسی سے غائبانہ ملاقات کا سلسلہ از سرِ نو شروع ہو گیا۔یہ سلسلہ مہینوں جاری رہا کہ اچانک ٹورنٹو کی ایک عالمی اردو کانفرنس میں اُن سے دید وادید ہوئی۔مل کر معلوم ہوا کہ موصوف کم وبیش چوبیس، پچیس سفر نامے لکھ چکے ہیں اور ہم سے چار گھنٹے کی ڈرائیو (Drive) پر دُور امریکہ کے شہر ''ٹرائے'' (Troy) میں آباد ہیں۔

یہ تمہید تو کسی طور نہیں مگر ہے بھی!

''دلّی دُور ہے'' قمر علی عباسی کا دوسرا سفر نامہ ہے اور دلّی کی طرح دلربا ہے جو بار ہا لٹی اور بار ہا لٹنے پر بھی نکھار آیا۔

آیئے تو پھر سفر نامے کی سیر پر نکلنے سے پہلے کچھ عنوان سے متعلق باتیں ہو جائیں۔

جنہیں ہنوز یہ پتہ نہیں کہ اندر پت، پانی پت، سونی پت، باغ پت اور تل پت جسے پانڈوں نے کوروں سے واپس لینے کا مطالبہ کرنے پر مہا بھارت کا رن پڑا تھا، اُن کے لیے دلّی ہمیشہ دُور رہے گی کہ ان پانچوں گاؤنوؤں کو ملا کر ہی دلّی وجود میں آئی۔(مغل بادشاہ) بابر کے لیے ''دلّی دُور است'' اس لیے رہی کہ اُسے اپنی فوج ظفر موج کے ساتھ اٹک کے دشوار گذار اور تیز رفتار دریا کو عبور کر کے دلّی آنا پڑا اور دلّی آتے ہوئے کئی رزم گاہوں سے گذرنا پڑا۔انگریز بہادر بنگال سے سرزمین ہند میں داخل ہوئے جس کی پاداش میں اُنھیں دلّی پہنچتے پہنچتے ڈیڑھ سو سال لگے۔ہمیں دلّی اس لیے عزیز ہے کہ یہ میرؔ و غالبؔ کا وطن رہا اور بقول میر تقی میرؔ جس شہرِ دلستاں کے گلی کوچے اوراق مصوّر تھے اور جہاں درویشوں کے درویش حضرت نظام الدین جیسے اولیائے عظام کی دلنواز درگاہ ہے۔۔۔جہاں حضرت امیر خسروؔ کے گیتوں کی سدا بہار گونج آج بھی سنائی دیتی ہے اور ہمیں یہ جنت فراواں اس لیے بھی عزیز ہے کہ یہاں غالبؔ نام آور م آسودۂ خاک ہیں اور اس لیے بھی عزیز ہوئی کہ ہم ان گلی کوچوں سے بہت بے آبرو ہو کہ نکلے۔۔۔اور ستم بالائے ستم یہ ہے کہ اتنی مدت گزر جانے پر بھی دلّی ہم سے دُور ہے کہ آج بھی ہمارے اور عالم میں انتخاب، اس شہر ستم پیشہ کے درمیان سیاست گری کی عشوہ گری کے طفیل آہنی دیواریں کھڑی ہیں۔قمر علی عباسیؔ کے لیے اس لیے دُور ہے کہ وہ ممبئی کے راستے ہندوستان میں داخل ہوئے جو بقول شبلی نعمانی ''عروس البلاد ہے اور اپنے حسنِ دلآرا اور باہزاراں ہنگامہ ہائے طرف ونشاط اور مطربیان ونغمہ نواز ان سحر طراز کے سبب اپنی نرم وگرم گرفت میں قید کر لیتا ہے۔کچھ دن کی اسیری کے بعد ہم کشاں کشاں زیدی صاحب کو یہاں سے لے کر نکلے تو ایک جلتی دوپہر دہلی پہنچے۔دلّی کی دُوری مٹی۔سیر وسیاحت کے مزے لوٹے۔زیدی اپنے عزیزوں اور قرابت داروں سے ملنے ملانے لکھنؤ چلے گئے اور ہم (قمر علی عباسی) اپنے کعبۂ دل، امروہہ کے لیے عازمِ سفر ہوئے۔امروہہ میں داخل ہونے سے پہلے کی کچھ جھلکیاں ملاحظہ ہوں:

''ٹرین چلی تو لال قلعہ آ گیا۔اتنا نزدیک کہ ہاتھ دو تین گز بڑا ہوتا تو اسے چھو سکتے تھے۔پھر پُل آ گیا، ایک دریا پانی سے بھرا چاروں طرف کی زمین کو سبز کرتا بہہ رہا تھا۔یہ جمنا تھی اسے عبور کیا تو دونوں طرف حدِ نظر تک سبزہ ہی سبزہ تھا۔کھیتوں میں فصلیں لہلہا رہی تھیں، جگہ جگہ آم کے باغ تھے اُن کے درمیان جھونپڑی اس کے سامنے بیل اور اُن کی رکھوالی کرتا کُتا۔۔۔کھیتوں کی منڈیروں کے ساتھ بہتا پانی۔فصل کاٹتی رنگین ساڑھیاں پہنے عورتیں۔سرسبز کھیتوں کے کنارے کسان، پگڈنڈی پر گدھے پیچھے پیچھے تیز تیز بھاگتے بچے، بدلتے رنگ، بدلتے منظر۔۔۔(دوسرا پارہ) آسمان صاف ہو گیا۔

گہرا نیلا آسمان، سنہری دھوپ کھیتوں کے کنارے سیاہ بل کھاتی سڑک اُس پر زرد اناس سے لدا ٹرک۔ہم رنگ ونور کی دنیا میں سفر کر رہے تھے۔یہ زمرد کی طرح زمین ہمیں اپنا ہرا جھنڈا نظر آئی۔ خیالوں میں ہم کسان بن گئے۔زمین کے سینے کو چیر کے بیج بونے

لگے۔ دھانی رنگ کی بارش میں بھیگنے لگے آہستہ آہستہ شرارتی پودوں کو زمین سے باہر نکلتے دیکھنے لگے۔ پھول کھل اٹھے پات ہرے ہوگئے۔ کم کم باد و بہاراں کا ایسا سماں نظر آنے لگا کہ ایک نئی دنیا، خواب کی دنیا چاروں طرف پھیل گئی۔ خوابوں کا طلسم ٹوٹا تو غازی آباد ریلوے اسٹیشن کا پلیٹ فارم سامنے تھا۔۔۔ غازی آباد سے ٹرین چلی تو گجروالہ آیا۔ ایک زمانے میں یہاں پیڑے ملتے تھے اب اُس کی تصویریں بھی نہیں ملتیں۔

اس کے بعد ہاپڑ آیا۔۔۔ پھر ٹرین چلی اب امروہہ آنے والا تھا۔ دل دھڑک رہا تھا۔۔۔ یہ کون سا احساس ہے، یہ کون سا جذبہ ہے۔ دونوں طرف باغ تھے۔ ہمارے دل میں پھول کِھل رہے تھے۔ امروہہ آ رہا ہے۔۔۔ ٹرین کو بڑی جلدی تھی۔ اچانک پلیٹ فارم آ گیا۔ بڑا سا بورڈ لگا تھا ''امروہہ'' ٹرین رک گئی۔ وقت تھم گیا۔

ایک اور چھوٹی سی جھلکی ملاحظہ ہو۔

''دونوں طرف کھیت تھے پھر بائیں طرف ایک عمارت آئی۔ رکشہ ڈرائیور نے بتایا یہ اسکول ہے۔ پھر بازار آیا اور دکانیں۔ انہیں دیکھ کر عجیب سا احساس ہوا۔ یہ سب امروہہ ہے۔ رکشہ پتلی گلیوں میں گھس گیا۔ اتنی پتلی کہ صرف ایک رکشہ گزر سکتا تھا اور اگر دوسرا رکشہ آ جائے؟ سفر اس خوف میں کٹا لیکن مخالف سمت سے رکشہ نہ آیا۔ محلّہ کالی پگڑیاں آ گیا''۔

اب ایک اور تصویر دیکھیں:

''دروازہ کھل گیا۔ ایک دراز قد شفیق مہربان چہرہ ہمارے سامنے کھڑا تھا۔ طویل برسوں کی جدائی نے اُن کے چہرے پر محبت اور بڑھا دی تھی۔ بال برف کی طرح سفید ہو گئے تھے۔ انھوں نے ہمیں اپنے سینے سے لگا لیا کیسا سکون ملا۔ کیسی راحت ہوئی۔ وقت ایک لمحے کو رک گیا۔ ایک ننھا سا بچہ سڑک پر ایک شخص کی انگلی پکڑے جا رہا ہے۔ اس کے کاندھے پر سوار ہے۔ اب وہ ہاتھ بوڑھا ہو گیا ہے وہ کاندھے جھک گئے ہیں۔ احتسابِ وقت نے آتے جاتے موسموں نے سب کچھ بدل دیا ہے۔ آنکھیں دھل گئیں۔ دل کے کٹورے میں جو پانی بھر گیا تھا چھلک گیا۔ دروازہ کھول کر ہم ماموں کے ساتھ ایک نئی دنیا میں داخل ہو گئے۔ طلسم کی دنیا جہاں وقت سانس روکے کھڑا تھا۔ در و دیوار آنگن اُس میں لگا ہاتھ کا نل سب کچھ وہی جو ہم نے خواب میں دیکھا تھا اور اب جاگتی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔

یہ سفرنامے کی تصویریں ہیں، ناول کی جھلکیاں اور تفصیلی ٹکڑے سے لگتے ہیں۔ زبان و بیان کے ساتھ اندازِ تحریر میں بلا کی جاذبیت اور جادو ہے۔ معمولی باتوں میں ڈرامائی کیفیت اور جذبوں میں گھلی گھلی چاشنی ہے۔ یہ انداز جگہ جگہ سفرنامے کی بُنت میں موجود ہے جس میں دلسوز درمندی بھی ہے، طنز و مزاح کے نرم و گرم تیور بھی۔ کردار نگاری کے جوہر بھی ہیں اور قمر علی عباسی کا فطری پندار ہنر بھی کارفرما نظر آتا ہے۔ بیان میں سادگی و پُرکاری ہے جو ہر بڑے آرٹ کا جوہر قابل ہوتا ہے۔ مختصراً اس سفرنامے کا سب سے اہم مقصد وطن سے بے بہا پیار ہے جو نوکِ قلم سے بے اختیار بہہ نکلا ہے۔ منجملہ اور صفات کے یہ سفرنامہ، سفرناموں کے عام انداز سے ہٹ کر ادب کی حدیں چھو رہا ہے۔ فنون حرف و لفظ نگاری کا منجھا ہوا سلیقہ، افسانوی دلکشی، واقعہ نگاری، مسکراتا ہوا طنز و مزاح وہ کیا کچھ نہیں جو اس سیّال سفرنامے میں ٹھاٹیں مارتا موجود نہیں۔

اس سفرنامے کی مابہ امتیاز خصوصیت اور صحت مند خوبی یہ ہے کہ قمر علی عباسی نے یادِ ماضی کو عذاب بنانے، کُڑھتے رہنے اور غمناکی میں ڈبونے کے بجائے تحت الشعور کا کرشمہ اور حیرت و حسرت پر تاثیر حسیّاتی نغمہ بنا کر پیش کیا ہے جو ان کی تخلیقی نفس بڑی مثبت نشاندہی کرتا ہے۔

○

''ناصر زیدی مزید بحث کرتا لیکن ہال میں سے دو تین آوازیں سنائی دیں بیٹھ جاؤ بیٹھ جاؤ اس لیے مجبوراً بیٹھ گئے۔ وہاں صرف دو سیٹیں خالی تھیں سامنے بہت بڑا اسکرین تھا جس پر خاندانی منصوبہ بندی کی پبلسٹی فلم دکھائی جا رہی تھی۔ اچانک زیدی نے ہمارے کان میں سرگوشی کی میرے برابر میں ایک بھنگن بیٹھی ہے۔ تمہیں کیسے اندازہ ہوا کیا جھاڑو دیکھی ہے ہم نے پوچھا؟ نہیں اس کے کپڑے دیکھ لو، رنگ دیکھ لو۔ تم عورتوں کا رنگ اور لباس کیوں دیکھ رہے ہو اسکرین پر دیکھو۔ پلیز میری کرسی پہ آ جاؤ یہ تصور میرے لیے تکلیف دہ ہے کہ میرے برابر میں ایک بھنگن بیٹھی ہو۔ ہم نے اپنی برابر والی کرسی کی طرف دیکھا نہایت گہرے رنگ کی ایک خاتون مٹیالے سے کپڑے پہنے بیٹھی تھی زیدی کو سرگوشی میں بتایا یہاں بھی ایک بھنگن ہے کہو تو جگہ بدل لیں اسی وقت اسکرین پر کوئی رات کا منظر آ گیا''

(دلّی دُور ہے سے منتخبہ)

☆

''منظر اِک بلندی پر''

نورالسعید اختر
(ممبئی، بھارت)

مندرجہ بالا عنوان کے پس پردہ جو شخصیت پنہاں ہے اس کی وضاحت کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ اردو زبان وادب ہی کیا بلکہ دیگر زبانیں بولنے والے لوگ بھی اس راز سے بخوبی واقف ہیں کہ کون معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں؟ راقم کا خیال ہے کہ سفرناموں کے اس مسافر کے نام ہی میں کوئی غیبی تاثیر مضمر ہے کیونکہ اگر آپ پونا (ہندوستان) سے وائی روڈ کی طرف ۲۴، ۲۵ میل کے فاصلے پر سرِ راہ ایک تاریخی مقام ہے جہاں مغلیہ دور کے جانباز سپہ سالار افضل خان کا مقبرہ ہے۔ اسی کے آس پاس ایک صوفی صافی حضرت قمر علی شاہ درویش کی درگاہ مرجعِ خلائق ہے۔ بلاتخصیصِ مذہب وملت لوگ یہاں جوق در جوق آ کر منّت، مرادیں لے کر آتے ہیں اور بڑی حد تک باریاب ہوتے ہیں۔

حضرت صوفی قمر علی شاہ درویش کی درگاہ کے احاطے میں دالان ہے جہاں دو پتھر رکھے ہوئے ہیں۔ ان میں ایک بڑا (تقریباً ۲۵ تا ۳۰ کلو) اور دوسرا ۱۵ تا ۲۰ کلو کا ہے۔ بڑے پتھر کو اٹھانے کے لیے کم از کم چھ لوگ اور چھوٹے کے لیے چار افراد درکار ہیں۔ ان پتھروں کو اُٹھانے کا طریقہ یہ ہے کہ ہر شخص اپنی انگشتِ شہادت پتھر کے نیچے لگائے اور سب مل کر ایک ساتھ بلند آواز میں ''یا قمر علی شاہ درویش'' کا نعرہ لگائیں تو یہ پتھر بہ آسانی ایک بلندی تک اس وقت تک اٹھتا رہے گا جب تک نعرہ لگانے والوں کی سانسیں نہیں ٹوٹتیں۔ یہاں کے لوگ اسے حضرت قمر علی شاہ درویش کا معجزہ تصور کرتے ہیں اور نہایت عقیدت سے اس صوفی کے مزار پر پھول، ہار اور چادریں چڑھاتے ہیں۔

جناب قمر علی عباسی بھی اردو ادب کے صوفی صافی اور سفرناموں کے قلندر صفت ادیب ہیں۔ موصوف کے ادبی کارنامے اور بالخصوص سفرنامے، صوفی قمر علی شاہ درویش کے دالان کے پتھروں سے زیادہ وزنی، وقیع اور بھاری بھرکم ہیں (متن اور مواد کے اعتبار سے) کیونکہ انہیں دو چار لوگ نہیں بلکہ ہزاروں لوگ اپنے ہاتھوں میں گھنٹوں سنبھالتے ہیں اور ان پر آبِ نظر کے عقیدت مندانہ پھول برساتے ہیں اور قمر علی عباسی کی ''حرف وسخن کی جاگیر'' سے فیضیاب ہوتے ہیں۔

راقم جناب قمر علی عباسی کے نام سے ضرور واقف تھا۔ یہ تو شکاگو میں مقیم خضرِ راہ جناب حسن چشتی کے فیضِ عام کا کمال ہے کہ انھوں نے راقم کو حضرت عباسی کی ادبی کاروائیوں کی ایک جھلک دکھائی۔ دوسرے روز راقم نے حضرتِ عباسی سے ٹیلیفون پر رابطہ قائم کیا اور تعارف کے بعد ان سے تازہ ترین سفرنامے کا مطالبہ کیا۔ عباسی صاحب نے نہایت خلوص، ایثار اور انکسار سے کام لیا اور بڑے تپاک سے گفتگو کی۔ راقم کو غیرت کا قطعی احساس نہیں ہوا۔ عباسی صاحب کی گفتگو، شیریں، رواں اور اپنائیت کی چاشنی سے بھرپور تھی۔ موصوف سے گفتگو کے بعد راقم کی طبیعت شگفتہ اور تازہ دم ہوگئی۔ اور وہ سارا ڈپریشن جاتا رہا جو عموماً امریکا میں مسافروں کو تنہائی کی وجہ سے بھگتنا پڑتا ہے۔

تیسرے دن دوپہر کو عباسی صاحب کا بھیجا ہوا جرمنی کا سفرنامہ بعنوان ''اور دیوار گر گئی'' کے ساتھ ''عالمی اردو تحریک، شمالی امریکا'' کی جانب سے منعقد ہونے والے ''جشنِ قمر علی عباسی'' کا چوبیس صفحوں پر مشتمل پمفلٹ بھی دستیاب ہوا یہ مختصر سا جاذبِ نظر پمفلٹ اپنے اندر ایک دنیا بسائے ہوئے ہے۔ سرِ ورق پر جناب عباسی کے خلاؤں میں جھانکتی ہوئی تصویر ہے جو ان کے منصوبوں کو ظاہر کرتے ہوئے کہہ رہی ہے کہ ''ستاروں کے آگے جہاں اور بھی ہیں'' یعنی دنیا کی مسافرت کے بعد عباسی صاحب ستاروں، سیّاروں اور کہکشاں پر بھی کمند ڈالنے کا عزم کر چکے ہیں۔ خدا انہیں اپنے بلند عزائم میں کامیاب کرے۔

عباسی صاحب نے اس تصویر میں قصداً اپنی گردن نہیں جھکائی، اک ذرا گردن جھکا کر تصویرِ یار دیکھنا تو عشاق کا شیوہ ہے لیکن یہ تصویر تو اُن کی رفیقۂ حیات بیگم نیلوفر عباسی کی ہے جو ان کے کاروانِ ادب اور سفر وحضر کی نگراں، ہمنوا اور صلاح کار ہیں اس کے ثبوت میں عباسی صاحب اپنی ہمسر یعنی بیگم عباسی کے خلوص، محبت اور ادبی تعاون کا تمام سفرناموں کی ابتداء میں برملا اعتراف کر چکے ہیں اور اس قول کے آگے اس کا سرِ تسلیم خم ہے کہ ''مرد کی ہر ترقی کے پسِ پردہ صنفِ نازک کا ہاتھ ہوتا ہے'' یہاں تو معاملہ ہی دگرگوں ہے۔ عباسی صاحب خوش قسمت ہیں کہ انہیں صنفِ نازک کے ہاتھ کے ساتھ، عمر بھر کی رفاقت، رہنمائی، ہم مزاجی اور مسکراہٹوں کے شگوفے میسر آئے ہیں۔ نہ جانے عباسی صاحب کو بیگم عباسی سے دو، چار باتیں کرنے کی مہلت کب ملتی ہوگی کیونکہ بقول بیگم عباسی ''آپ یقین کریں کہ یہ ایک وقت میں دس مختلف نوعیت کے کام اور ذمہ داریاں نمٹا رہے ہوتے ہیں'' معاملے کی نزاکت جان کر یہاں مزید کچھ کہنا مشکل ہے، البتہ بیگم عباسی کے صبر، ضبط اور تحمل کی داد دینی پڑے گی کہ وہ عباسی صاحب کو ٹینشن فری، فرصت کے لمحات عطا کرتی ہیں بلکہ قلم کی آواز میں اپنی آواز بھی ملا دیتی ہیں تاکہ عباسی صاحب کی تخلیقات میں نغمگی اور سُروں کی لہر دوڑ جائے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ عباسی صاحب نے اپنے معمولات کو وقت کے خانوں میں بانٹ رکھا ہے۔ یقیناً زندگی کے اقدار سے بھرپور خانہ بیگم عباسی اور افرادِ خاندان کے حق میں آیا ہوگا۔ اس لئے گھر کا ماحول معتدل اور خوشگوار بنا رہتا ہے۔

عباسی صاحب کی طبعی زندگی کا سفر زرپاش اور مردم خیز سرزمین امروہہ ضلع مراد آباد میں ۱۳ر جون ۱۹۳۸ء سے شروع ہوا۔ موصوف کے والد جناب یعقوب علی صاحب سروے آف انڈیا کے شعبہ میں افسر تھے۔ دس سال کی عمر تک قمر علی کی تعلیم وتربیت امروہہ کے مدرسے اور اسکول میں ہوئی۔ آم اور

امرود کے باغوں میں چہکیں کرنے والے کھلنڈرے قمر علی کو ہندوستان کی تقسیم کے ساتھ ۱۹۴۸ء میں اپنے وطن کو خیر باد کہنا پڑا۔ یعقوب علی صاحب نے پاکستان کو فوقیت دی، اس لیے انہیں پاکستان سروے آفس میں اعلیٰ عہدہ دے دیا گیا۔ اس طرح یعقوب علی صاحب مع اہل وعیال حیدر آباد (سندھ) پاکستان پہنچ گئے۔ قمر علی کی تعلیم وتربیت کا آغاز حیدر آباد (سندھ) کے اسکول سے شروع ہوا۔ ۱۹۵۶ء میں قمر علی نے میٹرک پاس کیا حیدر آباد (سندھ) سے بی۔اے آنرز کی ڈگری لی اور ۱۹۶۱ء میں معاشیات میں ایم۔اے کی سند لی۔ ایم۔اے پاس ہوتے ہی قمر علی کو اسپیشل انویسٹی گیٹر صدر، سیکرٹریٹ (کراچی) میں اسامی مل گئی۔ کچھ عرصہ بعد وہ نیشنل کالج کراچی میں بحیثیت لیکچرار منتخب ہوئے۔ ابھی وہ درس وتدریس کے ماحول سے پوری طرح آشنا بھی نہ ہونے پائے تھے کہ ان کا ریڈیو پاکستان لاہور میں بحیثیت لسنرز ریسرچ آفیسر کی اسامی پر تقرر ہو گیا۔ جناب قمر علی کی صداوصوت کا ماحول بخوبی راس آیا اور وہ اس شعبہ میں ترقی کی راہوں سے گذرتے ہوئے لاہور سے راولپنڈی، یہاں سے کوئٹہ (بلوچستان) وہاں سے حیدر آباد (سندھ) اور پھر اپنے آخری پڑاؤ یعنی کراچی پہنچے اور کنٹرولر ڈائریکٹر ریڈیو پاکستان کے عہدے سے وظیفہ یاب ہوئے۔ قمر علی صاحب ۳۲ سال تک ریڈیو پاکستان سے منسلک رہے۔ وظیفہ یابی کے بعد قمر علی صاحب روزنامہ جنگ کراچی اور ہفت روزہ ''عوام'' نیویارک (امریکا) سے بھی وابستہ رہے۔

۱۹۶۰ء میں بی۔اے آنرز کرتے ہوئے قمر علی صاحب کو ایسے اساتذہ کی سرپرستی حاصل ہوئی جو اپنے عہد کے یکتائے روزگار علما میں شمار ہوتے تھے۔ ان میں پروفیسر غلام مصطفےٰ خان صاحب کا نام سرِ فہرست تھا۔ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ ۱۹۴۹ء میں ناگپور (حالیہ ودربھ، انڈیا) سے پاکستان منتقل ہوئے تھے۔ اور انہیں حیدر آباد (سندھ) کے کالج میں پروفیسر کی آسامی مل گئی تھی۔ قمر علی صاحب ڈاکٹر خان کی علمی تبحّر اور تحقیقی شعور سے بے حد متاثر تھے۔ ڈاکٹر خان نے قمر علی صاحب کو پڑھنے لکھنے کی ترغیب دی۔ ڈاکٹر خان کے ایما پر قمر علی صاحب نے ۱۹۶۶ء میں اردو سے ایم۔اے کیا اور اس ڈگری کے لیے ''شاہد احمد دہلوی'' پر مقالہ تحریر کیا۔ قمر علی صاحب کا تحریری سفر ۱۹۵۲ء سے شروع ہو گیا تھا، موصوف نے ۱۴ برس کی عمر میں جنگ (کراچی) اخبار میں بچوں کے لیے کہانی لکھی تھی۔ اردو میں ایم۔اے کرنے کے بعد قمر علی صاحب کے تیز گام قلم میں جنبش پیدا ہوئی یہ مختلف منزلوں سے گذرتا رہا اور اپنے ہمعصروں کو مات دیتا ہوا کوسوں آگے نکل گیا۔ قمر علی صاحب نے ابتدا میں بچوں کے لیے دلچسپ کہانیاں لکھیں مشقِ تحریر کی خاطر بچوں کا دل بہلاتے رہے۔ ۱۹۷۳ء میں بچوں کے کہانیوں کے مجموعے ''کائیں کائیں، میاؤں میاؤں'' نے پہلے انعام کا اعزاز حاصل کیا۔ پاکستان رائٹرز گلڈ کا یہ انعام موصوف متواتر چار سال تک حاصل کرتے رہے۔ قمر علی صاحب نے بچوں کے لیے یکے بعد دیگرے متعدد کتابیں لکھیں جو بہت مقبول ہوئیں۔ بچوں کے لیے لکھا ہوا سفر نامہ ''سنگاپور کی سیر'' آکسفورڈ یونیورسیٹی پریس نے شائع کر کے دنیا بھر میں تقسیم کیا۔ اس مقام پر اُن کا قلم بالغوں کے ذہنوں کو آسودگی پہنچانے کے لیے منجھ چکا تھا۔ قمر علی صاحب نے ۱۹۷۹ء میں ''بہادر علی''، ''شرارتی خرگوش'' اور ''سمندر کا بیٹا'' کے نام سے ناول تحریر کیے۔ ناول ''بہادر علی'' یونیسف (UNICF) نے دنیا بھر کی زبانوں میں شائع کیا۔

قمر علی عباسی کے ناولوں، ریڈیائی پروگراموں اور ٹی وی سیریلوں نے انہیں بین الاقوامی شہرت عطا کی۔ موصوف کے ڈرامے جاپان سے مقامی زبان میں نشر ہوئے۔ موصوف کا پہلا سفر نامہ ''لندن لندن'' کو بی بی سی لندن نے سلسلہ وار ''لندن کی سیر'' کے عنوان سے ٹیلی ویژن پر دکھایا۔ اس کتاب کے آج تک چھ ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

۱۹۸۲ء سے قمر علی صاحب نے متواتر سفر نامے لکھے اور آج بھی گوناگوں مصروفیات کے باوجود اس کام کو انہماک سے انجام دے رہے ہیں۔ ۱۹۹۹ء میں قمر علی صاحب نے مستقل طور پر امریکا کے مشہور شہر نیویارک کو اپنا مسکن بنالیا۔ امریکا پہنچ کر قمر علی صاحب کے قلم کی جولانیاں بے لگام ہو گئیں۔ سفر ناموں کی مشقت جاری ہے اور متعدد اخبارات میں ہفتہ وار کالم پہ کالم بلاناغہ لکھ رہے ہیں۔

قمر علی عباسی صاحب کی طبع شدہ تصانیف کی تعداد پچاس کے قریب ہے۔ ان میں سولہ (۱۶) کتابیں بچوں کی کہانیوں کی ہیں۔ اٹھائیس سفر نامے ہیں اور چار ناول ہیں۔ علاوہ ازیں موصوف متعدد ٹی وی سیریل لکھ چکے ہیں۔ ان کی ریڈیائی فیچر اور ناول سیریل کی تعداد چار ہے جو ۵۲ اقساط پر مشتمل ہے۔ قمر علی صاحب ایک کامیاب کالم نگار ہیں۔ وہ فی الحال کئی اخباروں میں ہفتہ وار کالم لکھنے میں مستغرق ہیں۔ ان کی چار کہانیوں کے کیسٹ (بچوں کے لیے) منظر عام پر آ چکے ہیں۔

گذشتہ سطور میں عباسی صاحب کے علمی، ادبی اور تخلیقی سفر کو چند سطور میں سمیٹ دیا گیا ہے حالانکہ اس سفر میں موصوف اپنی زندگی کی نصف صدی قرباں کر چکے ہیں لیکن اب ان کی زندگی کا تنومند برگد مسافروں کو گھنی چھاؤں دیتے دیتے جھک سا گیا ہے اس کے باوجود بھی وہ بیک جنبشِ قلم اخباروں کے ہفتہ وار کالم لکھ رہے ہیں۔ علمی وادبی مضامین لکھے جا رہے ہیں۔ یہ سب کچھ کرنے کے لیے ایک حوصلہ مند جذبہ اور والہانہ جنون کی ضرورت ہوتی ہے یہی حوصلہ اور جنون مرزا اسد اللہ غالبؔ کی سرشت میں تھا۔ اسی لیے انھوں نے کہا تھا:

کاش کے پرے ہوتا عرش سے مکاں اپنا
منظر اک بلندی پر اور ہم بنا لیتے

قمر علی عباسی بھی اسی نصب العین کے حامی نظر آتے ہیں۔

اردو ادب کے سفر ناموں کی تاریخ زیادہ پرانی نہیں ہے۔ ان میں مذہبی اور تاریخی سفر ناموں کی بہتات ہے۔ قمر علی عباسی نے اس صنفِ ادب میں شہروں اور ملکوں کی نثری عکاسی کی ہے اور جدید سفر نامہ نگاروں میں ایک منفرد مقام پیدا کیا ہے۔ زبان وبیاں اور اسلوبِ نگارش کے اچھوتے انداز کی بنا پر موصوف کے

سفرنامے ایک جیتی جاگتی، محرک زندگی کا آئینہ ہوتے ہیں۔ان کی سُبک، صاف، شستہ نثر قاری کے لیے ''موجِ نغمہ خواں'' سے کم نہیں ہوتی۔نہایت مختصر مگر چست جملے قاری کے دل میں چٹکیاں بھرتے ہیں۔لہٰذا قاری اس ''موجِ خوشرنگ'' میں گنگناتے، مسکراتے، کھلکھلاتے کبھی سبزہ زاروں سے گزرتا ہے، کبھی صحراؤں کی تپش سے سر چھپاتا ہے، کبھی پتھریلی زمینوں کو ناپتا چلا جاتا ہے، کبھی جوئے نغمہ خواں کا لطف اٹھاتا ہے، کبھی عالیشان فلک بوس عمارتوں کو تاکتے گذر جاتا ہے کبھی کھپریل سے ڈھکے خوشنما مکانوں اور مکینوں سے دو باتیں کر لیتا ہے، کبھی ہوٹلوں اور ریستورانوں میں کافی کی چسکیاں لیتا ہے اور لذت دار کھانوں سے محظوظ ہوتا ہے۔ فطرت کے نظاروں کے ساتھ صنفِ نازک کی اٹکھیلیوں، ناز برداریوں اور اُن کی نگاہِ غلط انداز سے مسرور ہوتے ہوئے سفرنامے کے اختتام تک پہنچتا ہے تو وہ بے ساختہ کہہ اٹھتا ہے ''خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سُنا افسانہ تھا''۔

قمر علی عباسی صاحب کا سفرنامہ دراصل خواب نہیں بلکہ حقیقت ہوتا ہے۔موصوف اپنے ساتھ دیگر مسافروں کے ساتھ قارئین کا ہجوم بھی ہمرکاب رکھتے ہیں۔اُن کا پیرایۂ بیاں قاری کو اپنا ہمسفر بنا لیتا ہے۔گویا تن بدن تو قمر علی صاحب کا ہوتا ہے لیکن آنکھیں قاری کی ہوتی ہیں۔جیسے قاری اُن کا ہمزاد بن گیا ہو۔قمر علی صاحب کی رواں دواں تحریر اور لچیلے بااثر جملے ان کی طرزِ تحریر کا معجزہ ہیں۔جس کی وجہ سے قاری مسحور ہو جاتا ہے۔قمر صاحب راز کی باتیں کچھ اس انداز سے بیان کرتے ہیں کہ افشائے راز نہیں ہوتا لیکن قاری سب کچھ سمجھ لیتا ہے۔قمر صاحب یہ حجاب اس لئے رکھتے ہیں کہ ان کی نصف تہر بدگمان نہ ہو جائے۔لہٰذا وہ رند کے رند رہتے ہیں اور جنّت کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔حسن و عشق کے اس مجموعی تاثر نے ان کے سفرناموں میں آفاقیت پیدا کر دی ہے یہی وجہ ہے کہ قاری سفرناموں کے سحر انگیز ماحول میں گم ہو جاتا ہے۔

قمر علی عباسی نے کم و بیش تیس ملکوں اور لاتعداد شہروں کی خاک چھانی ہے۔ بھانت بھانت کے لوگوں سے مل چکے ہیں، قسم قسم کے کھانے چکھے ہیں، مختلف بولیاں سُنی ہیں، حسن و جمال کی رعنائیاں دیکھی ہیں، گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے۔ ہر جگہ نیا ''طور'' اور نئی تجلی دیکھی ہے۔''لن ترانی'' بھی کی لیکن جلوے سے محروم رہے۔اس کے باوجود موصوف کے مزاج اور آہنگ میں ہر مرتبہ تجربات کی شیرینی زیادہ اور تلخی کم ہوتی نظر آتی ہے۔ان کا ہر نیا سفرنامہ ایک نئی تان اور سرگم لئے ہوتا ہے ان سے الفاظ و معنی کی راگنیاں تھرکنے لگتی ہیں۔لگتا ہے قمر علی صاحب پر انوارِ الٰہی کے ساتھ سفرنامے نازل ہو رہے ہوں۔خدا کی دین کے احوال سے صرف حضرت موسیٰ واقف ہیں۔ہوسکتا ہے یہ سعادت درویش قمر علی شاہ قلندر کے بابرکت نام سے مناسبت کا اثر ہو۔کیونکہ ایک انتہائی مصروف انسان کے لیے ایسے کارنامے ممکن نہیں۔اس سلسلے میں ایک واقعہ بھی سنتے چلئے۔

''قمر علی صاحب کے نئے سفرنامے کی اشاعت کے بعد ایک صاحب میرے پاس آئے اور یہ مژدہ سنایا کہ ''لیجیے صاحب، قمر علی عباسی کا ایک اور سفرنامہ'' دوسرے دن وہ صاحب حیرتِ زدہ، انگشت بدنداں میرے پاس آئے۔میرے استفسار پر گویا ہوئے اور پوچھا۔''جناب ایک شخص بیک جنبشِ قلم علیحدہ علیحدہ عنوانات پر کیسے قلم اٹھا سکتا ہے؟'' میں نے اُن کا استعجاب بڑھانے کی غرض سے کہہ دیا ''جنابِ والا قمر علی صاحب عامل ہیں۔ظاہر ہے کہ اُن کے قبضہ میں اَجنّہ ہیں اور یہ کاروبار اُن ہی کی مدد سے ہوتا ہے'' وہ صاحب حیرت اور استعجاب کی مورت بن کر چلے گئے۔دوسرے ہفتے وہی صاحب رازدارانہ انداز میں بغل میں بوتل کی طرح کچھ چھپاتے ہوئے لائے اور قمر علی صاحب کا ایک اور تازہ ترین سفرنامہ میرے قیاس کی تصدیق میں پیش کر دیا۔۔میں لاجواب رہا۔

دراصل ایسا ہرگز نہیں ہے۔مندرجہ بالا قصّہ قمر علی صاحب کی سرعت نگاری کے صحت مند پہلو کی غمازی کرتا ہے۔موصوف لڑکپن اور جوانی کے درمیان وقفے سے لکھتے آ رہے ہیں۔قلم و قرطاس اُن کے قبضہ میں ہیں ''اجنّہ'' نہیں۔ موصوف کا قلم اُن کے ذہن کی رفتار کا ہمرکاب رہتا ہے اور اُن کے خیالات اُن کی مصوّرانہ یادداشت (Photographic Memoary) سے ہم آہنگ ہوتے ہیں۔ان دونوں خصوصیات کے انجذاب اور سالہا سال کی محنت و ریاضت کے بعد قمر علی عباسی کے اشہبِ قلم میں برقی توانائی پیدا ہوگئی ہے اور ان کا یہ وجدان کمال کی حد کو پہنچ گیا ہے۔یہی قمر علی صاحب کی زودنویسی کا راز ہے۔

قمر علی صاحب کے سفرنامے کئی خصوصیات کے حامل ہے۔ان میں تہذیب، تمدن، تاریخ، جغرافیہ اور موجودہ سیاست کے آثار نمایاں رہتے ہیں۔ موصوف بیانیہ انداز میں قاری کا دل بہلاتے جاتے ہیں، اسی دوران قاری کے ذہن پر اپنے قلم کے نشتر بھی چبھوتے جاتے ہیں تاکہ قاری حالاتِ حاضرہ سے باخبر رہے۔سفر کے دوران موصوف غیر ملکوں کی سیاسی اور سماجی کمزوریوں اور خوبیوں پر خامہ فرسائی کرتے رہتے ہیں۔بالخصوص معاشی بحران اور آسودہ حال زندگی کے منظرنامے بھی قارئین کو عبرت دلانے کے لیے پیش کرتے ہیں۔وہ پس ماندہ ملکوں کی غربت اور افلاس کی طرف بھی اپنے قلم کا رخ موڑتے ہیں اور بیان کرتے ہیں کہ ''عسرت و افلاس نے ان ملکوں کی کم سِن دوشیزاؤں کو پیشہ ورانہ زندگی گذارنے پر مجبور کر دیا ہے۔مغربی ممالک میں عریانیت اور نشہ خوری کی لَت نے نوجوانوں کے مستقبل کو تاریک بنا دیا ہے۔غرض کے قمر علی صاحب کے سفرنامے، اخلاقی، اصلاحی، فلاحی ادارے کا رول ادا کرتے ہیں۔موصوف کے سفرناموں کو یونیورسٹیوں کے نصاب میں داخل کر کے ایک مبارک اور سعید قدم اٹھایا گیا ہے۔یہ نوجوانوں کے لیے نہایت کارآمد ثابت ہونگے۔ان میں پیش کیے گئے عمرانیات، تاریخ و جغرافیہ کے چلتے پھرتے مرقعے نوجوانوں کی رہبری کر سکیں گے اور موصوف کے ادبی شگوفوں سے اردو ادب کا باغ لہلہاتا رہے گا۔قمر علی عباسی صاحب صلہ و ستائش سے ماورئ ہیں۔لیکن ادبی دنیا نے اُن کی بے لوث ادبی خدمات کا بھرپور صلہ دیا ہے۔موصوف کو اب تک ۴۵ کے قریب انعامات اور اعزازات مل چکے ہیں۔جو راقم کی نظر میں ایک ریکارڈ ہیں۔

بھاوج کا تحفہ

(اے پی این ایس کا ایوارڈ یافتہ کالم)

قمر علی عباسی

ڈیڑھ سال بعد حیدر آباد بس سے جانا ہوا تو خیال آیا سترہ سال ہوئے جب بس سے سفر کیا تھا۔ اس عرصے میں عام ویگن، ایئر کنڈیشنڈ کوچ، بولٹن مارکیٹ سے ٹول پلازہ تک ''ایک سواری! ایک سواری!'' پکارتے رہے اور ہم وہ سواری نہیں بنے لیکن آج ان کے مقدر میں ہماری میزبانی تھی۔ ڈھائی گھنٹے بعد جیل نظر آئی۔ حیدر آباد، ملک کا وہ منفرد شہر ہے جس میں سڑک کے راستے داخل ہوں تو جیل کا دروازہ استقبال کرتا ہے حالانکہ ہم یہاں ہمیشہ اچھی نیت سے داخل ہوئے ہیں۔ ہمارے وہاں قدم رنجہ فرمانے کا دن چھٹی کا تھا۔ مقامی انتظامیہ کو اطلاع نہ ہو سکی اس لئے ٹوٹی سڑکوں، زمین میں دھنسے مکانوں، تانگوں، رکشوں سے اڑتی دھول نے استقبال کیا۔ جیل کے سامنے ہمارے لڑکپن میں ہیرا آباد ہوا کرتا تھا۔ اب وہاں ''آباد'' باقی رہ گیا ''ہیرے'' کے بارے میں متضاد افواہیں سنی ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ غریبوں نے بیچ کھایا۔ کچھ کا خیال ہے امیروں نے حالات سے مجبور ہو کر چاٹ لیا۔ ہم صرف اس بات کے گواہ ہیں کہ وہاں ہیرا نام کی کوئی چیز باقی نہیں۔

حیدر آباد کے سارے لوگ معمار ہیں کچھ نہ کچھ بناتے رہتے ہیں۔ سڑکوں کو گلیاں، گلیوں کو تنگ گلیاں اور چوراہوں کو کھودنے کے ماہر ہیں اور قدرت کا کرشمہ یہ ہے کہ انہیں خاطر خواہ کامیابیاں حاصل ہو رہی ہیں۔ بڑے سے بڑے آدمی کو گھر سے نکلتے ہی شانے سے شانہ ملا کر چلنا پڑتا ہے۔ اس طرح بازاروں میں، گلی کوچوں میں مساوات، اخوت، برابری، کا مظاہرہ ہر لحہ نظر آتا ہے۔ شہر میں کوئی پارک نہیں ہے اسی لئے گھاس پات نظر نہیں آتے اور بلدیہ کا بڑا سرمایہ بچ رہا ہے۔

بس نے ہمیں گاڑی کھاتے میں اتار دیا۔ بھائی خان کی چاڑی سے قلعے کی طرف روانہ ہوئے۔ چڑھائی کے دونوں طرف پہاڑوں سے آبشار بہہ رہے تھے۔ یہ پاکستان کے قیام سے پہلے کے ہیں۔ سوات اور وادی کاغان کے آبشار دیکھنے لوگ دور دور سے جاتے ہیں لیکن ہمارے شہر کے آبشاروں کی کوئی قدر نہیں کہ یہ باتھ روم اور کچن سے نکلتے ہیں۔

یوں محسوس ہوتا ہے، حیدر آباد میں ہر چیز توڑ کر بنائی جا رہی ہے۔ جو ٹوٹ جاتا ہے، وہ بنتا نہیں۔ جو بننا شروع ہو جاتا ہے، وہ مکمل نہیں ہوتا۔ ایک زمانے میں حیدر آباد کے میئر اور ڈپٹی کمشنر ہمارے دوست تھے۔ ان سے یہی شکایت تھی، شہر کیوں جھڑ رہا ہے، ٹوٹ رہا ہے، گر رہا ہے؟ ان کا خیال تھا، اس شہر میں کوئی آسیب ہے جو رات کو لوگوں کے سوتے ہی جاگ اٹھتا ہے اور ہر چیز کو اسی جگہ واپس کر دیتا ہے جہاں سے وہ شروع ہوئی تھی۔ اس بار ہم نے اس بلا کو ڈھونڈ نکالا ہے۔ شہر کی گلیاں، کوچے، چاڑیاں، پاڑے، پڑ، سب دیکھے۔ یہاں پہلے سیکڑوں اسپیڈ بریکر تھے، اب ہزاروں ہو گئے ہیں۔ یہ بریکر وہاں بھی ہیں جہاں سائیکل چلتی ہے، لوگ پیدل چلتے ہیں، نہیں چلتے، لوگوں نے گاڑیوں کی اسپیڈ کو بریک لگانا چاہا تھا لیکن یہ ان کی زندگی کے ہر قدم، ترقی کے ہر زینے، سکون کے ہر گوشے کو بریک لگ گیا۔ حیدر آباد والو! اپنے راستوں سے بریکر ہٹاؤ، خوشحالی کو آنے دو، نئی صبح روشن دوپہر، سانولی شام اور جگمگاتی رات تمہاری منتظر ہے۔

ہمارا گھر قلعے میں ہے۔ اس کے دروازے کے آگے چوراہا ہے۔ یہاں سے شاہی بازار شروع ہوتا ہے۔ یہ زندگی حرارت، حرکت اور خوشیوں کا چوراہا تھا۔ محرم میں حسینؓ امول، خوبصورت رکھے جاتے، شب برات میں آتش بازی کا کھیل ہوتا۔ کبھی آنکھ مچولی یا کھلنڈرے ونج وٹی راند کھیلتے۔ چوراہے کے سامنے ربڑی کی دسیوں دکانیں ہیں۔ حیدر آباد آنے والے یہ سوغات اپنے یاروں پیاروں کے لیے لے جاتے ہیں۔ ایک دن چوراہے پر ہنستی مسکراتی، قہقہے لگاتی ایک بارات رکی۔ مرد سوغات خریدنے اترے پھر کہیں سے موت نمودار ہوئی اور چوراہا خون سے سرخ ہو گیا۔ ہم پہنچے تو ان شہیدوں کی سرخ یادگار ملی۔

ہم قلعے کی پہلی گلی کے آخری مکان میں رہتے تھے۔ اب اس میں ہمارے دو بھائی، بھاوجیں اور منجھلے ماموں رہتے ہیں۔ گھر کے پاس ایک چھوٹا سا چوراہا ہے۔ اس پر ایک مینار بنا دیکھا۔ تازہ گلاب کے ہار پڑے تھے۔ یہ بھی شہیدوں کی یادگار ہے۔ ہم نے گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ کوئی اور چوراہا تو نہیں لیکن شکر، ہمارے گھر کے راستے میں یہ آخری چوراہا تھا۔ اس یادگار پر اڑسٹھ نام لکھے ہیں۔ آٹھ نامعلوم ہیں۔ ہم نے لاہور میں واہگہ سیکٹر جاتے ہوئے جلو موڑ باٹا پور، بی آر بی کے کنارے کئی جگہ شہیدوں کے مینار دیکھتے تھے۔ سر اونچا کر کے نام پڑھے تھے۔ دل میں ایک ٹھنڈک سی پڑی تھی۔ اس وقت سوچا تھا ان مادر وطن کے بیٹوں میں کاش! ہم بھی شامل ہوتے۔ مینار کے ساتھ کھڑے ہو کر تصویر کھنچوائی تھی اپنے البم میں لگانے کے لیے۔ یہ مینار بھی شہیدوں کے نام پر بنایا گیا تھا لیکن نجانے کیوں یہ نام پڑھنے کے بعد سر اٹھایا، نہ تصویر کھنچوائی۔ بس آگے بڑھ گئے۔ گھر کا دروازہ کھول کر زندگی کا احساس کرنے کے لیے۔ وہاں ہمارا چھوٹا بھائی اور بھاوج تھی۔ ہمارے اس بھائی کو پرندے پالنے، پودے لگانے، گھر سجانے کا شوق تھا۔ ڈیڑھ سال پہلے اس کی شادی پر پہنچے تھے تو اس نے پنجرے کے اندر خوبصورت ہانڈیوں میں افریقی طوطے، خوبصورت ایکوریم میں سرخ، سبز، سنہری مچھلیاں، بڑے بڑے پتوں والے منی پلانٹ، کالے گلاب کی کلیاں

اور موتیا کے کھلکھلاتے پھول دکھائے تھے۔ ہماری پسندیدہ مچھلی پکوائی تھی۔ شاہی بازار سے ربڑی کی سوغات منگوائی تھی۔ ڈیڑھ سال بعد گھر میں داخل ہوئے تو کچھ بھی نہ بدلا تھا۔ وہی استقبال، وہی کلیاں، پھول، پرندے لیکن کسی نے ہماری توجہ اس طرف نہ دلائی۔ کھانے کے بعد ہمارا بھائی چھت پر لے گیا۔ برسہا برس کے بعد چھت پر گئے تھے۔ لڑکپن سے جوانی تک سارے سن وسال روشن ہو گئے۔ دائیں کونے میں پتنگ اڑاتے۔ بائیں طرف ڈانٹ اور پٹائی کے خوف سے آ چھپتے تھے۔ پڑھائی کے بہانے اے حمید کے ناول، شفیق الرحمٰن کی تحریروں کے قہقہے لگاتے پھر ایسا لگا چاروں طرف دکھ کے سیاہ بادل ہوں۔ اب نہ ڈانٹنے والے رہے، نہ قہقہہ سن کر چونکنے والے، آنگن خالی ہو گیا۔ اچانک ہم خوش ہو گئے۔ چھت کی دیواریں، چار دیواری کھدی ہوئی تھیں۔ شاید ہمارا بھائی ٹائل لگوا رہا ہے لیکن چھت پر کیوں۔۔۔؟ تب اس نے اکھڑے ہوئے سیمنٹ کی طرف اشارہ کیا۔ ''گولی یہاں لگی اور یہاں تک گھسٹ کر گئی۔ اس سوراخ سے گولی اندر گھس گئی اور ادھر سے نکلی۔ باتھ روم کے دروازے پر یہ نشان گولی کا ہے۔ چھت کی چار دیواری کا سارا پلاسٹر گولیوں سے ادھڑا ہے۔ یہ گولیاں پانی کی ٹنکی سے چلائی گئی تھیں۔ ہماری چھت کے سامنے پانی کی ٹنکی ہے جس پر ایک بڑی سے روشنی چاروں طرف گھومتی تھی۔ لوگ کہتے تھے، یہ جہازوں کو کراچی کا راستہ بتاتی تھی۔ اسی جگہ سے افطار اور سحر کا سائرن بجتا تھا۔ ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء کی جنگ کی سیاہ راتوں میں یہی دشمن کے حملے سے آگاہ کرتی تھی۔ یہ ٹنکی آبِ حیات پلاتی ہے۔ زندگی کو راستہ دکھاتی ہے۔ ہم نے گردن اٹھا کر دیکھا، وہاں کچھ نہ تھا۔

ہماری روانگی کا وقت ہوا۔ الوداع کہتے ہوئے ہماری بھاوج نے اپنے زیورات کے ڈبے سے ایک لمبا سا کارتوس نکال کر ہمارے حوالے کر دیا۔ بھائی نے بتایا۔ ''خالی کارتوس تو بہت سے تھے۔ سب بانٹ دیئے، ایک رہ گیا ہے۔ یہ آپ کے لیے ہے۔ اسے کراچی لے جائیں''۔

بھاوج کا تحفہ لے کر ہم باہر نکلے۔ قلعے کا بڑا دروازہ آ گیا۔ ہمارے دوست سلطان جمیل نسیم نے ربڑی کی فرمائش کی تھی۔ سامنے دکانیں تھیں۔ درمیان میں شہیدوں کی یادگار جو ربڑی لینے گئے تھے۔ تب وقت رک گیا اور ہمیں محسوس ہوا کہ ان دکانوں تک ہم کبھی سفر نہیں کر سکتے اس لئے کہ موت کا منظر نہیں دیکھ سکتے۔

ہمارے بھائی نے گاڑی کا رخ قلعے کے بڑے دروازے کی طرف کر دیا۔ اس طرف ہم پہلی بار جا رہے تھے۔ الٹے ہاتھ پر جمنازیم کی عمارت اور سیدھے ہاتھ پر گھاس کا میدان اس پر مٹی کے ڈھیر تھے۔ ہمارے بھائی نے گاڑی روک دی۔ ''ارے! یہ کیا؟'' لوہے کا گیٹ کھول کر اندر گئے۔ گھاس کے درمیان قبریں بنی ہیں۔ یہاں ۱۹۹۰ء کے شہید سو رہے ہیں۔ کبھی یہ نوعمر، کمسن بچے، ادھیڑ عمر کے مرد، بوڑھے اور خواتین تھیں، اب مٹی ہو گئے۔ کتبوں پر تحریریں ہیں۔ کوئی پانی لینے گھر سے نکلا تھا، کوئی دفتر سے لوٹ رہا تھا، گھر کے لیے خوشیاں لینے جا رہا تھا، اپنی چھت کے نیچے تھا۔ ان کی عمر اور شہادت کی تفصیل کے نیچے قاتلوں کے نام بھی درج ہیں۔ ہم نے دنیا میں بہت سے شہیدوں اور مقتولوں کی قبریں دیکھی ہیں۔ ابراہم لنکن، جون ایف کینڈی، لیاقت علی خانؒ لیکن ان پر قاتلوں کے نام نہیں لکھے۔ یہ پولیس کی ایف آئی آر میں درج ہوئے ہیں۔ یہ کتبوں پر کیسے آ گئے۔۔۔؟

○

خالد عزیز۔ اس سارے قضیے کی اصل بنیاد ہیں۔ برٹش ایئرویز عرصہ ہوا کراچی سے اپنی پروازیں بند کر چکی۔ لیکن برٹش ایئرویز کے کراچی میں سیلز کے انچارج خالد عزیز ہر سال کسی نہ کسی طرح یہ اہتمام کر لیتے ہیں کہ کراچی سے چار پانچ سیاحت نگاروں، صحافیوں کو برطانیہ لے جاتے ہیں۔ ٹکٹ برٹش ایرلائنز کا اور میزبانی برٹش ٹورسٹ اتھارٹی کی اور وہ برطانیہ ان صحافیوں کو دکھاتے ہیں جو خود برطانیہ اہل برطانیہ نے بھی نہیں دیکھا۔ میں برطانیہ کی ندیوں، وادیوں، شاہراہوں اور پھولوں کی تعریف میں زیادہ دور تک نہیں جاؤں گا۔ اس کے لیے آپ میرا سفر نامہ پڑھیں (برطانیہ میں خزاں) جو گزشتہ برس شائع ہوا یا پھر (برطانیہ چلیں) پڑھیں۔

(آؤ برطانیہ چلیں سے منتخبہ)

☆

''ایک بار ٹرین میں چند احباب سفر کر رہے تھے، بات شاعری کی نکلی تو ذکر ہونے لگا اُن شاعروں کا جو انتہائی مشکل شعر کہتے ہیں۔ مثال دی گئی عبدالعزیز خالد کی دوسرے صاحب اس بات سے متفق نہیں تھے۔ پہلے نے کہا اگر آپ عبدالعزیز خالد کے پانچ شعر سنا دیں تو میں پانچ سو روپے پیش کروں گا۔ اس ڈبے میں ایک صاحب الگ تھلگ بیٹھے تھے بولے ''میں سنا سکتا ہوں'' سب نے حیران ہو کر دیکھا جن صاحب نے شرط لگائی تھی انہیں امید تھی یہ ممکن نہیں۔۔۔ ''ضرور سنایئے'' اعتماد سے کہا۔ ان صاحب نے عبدالعزیز خالد کے پانچ شعر سنا دیئے، شرط لگانے والا بے حد متاثر ہوا، عزت کا سوال تھا پانچ سو روپے نکال کر دیئے اور حیرانی سے پوچھا ''آپ کا نام کیا ہے'' میں عبدالعزیز خالد ہوں۔

(کینیڈا انتظار میں ہے سے منتخبہ)

تین دوست

(بچوں کی کہانی)

قمر علی عباسی

تین دوست تھے۔ کُتّا، کوّا اور گدھا۔

تینوں دوست شہر کے بہر جنگل میں رہتے تھے۔ ان میں بڑی دوستی تھی۔ کُتّا شہر چلا جاتا۔ کہیں سے گوشت کا ٹکڑا مل جائے تو کھا لیتا۔ گدھا اِدھر اُدھر گھاس پتّے چبالیتا اور کوّا روٹی کا ٹکڑا یا کوئی اور چیز چونچ میں دبا کر پیٹ بھر لیتا۔ تینوں شام کو جمع ہوتے۔ دن بھر کی رام کہانی سناتے۔ خوش رہتے۔

صبح ہی صبح یہ تینوں اٹھ جاتے۔ کُتّا اور گدھا دوڑ لگاتے۔ کوّا ہوا میں اڑتا، قلابازیاں لگاتا پھر کُتّا اور کوّا گدھے پر سوار ہو جاتے اور گدھا اس طرح دوڑتا کہ یہ زمین پر گر جائیں۔ کُتّا اور کوّا اس طرح گدھے کی کمر پر سوار رہتے کہ گر نہ سکیں۔ اس طرح خوب ہنسی مذاق ہوتا اور یوں ورزش بھی ہو جاتی۔

پھر یہ تینوں ایک جھیل کے کنارے پانی پیتے کوّا کہیں سے کوئی پھول توڑ لاتا اور ایک گدھے کے کان میں لگا دیتا اور ایک کتّے کے کان پر اُڑس دیتا۔ پھر یہ اتنے خوش رہتے کہ ان کا ایک دوسرے سے جُدا ہونے کو جی ہی نہ چاہتا تھا مگر خوراک کی تلاش کی وجہ سے مجبوراً الگ الگ ہونا پڑتا۔ کیونکہ جنگل میں گھاس تو مل سکتی تھی مگر گوشت اور روٹی تو نہ مل سکتی تھی۔

کوّے کا خیال تھا کہ یہ تینوں مل کر کوئی ایسا کام کریں کہ ساتھ ساتھ بھی رہیں اور کھانے پینے کا مسئلہ بھی ختم ہو جائے۔ بہت سوچ بچار کے بعد طے ہوا کہ ایک دکان کھولی جائے۔ یہ تجویز کوّے کی تھی کیونکہ اس نے شہر میں بہت بڑے بڑے جنرل اسٹور دیکھے تھے اور اس کا خیال تھا کہ جنگل میں جنرل اسٹور خوب چل سکتا ہے۔ اس سے آمدنی بھی ہوگی اور جنگل میں شہرت بھی ہو جائے گی۔ سارے چھوٹے بڑے جانوروں سے بھی دوستی ہو جائے گی اس سے بہت فائدہ ہوگا۔ اگر ریچھ سے دوستی ہوگئی تو شہد پینے کو مل سکتا ہے۔ لومڑی کی وجہ سے سرخ سرخ ٹماٹر حاصل کیے جا سکتے ہیں اور گلہری کی وجہ سے ہری ہری میٹھی ککڑیاں مل سکتی ہیں۔ دکان کھولنے کی تجویز تو تینوں نے منظور کر لی مگر اب سوال یہ تھا کہ کس چیز کی دکان کھولی جائے۔ گدھا کہتا تھا کہ گھاس کی دکان خوب ہوگی اور اس کے لیے ہمیں دور جانا بھی نہیں پڑے گا کُتّا اس بات پر مُصر تھا کہ گوشت کی دکان سجائی جائے تو وہ فوراً بک جائے گا اور سب سے اچھی چیز بھی ہے۔ کوّا اس بات پر اڑا ہوا تھا کہ دکان میں پنیر رکھا جائے۔ خوشبودار نمکین پنیر۔ جس کی مہک دُور دُور سے جانوروں کو کھینچ کر لائے گی۔ اس بات پر کئی دن تک بحث ہوئی آخر طے یہ پایا کہ دکان میں تینوں دوستوں کی پسند کی چیزیں رکھی جائیں گی۔

ایک طرف گوشت دوسری طرف گھاس اور تیسری طرف پنیر۔ ان تینوں چیزوں کے رکھنے سے یہ فائدہ ہوگا کہ کوئی گاہک بھی خالی ہاتھ واپس نہیں جائے گا۔ تینوں اس تجویز پر بہت خوش تھے اور خوب منصوبے بنا رہے تھے۔ کوّا ان سب میں زیادہ چالاک تھا۔ اس نے بتایا کہ کسی بھی تجارت سے پہلے اس کی شہرت ضروری ہے۔ انسان جب تجارت کرتے ہیں تو جگہ جگہ اشتہار لگاتے ہیں۔ دکان کا ہر جگہ ذکر کرتے ہیں تب جا کر گاہک آتے ہیں۔ پھر کیا کریں۔ گدھا فکر مند ہو گیا۔ آپ کو کچھ نہیں کرنا کرے گا تو یہ خادم۔ کوّے نے گردن جھکا کر کہا۔ ''تم کیا کرو گے'' کُتّے نے پوچھا۔

میں ہر جگہ دکان کھُلنے کا اعلان کر دوں گا۔ ہر منڈیر، ہر دیوار، ہر پیڑ اور ہر شاخ پر اُڑتا پھروں گا اور وہ کام جو ہزاروں روپیہ خرچ کرنے سے بھی نہ ہوگا۔ وہ میں مفت کر دوں گا۔ کوّے نے کہا۔

کُتّا اور گدھا دونوں اس کے بے حد ممنون ہوئے۔ اب دکان کے لیے جگہ تلاش کی گئی۔ زیادہ دوڑ دھوپ کے بغیر تینوں نے متفقہ طور پر جھیل کو جانے والے راستے پر ایک برگد کے درخت کے نیچے دکان کھولنے کا فیصلہ کیا تیاری شروع کی گئی۔ سارے جنگل میں کوّے نے اطلاع کر دی۔ ہم جنرل اسٹور کھول رہے ہیں۔ برگد کے درخت کے نیچے کُتّے نے اپنی دم سے زمین کی خوب صفائی کی۔ گدھا منہ میں پانی بھر کر لایا اور چھڑکاؤ ہوا۔ کوّا درخت سے بڑے بڑے پتے توڑ کر لایا۔ زمین پر سرخ، سبز پتّے بچھائے گئے۔ جانور جھیل کو پانی پینے جاتے اور برگد کے درخت کے نیچے رک کر صفائی ہوئی دیکھتے تو تینوں دوستوں کے کام کی رفتار اور تیز ہو جاتی۔

آخر دکان کھلنے کا دن آیا۔ تینوں جلدی جلدی اٹھے۔ بھاگ کر جھیل کے کنارے گئے منہ ہاتھ دھویا۔ پیٹ بھر کر پانی پیا اور آسمان کی طرف منہ اٹھا کر خدا سے تجارت میں منافع اور ترقی کی دعا مانگی۔ اس کے بعد دکان کھولی گئی۔ ایک طرف گھاس کا گٹھا رکھا جو گدھا ایک جگہ سے اٹھا کر بھاگا تھا۔ دوسری طرف ایک دکان سے چُرایا ہوا گوشت کا ایک ٹکڑا سرخ اور سبز پتّوں پر رکھا تھا اور بیچ میں زرد رنگ کا ایک پنیر کا ٹکڑا۔

سب سے پہلے ایک فاختہ آئی۔ تینوں سے دعا سلام ہوئی اور دعائیں دیتی چلی گئی۔ اس کے بعد ایک خارش زدہ کُتّا آیا اور گوشت کے برابر کھڑا ہو کر رال ٹپکانے لگا۔ دوکاندار کُتّے کو بڑا غصہ آیا اور زور سے بھونک کر کہا چلو اپنا راستہ لو یہاں کیوں کھڑے ہو۔ خارش زدہ کُتّا سہم کر پیچھے ہٹ گیا اور حسرت بھری نظروں سے گوشت کو دیکھتا ہوا چلا گیا۔ کُتّے کا موڈ خراب ہو گیا۔

بھلا یہ بھی کوئی گاہک تھا۔اس کے فوراً بعد ایک کوّا دکان پر آ گیا۔دکان پر بیٹھے ہوئے کوّے نے اُسے نفرت سے دیکھا۔

''مجھے پنیر چاہیے'' آنے والا کوّا بولا۔

گدھے سے کُتّے کی طرف دیکھا اور کُتّے نے کوّے کی طرف جس کی تیوری پر بل پڑے ہوئے تھے۔

''مجھے جلدی پنیر دیجیے'' گاہک کوّے نے دوبارہ کہا۔

یہ پنیر بک چکا ہے۔کوّے سے حقارت سے جواب دیا۔

بِک چکا ہے۔گاہک کوّے نے حیرت سے پوچھا۔گدھا اور کُتّا بھی چونک پڑا۔ہاں ہاں بِک چکا ہے۔

''تو پھر یہاں کیوں رکھا ہے'' کوّے نے پوچھا۔

''یہ ہماری دکان ہے۔ہم جو چیز چاہیں رکھ سکتے ہیں''۔

دوکاندار کوّے نے جواب دیا۔''کمال ہے۔دکان کی تو شہرت کی اور چیزیں نہیں ہیں۔کوّا بکتا جھکتا چلا گیا۔تم نے پنیر بیچنے سے انکار کیوں کر دیا۔ کُتّے نے پوچھا۔

تم نے دیکھا نہیں۔اس کی چونچ میں مٹی لگی ہوئی تھی آیا کہیں سے پنیر کھانے والا پہلے منہ تو دھولے۔

گدھا اور کتا چپ رہے۔کوّا ٹھیک ہی کہتا تھا۔بھئی اتنی بڑی دکان ہے اس پر گاہک بھی اچھے آنے چاہئیں۔

سورج اب سر پر آ گیا تھا۔اور ابھی تک کوئی کام کا گاہک نہیں آیا تھا۔نئے نئے جانور آتے جاتے حال پوچھ لیتے۔ذرا سی گھاس سوکھ گئی ہے۔اگر کہو تو نکال کر پھینک دوں۔گدھے سے کہا۔

ہاں ہاں بالکل۔اچھی دکان پر خراب مال نہیں ہونا چاہیے۔گدھے بھائی اگر زحمت نہ ہو تو کھا لو پیٹ میں پڑ جائے گی تو اچھا ہے۔کُتّے نے کہا۔

اچھا۔اچھا۔گدھے نے خوش ہو کر گھاس کے ایک طرف سے منہ مارا کتّے اور کوّے نے دیکھا کہ دو تین منہ مار کر خوب کھا گیا۔

کُتّے نے گوشت کی کھیاں اڑاتے ہوئے ایک کونا توڑ کر منہ میں ڈال دیا اور پلٹ کر کہا''سوکھ گیا تھا۔میں نے سوچا ذرا سا کھا لیں''۔

کوئی بات نہیں۔کوئی بات نہیں۔کوّے اور گدھے نے ایک ساتھ کہا۔لیکن کوّے کی آواز زیادہ بلند تھی۔کیونکہ اسے بھی پنیر کا ایک حصہ ذرا پگھلتا نظر آ رہا تھا۔لہٰذا اس نے زرد رنگ کا نمکین ذائقہ دار پنیر منہ میں رکھ لیا۔تھوڑی دیر کے بعد دکان پر دُلکی چال چلتا ہوا ایک گدھا آیا۔اور عجیب نظروں سے دکان کو دیکھنے لگا جیسے وہ کوئی بہت بڑا گاہک ہو اور ساری دکان خرید لے گا۔اس نے پہلے گدھے کو دیکھا پھر کُتّے کو اور آخر میں کوّے کو۔

گھاس کیا حساب ہے۔اس نے مسکرا کر پوچھا۔

کون سی گھاس؟ گدھے سے جل کر پوچھا

''یہ جو سامنے پڑی ہے'' گاہک نے پھر مسکرا کر کہا۔

''یہ وہ گھاس نہیں جو تم جیسے گدھے کھائیں اور یہ پڑی نہیں رکھی ہے'' گدھے سے غصے سے جواب دیا۔

اچھا۔گدھا ہنستا ہوا چلا گیا۔

شام تک تھوڑی تھوڑی دیر میں گدھا، کُتّا اور کوّا دکان کی چیزیں کھاتے رہے۔گاہکوں سے لڑتے رہے اور جب سورج غروب ہونے لگا تو دکان کی سب چیزیں ختم ہو گئی تھیں اور دس بارہ جانوروں سے تعلقات خراب ہو چکے تھے۔

رات کو یہ تینوں سر جوڑ کر بیٹھے تا کہ آج کے تجربے کی روشنی میں کل دوبارہ دکان کھولیں۔تینوں نے وعدہ کیا کہ چاہے وہ بھوکے مر جائیں لیکن ایک تو اپنی چیزیں نہیں کھائیں گے دوسرے گاہکوں سے اچھا برتاؤ کریں گے۔

دوسرے دن دکان دوبارہ کھولی گئی۔گاہکوں سے برتاؤ بھی اچھا کیا گیا لیکن تینوں میں سے کوئی بھی چیزیں بیچنے پر تیار نہ ہوا۔دوسرے دن بھی اُسی طرح شام کو سب چیزیں کھالی گئیں۔

تین چار دن یہ سلسلہ چلا۔اب تو جانور جان بوجھ کر آ کر ان تینوں کو چھیڑتے اور یہ بھی ان سے جھگڑتے۔آخر کار ایک رات کو دوبارہ ہنگامی اجلاس ہوا۔تینوں سر جوڑ کر بیٹھے اور بحث مباحثہ کے بعد یہ طے ہوا کہ دکان بند کر دی جائے۔اس فیصلے پر تینوں کو افسوس تھا خاص طور پر کوّے کو کہ یہ سارا منصوبہ اسی کا تھا کُتّے نے مختصر سی تقریر کی۔

''دراصل تجارت کرنا ہر ایک کے بس کا روگ نہیں، اس میں بُردباری اور تحمل کی ضرورت ہے۔لوگوں سے اخلاق سے پیش آنا چاہیے اور صبر کرنا چاہیے۔لیکن ہم تینوں میں یہ بات کسی میں بھی نہیں''۔

کوّے میاں بے حد پریشان تھے کہ انہوں نے دکان کی شہرت بہت زیادہ کر دی ہے۔گاہک دُور دُور سے چل کر آ رہے ہوں گے۔دکان بند ہونے سے بڑا نقصان ہے۔

اب کیا کرنا چاہیے۔کُتّے نے پوچھا۔

میں دوبارہ جا کر سب جگہ اعلان کرتا ہوں کہ ہم نے دکان بند کر دی ہے۔دونوں نے اس بات کو سراہا اور کوّا اپنی جگہ سے اُڑ گیا۔

وہ ہر منڈیر، ہر درخت پر بیٹھ کر کہتا۔

ہم نے اپنا جنرل اسٹور بند کر دیا ہے۔

ہم نے اپنا جنرل اسٹور بند کر دیا ہے۔

اب جو آپ دیکھتے ہیں کہ کوّا منڈیر پر بیٹھ کر کائیں کائیں کر کے اُڑ جاتا ہے۔تو وہ دراصل یہ اطلاع دیتا ہے کہ''ہم نے اپنا جنرل اسٹور بند کر دیا ہے''۔کیونکہ اُسے یہ خیال ہے کہ اگر آپ جنگل کے کونے پر اُن کے اسٹور سے کچھ خریدنے گئے تو خواہ مخواہ مایوسی ہوگی۔

''وطن کا محافظ''

فاری شا

(لندن)

بچوں کے لیے لکھنا بظاہر آسان معلوم ہوتا ہے مگر یہ معاملہ بڑا نازک اور مشکل ہے۔اس کٹھن کام سے عہدہ برآ ہونے کے لیے لکھنے والے کو بچوں کی مختصر اور سادہ دنیا میں گھومنا پڑتا ہے۔ان کے ساتھ قدم اٹھانے پڑتے ہیں۔ان کی طرح سوچنا پڑتا ہے۔اورانہی کی طرح نادانی کی سی باتیں کرنی پڑتی ہیں لیکن یہ نادانی بڑی دانائی اور حکمت سے حاصل ہوتی ہے۔

قمر علی عباسی بچوں کی کہانی لکھتے وقت ایسے ہی نادان بن جاتے ہیں اور پھر بچوں کی طرح سوچتے ہیں اورانہی کی زبان میں باتیں کرتے ہیں۔وہ عبارت میں بڑے سادہ لفظ لاتے ہیں ایسے لفظ جو بچوں کی دنیا سے مانوس ہوں۔کبھی کوئی غیر مانوس لفظ بھی آئے تو اس کے ساتھ اسے اپنا لیتے ہیں اوراس کی اجنبیت دُور ہوجاتی ہے۔

عباسی صاحب کی کہانیوں میں کرداروں کا ہجوم نہیں ہوتا۔ وہ جانتے ہیں کہ جہاں کہیں بھیڑ ہوتو انسان کو آشناؤں کو بھی پہچاننے میں دقت ہوتی ہے۔اس لیے وہ کہانیوں میں دو تین سے زیادہ کردار نہیں لاتے۔بچہ آسانی سے ان میں گھل مل جاتا ہے اور بے تکلف ان سے باتیں کرتا ہے۔

ان کی باتیں غور سے سنتا ہے اور اُسے ان سب سے مل کر خوشی ہوتی ہے۔وہ ان میں تھوڑی دیر رہ کر بھی بہت کچھ سیکھ لیتا ہے اور جو کچھ سیکھتا ہے اُسے دل میں اُتار لیتا ہے۔اُسے اس کا احساس نہیں ہوتا کہ مجھے نصیحت کی جارہی ہے۔میرا مقصد عباسی صاحب کی کہانیوں کا کوئی گہرا تجزیہ کرنا نہیں۔میں نے صرف اپنے ایک تاثر کا اظہار کیا ہے۔کہانیوں کو پڑھنے والے بچے خود ہی ان کہانیوں کی داد دیں گے۔

صوفی تبسم (●)

''چلا مسافر سنگاپور'' ایک واقعاتی سفرنامہ ہے۔اس میں مسافر زمین سے پیوست رہتے ہوئے اپنے سفر کے مشاہدات اور تجربات کو بے ساختگی کے ساتھ بیان کرتا چلا جاتا ہے۔اندازِ تحریر سے بے تکلفی کے ساتھ ساتھ اپنی اہمیت کا احساس نمایاں ہے۔

زبان و بیان کی روانی حالات و واقعات کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔ سفرنامے میں مناظر تیزی سے بدلتے ہیں مگر اس کے باوجود آپس میں جُڑے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔منظر کشی میں جاذبیت ہے، قاری اس میں محو ہو جاتا ہے۔مجموعی طور پر یہ ایک دلچسپ سفرنامہ ہے۔

شفیق الرحمٰن (●)

قمر علی عباسی کا طرۂ امتیاز یہ ہے کہ جہاں ان کے سفرناموں میں مشاہدات بالائی سطح پر ''کلیدکل'' کی طرح کام کرتے ہیں وہاں واقعات پر مبنی ان کے تجربات، تجزیے کی چھلنی سے گزر کر ایک لطیف مشروب کی طرح قاری تک پہنچتے ہیں۔شوقِ آوارگی اور ذوقِ نظارگی دوش بدوش چلتے ہوئے ملکوں، شہروں اور لوگوں کی تہذیبی، ثقافتی اور تاریخی جہتوں کا جائزہ لیتے ہیں۔یعنی قمر علی عباسی صرف روزنامچے میں مندرج ''ڈیلی ڈائری'' ہی نہیں لکھتے، میزبان ملک کی تاریخ اس کا نسلی تمدن، تربیتی ارتقا اور منطقہ ثقافت کے سب اطراف و اکناف کا تجزیہ بھی کرتے ہیں۔اس لحاظ سے ان کے سفرنامے صرف سفرنامے ہی نہیں ہیں، تذکرہ نویسی، تاریخ نویسی اور سفری کوائف نویسی کا حسین امتزاج بھی ہیں۔ان سب کو ان کی علمی استبداد اور تحقیقی شعور جلا بخشتے ہیں یعنی ان کے سفرنامے صیقل شدہ حالت میں ہم تک پہنچتے ہیں۔

ڈاکٹر ستیہ پال آنند (امریکہ)

زندگی کا دوسرا نام سفر ہے۔آدمی جب سے پیدا ہوا ہے عالم سفر میں ہے۔اس سفر میں انسان کے نوع بہ نوع تجربات ہمارے دل و دماغ کو راحت دیتے ہیں۔قمر علی عباسی ایک ایسے ہے صاحبِ فکر و فن مسافر ہیں وہ آج سے نہیں برسوں سے سفر میں ہیں۔ابھی تک ان کے ذہن پر تھکاوٹ کے آثار نہیں ہیں۔قمر علی عباسی کی تحریر کی محبوبیت اور مقبولیت دن بہ دن بڑھتی جارہی ہے۔عورت، مرد، جوان، نوجوان سب ان کی تحریروں کو بہ شکل سفرنامہ ذوق و شوق سے پڑھتے ہیں۔

اللہ کرے ان کا ذہن و قلم تادیر رواں دواں رہے اور اُردو ادب ان کے سفرناموں کے ذریعے سیراب اور شاداب ہوتا رہے۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری (کراچی)

قمر علی عباسی نے سفرناموں کی دنیا میں ایک نیا باب لکھا ہے۔جب ان کا پہلا سفرنامہ ''لندن لندن'' شائع ہوا مجھے اس تقریب میں شرکت کا موقع ملا۔اسی وقت میں نے اپنی تقریر میں کہا تھا کہ ''عباسی کے ارادے خطرناک ہیں یہ اس میدان میں بڑے کارنامے انجام دیں گے''۔میری پیش گوئی درست ثابت ہوئی قمر علی عباسی نے بے شمار ملکوں کا سفر کیا اور سفرنامے لکھے۔لطف کی بات یہ ہے کہ سب کے سب معلوماتی، دلچسپ اور شگفتہ ہیں۔اردو ادب میں قمر علی عباسی کے سفرناموں سے ایک گراں قدر اضافہ ہوا ہے۔ مجھے ان کے سفر ناموں میں داستان گوئی، افسانہ نگاری اور ناول کا تسلسل محسوس ہوتا ہے۔یہی ان کے قلم کی جادوگری ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی (کراچی)

اردو دنیا میں معروف ادیب قمر علی عباسی کے سفرناموں نے غیر

معمولی شہرت پائی ہے۔ان کے قارئین کا ایک خاص حلقہ ہے اور مجھے علم ہے بعض قارئین ان کے سفرناموں سے اس درجہ متاثر ہوتے ہیں کہ ان کے سفرنامے پڑھتے ہی قمرعلی عباسی کے سفرناموں کو''رہنما'' بنا کر عازم سفر ہو جاتے ہیں۔یوں تو ہمارے درمیان متعدد سفرنامہ نگار ہیں لیکن قمرعلی عباسی بلاشبہ''خالص''سفرنامہ نگار ہیں۔وہ رومانس اور ایڈونچر کے منصوبے سے کام نہیں لیتے۔بلکہ اپنے چشم دید واقعات سے پیدا ہونے والے تحیر پر بھروسہ کرتے ہیں۔

ڈاکٹر محمد علی صدیقی (کراچی)

جب منظروں اور منزلوں کے باطن میں اترنے والی نگاہ نہ ہو تو سفر نامہ نگار قصہ بن جاتا ہے۔وہ کہانیاں جو سفر کے بغیر بھی سنائی جاسکتی ہیں جب سفر کے حوالے سے سنائی جانے لگتی ہیں تو یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ جس طرح سفر کرنا کوئی مشکل کام نہیں اسی طرح سفرنامہ لکھنا بھی کوئی کارنامہ نہیں ہے۔لیکن قمرعلی عباسی غالب کی طرح وبائے عام میں مرنا پسند نہیں کرتا۔اس نے اپنے عہد کے سفرنامہ نویسوں کے قدم چلنے کے بجائے اپنی الگ راہ نکالی ہے۔وہ سفر کے دوران راستے کے ہر منظر سے ہم کلام ہوتا ہے۔کچھ اپنی کہتا ہے کچھ اس کی سنتا ہے اور یوں اس کا سفرنامہ ایک ایسی دستاویز بن جاتا ہے جسے پڑھ کر قاری کو احساس زیاں نہیں ہوتا بلکہ یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس نے کچھ حاصل کیا ہے۔اس ''کچھ'' میں ''بہت کچھ'' شامل ہے۔عباسی کے تجربے، مشاہدے اور خوبصورت انداز بیاں اور انداز بیان بھی ایسا کہ وہ لکھے اور پڑھا کرے کوئی۔

مشفق خواجہ (●)

قمرعلی عباسی صاحب جہاں ریڈیائی تکنیکوں سے آگاہ حال اور صوتیاتی اثرات کے اعلیٰ درجے کے رہ نورد ہیں وہاں انہیں نونہالوں اور نوجوانوں کی روانی کیفیات اور اس اہم طبقے کی رہنمائی کا شدید احساس بھی ہے چنانچہ بچوں کے لیے ادب کی تخلیق کے سلسلے میں انہیں قومی اور بین الاقوامی اعزازات مل چکے ہیں۔اب کی بار انہوں نے مشاہیر کے احوال و آثار پیش کر کے نوجوانوں کی ذہنی تربیت کرنے کا پروگرام بنایا ہے۔اور اس سلسلے میں موجودہ مختصر کتاب علامہ اقبالؒ کے بارے میں لکھی ہے۔یہ کام قابلِ صد مبارکباد ہے۔یوں تو علاّمہ اقبالؒ کے بارے میں بچوں اور نوجوانوں کے لیے کتابیں لکھی جا رہیں مگر موجودہ کتابچہ اس ضمن میں ممتاز رہے گا۔اس کا اسلوبِ نگارش آسان ہی نہیں، دلچسپ اور دلآویز بھی ہے۔چنانچہ میں نے مسودے کے مطالعے کا آغاز کیا اور اسے ختم کئے بغیر نگاہیں اٹھا نہ سکا۔واقعات کو بھرپور داستان کا رنگ دینے کے ضمن میں یہ کتاب قابلِ قدر ہے۔پھر مؤلف نے بچوں کی دلچسپی کا خاصا خیال رکھا ہے۔حسنِ خط اور حسنِ طباعت اسے مزید چار چاند لگائے گی۔

ڈاکٹر محمد ریاض (اسلام آباد)

(صدر شعبہ اقبالیات، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی)

ان دیکھی دنیاؤں کے در کھولنے والا اور بار بار دیکھی ہوئی دنیاؤں کو نئے انداز سے دکھانے والا قمرعلی عباسی مجھے اس لئے پسند ہے کہ وہ تحریر کے ہر اسلوب، ہر وصف سے نہ صرف بخوبی واقف ہے بلکہ اسے سلیقے سے استعمال کرنے کا ہنر بھی جانتا ہے۔میں اس کی ہر کتاب کا شدت سے انتظار کرتا ہوں۔سفرنامہ نگاری میں وہ سرسید احمد خاں سے لے کر علی سفیان آفاقی تک اور مستنصر حسین تارڑ سے لے کر عطاء الحق قاسمی تک منفرد ہے۔وہ بہت زیادہ لکھتا ہے، بہت جلدی لکھتا ہے مگر بہت اچھا لکھتا ہے۔وہ میرے دونوں بیٹوں احمد اور عمر کے بھی پسندیدہ ادیبوں میں شامل ہے اور میرے بیٹے کتاب کی پسندیدگی کے معاملے میں بھی کسی منافقت یا مصلحت پر تیار نہیں ہوتے۔

عتیق اللہ شیخ (●)

ساری دنیا کا تو مجھے علم نہیں لیکن یہ بات میں بڑے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ پاکستان میں سب سے زیادہ تعداد میں قمرعلی عباسی نے سفرنامے لکھے ہیں۔اس بات کو یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ اردو زبان میں لکھنے والے سفر ناموں کی سب سے زیادہ تعداد کے مصنف قمرعلی عباسی ہیں۔گذشتہ دس بارہ برسوں میں انہوں نے بہت سے ملکوں کا سفر کیا۔امریکہ سے ہندوستان تک اور سنگاپور سے لندن تک بہت سے ملک اور شہر ان کی تحریر کی زد میں آئے۔ان کا ایک بڑا کمال یہ بھی ہے کہ وہ یہ سفرنامے بالارادہ اور بالالتزام لکھتے ہیں۔یعنی وہ باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت صرف سفرنامہ لکھنے کے لیے سفر کرتے ہیں اور بسا اوقات تو سفر کے سارے اخراجات بھی خود برداشت کرتے ہیں۔اس زود نویسی بالارادہ تحریر کا ملکہ عام طور پر نشریاتی اداروں اور خصوصاً ریڈیو براڈ کاسٹنگ سے تعلق رکھنے والوں کو حاصل ہوتا ہے۔ممکن ہے ریڈیو کے شعبے سے طویل وابستگی کے سبب ہی انہوں نے یہ وصف حاصل کیا ہو۔میں نے عباسی کے تقریباً سارے ہی سفرنامے پڑھے ہیں۔چونکہ میں خوش قسمتی سے اس فہرست میں شامل ہوں جنہیں وہ اپنی تصنیفات ضرور بھیجتے ہیں۔اور جب ایک بار ان کی کتاب مل جائے اور انسان اسے پڑھنا شروع کر دے تو پھر مکمل کئے بغیر نہیں چھوڑتا۔اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ قدرت نے ان کو دلچسپ اور دلکش نثر لکھنے کی صلاحیت سے نوازا ہے۔ان کی تحریروں کی بے ساختگی اور شگفتگی بلاشبہ ان کو دورِ حاضر کے بہت سے مصنفوں سے ممیّز اور ممتاز کرتی ہے۔

آغا ناصر (اسلام آباد)

ابنِ بطوطہ اور اس کا سفرنامہ سارے عالم میں مشہور ہے۔اُس نے آٹھویں صدی عیسوی میں دنیا کا سفر کیا تھا۔ابنِ بطوطہ عرب کا باشندہ تھا۔اس نے سفرنامے میں دنیا کے ممالک کی تہذیب و تمدن کا تفصیلی تذکرہ کیا ہے جو تاریخی حیثیت کا حامل ہے اور اس دور کی مکمل معلومات فراہم کرتا ہے۔فی زمانہ پرنٹ، الکٹرانک میڈیا، انٹرنیٹ اور آئی ٹی کی ترقی نے سفرنامہ کی قدر و منزلت کو انتہائی کم کیا ہے، جس کی وجہ سے کوئی قابلِ ذکر سیاح یا سفرنامہ منظرِ عام پر نہیں آیا۔لیکن ابن بطوطہ کے ساڑھے چھ صدی بعد ایک سیاح اور اس کے سفرناموں

نے عوام کو اپنی طرف متوجہ کیا ہے اور شوقِ مطالعہ کو بیدار کیا ہے۔ اس سیاح کا نام ہے قمر علی عباسی جن کی ولادت امروہہ میں ہوئی اور جو آج کل نیویارک، امریکہ میں مقیم ہیں۔ عباسی نے اب تک ۳۱ سفرنامے پیش کئے ہیں۔ انہیں یہ کمال حاصل ہے کہ کسی کتاب میں انہوں نے اپنی تحریر کو دوہرایا نہیں ہے۔ ان کا اندازِ بیان اتنا اچھوتا، انوکھا ہے کہ دل میں اتر جاتا ہے۔ ایک بار سفرنامہ پڑھنا شروع کیا تو کتاب ختم کرنے کے بعد ہی ہاتھ سے چھوٹتی ہے۔ قمر علی عباسی میرے پھوپھی زاد بھائی ہیں، ہم عصر اور ہم عمر ہیں۔ سفرنامہ شائع ہوتے ہی شاید پہلی کاپی مجھے ہی بھیجتے ہیں ان کے سفرنامے امروہہ میں بے حد پسند کئے جاتے ہیں۔ رئیس انجمن (مرحوم) نواب انتقام علی، اسلام عالمی وغیرہ نے ان کے کئی سفرنامے پڑھے ہیں جو انہیں بے حد پسند آئے ہیں۔

اظہار عثامی (امروہہ، بھارت)

قمر علی عباسی ان خوش نصیب لوگوں میں شمار ہوتے ہیں جنہیں زندگی میں بے مثال کامیابی حاصل ہوئی۔ کالج کے زمانے میں بہترین مقرر، یونیورسٹی میں نہ صرف بے مثال مقرر بلکہ طلبہ کی سیاست میں پیش پیش۔ شعبہ معاشیات کے صدر منتخب ہوئے۔ اسٹوڈنٹ یونین میں شامل ہے شعبہ اردو کے جنرل سیکرٹری کے چناؤ میں کامیاب ہوئے۔ سندھ یونیورسٹی کے پہلے اردو میگزین ''صریر خامہ'' کے مدیر بنے۔ بچوں کے لیے بہت لکھا۔ جنگِ میں کالم لکھتے رہے اور پھر سفرناموں کی دنیا میں دھوم مچا دی۔ میں ان کے ہر سفرنامے کی تقریب میں بطور خاص شرکت کرتا ہوں۔ ان کے ہر سفرنامے کو دلچسپی سے پڑھتا ہوں اور پسند کرتا ہوں اس دور میں جب کتاب چھپنا ناممکن ہے قمر علی عباسی کے سفرنامے تواتر سے شائع ہوتے اور پڑھنے والوں میں پسند کیے جاتے ہیں۔ ان کی تحریر رواں، سادہ اور شگفتہ ہے۔ نئے زمانے کے یہ اصلی تے وڈے ابن بطوطہ ہیں۔

دوست محمد فیضی (کراچی)

قمر علی عباسی کے سفرنامے مجھے اس لیے پسند ہیں کہ ان میں آسان اور سادہ زبان ہوتی ہے۔ شگفتگی کا یہ عالم ہے کہ بعض وقت کے بے ساختہ مسکراہٹ ہونٹوں پر آجاتی ہے۔ میں نے بھی بہت سے ملکوں کا سفر کیا ہے لیکن قمر علی عباسی جس نظر سے مقامات اور چیزوں کو دیکھتے ہیں وہ کیسے ممکن ہے۔ میں ان کے تمام سفرناموں کی تقریب میں شریک ہوتا ہوں۔ اور یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ اپنی رائے کا اظہار کرتا ہوں۔ مجھے خوشی ہوتی ہے ملک ملک کے سفرنامے اور قمر علی عباسی کا انداز بیاں۔

میاں زاہد حسین (کراچی)

مولوی محبوب عالم سے تا حال سفرنامہ نگاروں کی بھیڑ میں قمر علی عباسی نے اپنا طرز، اپنا اسلوب اور اپنا طرزِ اظہار منفرد رکھا ہے جو بذاتِ خود ان کی جودتِ طبع کی دلیل ہے۔ قمر علی عباسی کو زمین کے مختلف خطے خود آواز دیتے ہیں کہ آؤ ہمیں دیکھو، پرکھو، برتو اور سفرنامے میں ڈھال دو۔ انہوں نے زمین سے اپنا رشتہ استوار رکھا ہے اسی لیے زمین بھی انھیں پہچانتی ہے۔ سڑکیں، میدان، دریا، سمندر، گلیاں، چوبارے، محل، حویلیاں، جھونپڑیاں، سرائے اور پنج ستارہ ہوٹل مختلف ہوسکتے ہیں۔ زبانیں، انداز، اطوار اور حالات جدا ہوسکتے ہیں لیکن اس کائنات کا محور انسان ہیں۔ قمر علی عباسی نے انہی انسانوں سے دوستی کی ہے اور ان کے احساس، جذبے، فطرت اور سوچ کو سفرناموں کا روپ دیا ہے۔ قمر علی عباسی جگہوں کو دیکھتے ہی نہیں بلکہ دکھاتے بھی ہیں اور اسی دکھانے میں بڑے مشکل مقامات بھی آتے ہیں جن سے قمر آسانی سے گزر جاتے ہیں۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ قمر علی عباسی کا کوئی سفرنامہ شروع کرنے کے بعد قاری اُسے ختم کیے بغیر رہ نہیں سکتا۔ یقین نہ ہو تو ہمارے دعوے کو آزمایئے آپ بھی کہہ اُٹھیں گے کہ:

وہ لکھیں اور پڑھا کرے کوئی

عقیل دانش (لندن)

بلاشبہ قمر علی عباسی کو قمر علی عباسی بنانے والا تو روشنیوں کا شہر ''شہر کراچی'' ہی ہے اور دیس کی مٹی ہی نے انہیں جلا بخشی ہے کہ آج ایک روشن ستارہ اپنی تمام تر جگمگاہٹوں اور رعنائیوں کے ساتھ ہمارے درمیان موجود ہے مگر جو توقیر اور تکریم اہلِ نیویارک نے انہیں بخشی ہے، جس مقام اور مرتبے سے نوازا ہے اور جس طرح اپنی عقیدتوں کے پھول یہاں سات سمندر پار بسنے والے عشاقانِ اردو نے ان پر نچھاور کیے ہیں اس کا نظارہ بھی دیدنی ہے۔

میں نے جب جب قمر علی عباسی کے سفرناموں میں ان کے ساتھ سفر کیا ہے تو مجھے ایسا لگا جیسے ایک معصوم بچہ اپنی حیرتی آنکھ سے دنیا کو پہلی بار دیکھ رہا ہے۔ یہ بچہ کبھی لاڈ اور کبھی تجسس سے چیزوں کو توڑتا ہے، چھوتا ہے اور اپنی شرارتوں اور معصوم خطاؤں سے محظوظ ہوتا ہے مگر اس کے اندر کی سچائی اور باطن کا حسن اسے کہیں بھی سلطنت کے درجے تک نہیں آنے دیتے۔

فرحت زاہد (امریکہ)

قمر علی عباسی کے ایک انعام یافتہ ناول ''بہادر علی'' پر بچوں کی سیریل بھی پاکستان ٹیلی ویژن اسٹیشن سے چھ ماہ تک نشر ہوتی رہی ہے۔ جس کی خود مصنف نے ڈرمائی تشکیل کی تھی۔ بہادر علی کو یونیسکو نے دنیا بھر کی زبانوں میں شائع کیا ہے۔ قمر علی عباسی کی ایک سیریل ''چچا بھتیجہ'' بی بی سی لندن کی اردو سروس سے نشر ہورہی ہے۔ یہ بہت بڑا اعزاز ہے جو اس سے پہلے کسی ادیب کو حاصل نہیں ہوا۔

بہادر علی کے علاوہ ان کی کتابوں ''کائیں کائیں''، ''میاؤں میاؤں''، ''شرارتی خرگوش'' اور ''سمندر کے بیٹے'' پر ۱۹۷۳ء۔ ۱۹۷۸ء۔ ۱۹۸۰ء اور ۱۹۸۲ء کے پاکستان رائٹرز گلڈ انعامات مل چکے ہیں۔

قمر علی عباسی اردو زبان میں بچوں کی کیسٹ کہانی کے بانی ہیں۔ سب سے پہلے بچوں کے عالمی سال کے سلسلے میں اپنی کہانیوں کو ریڈیو اور ٹیلی

ویژن کی ممتاز فنکارہ اور اپنی بیوی نیلوفر عباسی کی خوبصورت آواز میں ریکارڈ کر کے جاری کیا تھا۔ اس کے بعد سینکڑوں کیسٹ بچوں کے لیے بننے لگے۔ یعنی ایک اچھی روایت کی بنیاد پڑ گئی۔

ناصر زیدی (لاہور)

قمر علی عباسی کا نظریہ فن واضح ہے۔ اس نے کسی طرح کی غیر ضروری مذہبی سماجی و سیاسی حد بندیاں نہیں کیں۔ ذاتی تعصّبات کی بنیاد پر ترجیحات کا تعین نہیں کیا۔ بلکہ سادگی، اپنائیت اور دیانتداری سے مسافرت کے تجربوں کو بیان کیا ہے۔ انسانی جذبات وحالات کے تجزیئے نہیں کیے، فیصلے نہیں کیئے، تذکرے نہیں کیے کہ بابا سفید پوش کو اس کی تمام جلالی کیفیات کے باوجود بھی اس کا فطری عجز اجازت نہیں دیتا کہ ذات اور کائنات کے بے ساختہ پن کو تار تار کرے۔ اپنی فکری فتوحات کے پرچم بلند کرے۔۔۔ اسی لیے قمر علی عباسی کی جستجو قائم ہے۔ راستے آباد ہیں۔۔۔ چوپالیں سج رہی ہیں۔ ہوائیں زمین و آسمان کے اسرار و رموز سے آگاہی حاصل کر رہی ہیں۔

وصل کو ہجر کے راستوں پر حیران کرتی زندگی متحرک ہے اور سفر جاری ہے۔۔۔

نوشی گیلانی (امریکہ)

قمر علی عباسی صاحب کے سفر ناموں کی خصوصیت ان کی بے تکلفانہ تحریر ہے۔ اس بے تکلفی میں ایک ایسی عجیب جاذبیت پائی جاتی ہے جو ان کا طرۂ امتیاز ہے۔ ان کی قوّتِ مشاہدہ دوسروں کی بہ نسبت قوی تر ہے۔ لیکن اس کا وصف اس وقت ظاہر ہوتا ہے جب وہ اس مشاہدے کے نتیجے کو الفاظ کے ذریعے اس بے تکلفی سے بیان کر دیتے ہیں کہ پڑھنے والا اس سے حظ لینے لگتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی اپنا عزیز دوست دھیمے دھیمے لہجے میں بے تکلفی کی تصویر بنائے دے رہا ہے۔

نقشبند قمر نقوی بخاری (امریکہ)

قمر علی عباسی کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے ادبی ورثے کی ترسیل کے ساتھ ساتھ اس میں دلچسپی کے کسی بھی پہلو کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا ہے۔ اس دلچسپی کے سبب ان کے سفرنامے پڑھتے ہوئے مجھے تو اپنے بچپن کا وہ دوست یاد آ جاتا ہے جو کراچی کی سڑکوں پر، سردیوں کی شاموں میں، ریت میں بھنی ہوئی گرم گرم مونگ پھلیاں اپنی جیبوں میں بھر کر، میرے ساتھ اس وقت تک سڑکوں پر آوارگی کرتا رہتا جب تک کہ نیند اُس کی آنکھوں کے پپوٹوں پر دستک نہ دینے لگتی۔ اور وہ اپنی داستان ادھوری چھوڑ کر اگلی شام پھر وہیں سے شروع کرنے کا وعدہ کر کے، رات کے گہرے ہوتے ہوئے سنّاٹوں کی گود میں چلا جاتا۔ قمر علی عباسی بھی اپنے سفرناموں میں مجھے اس طرح اپنا شریک رکھتے ہیں۔ جب اُن کا ایک سفرنامہ ختم ہو جاتا ہے تو دوسرے سفرنامے کی نوید دے کر رخصت ہو جاتے ہیں اور میں ان کے ہر نئے سفرنامے کا اس طرح انتظار کرتا ہوں جس طرح اپنے دوست کے ساتھ نئی کہانیوں اور نئی شام کا انتظار کیا کرتا تھا۔

اشفاق احمد (کینیڈا)

سفرنامہ نگار کی حیثیت میں قمر علی عباسی کی اپنی ایک منفرد حیثیت ہونے کے علاوہ ان کی ایک دوسری اہم حیثیت ''پاکستان کی نظریاتی سرحدوں کے محافظ'' سپاہی ہونے کی ہے۔ وہ پاکستان کے خلاف ایک جملہ تک سننا گوارا نہیں کرتے۔ سفرناموں کے علاوہ علامہ اقبال، لفظ پاکستان کے خالق، چوہدری رحمت علی اور بانی پاکستان محمد علی جناح پر کتابیں تحریر کی ہیں اور ان کی ایک کتاب ''پیارا پاکستان'' تو تحریکِ پاکستان کو سمجھنے کے لیے کلیدی کردار ادا کرتی ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے پاکستان ٹیلی ویژن کے لیے ایسی سیریز لکھیں جو اندرونِ ملک اور بیرونِ ملک بھی مقبول ہوئیں اور پھر بڑوں کے لیے ادب تخلیق کرنے کے ساتھ قمر علی عباسی اغلباً ایسے واحد لکھاری ہیں جنہوں نے بچوں کے لیے بھی گرانقدر ادب تخلیق کیا ہے۔ ان کی کئی تخلیقات کو ڈرامائی سیریل کے طور پر ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر پیش کیا جا چکا ہے۔ ان کی متعدد تصانیف پر انہیں اعلیٰ اعزازات و انعامات سے نوازا گیا ہے اور ان کا ایک ناول ''بہادر علی'' اقوام متحدہ کے ادارے یونیسف کی جانب سے دنیا کی مختلف زبانوں میں شائع ہو کر انہیں شہرت دوام سے ہمکنار کر چکا ہے۔ لہٰذا قمر علی عباسی اب محض سفرنامہ نگار یا کالم نگار نہیں بلکہ اردو ادب میں بذاتِ خود ایک ''صنف'' ہیں۔

نصر ملک (ڈنمارک)

قمر علی عباسی کی بڑی خدمات ہیں۔ ریڈیو پاکستان کے افسر رہے مگر سفرناموں کے ہمسفر بھی ہے، بہت لکھا، مسلسل لکھا اور خوب لکھا۔ اچھا لکھتے بھی ہیں اور اچھا بولتے بھی ہیں۔ ان کا قلم پڑھنے والے کی انگلی تھام کر دیس دیس، وادی وادی ساتھ ساتھ لئے پھرتا ہے، حسین نظارے دکھاتا ہے، نگر نگر سیر کراتا ہے، کبھی گدگداتا ہے، کبھی ہنساتا ہے اور کبھی کبھی رُلاتا بھی ہے۔ ہماری دعا ہے کہ ان کا قلم کالم، سفرنامے اور دیگر خوبصورت تحریریں بکھیرتا رہے۔ ان پر صدارتی ایوارڈز وارے جاتے رہیں اور ان کے اعزاز میں جشن منائے جاتے رہیں۔ آمین

نصیر رانا (نیویارک)

قمر علی عباسی جب سندھ یونیورسٹی کی تقاریر کے مقابلے میں نمائندگی کرتے تو ان کے مقابلے میں تقریر کرنے والے مایوسی کا شکار ہو جاتے کیونکہ پہلا انعام تو ان کو ہی ملتا تھا۔ مخالفت اور موافقت میں ایک ہی وقت میں تقریر کر سکتے تھے۔ جس کا مطلب انتہائی بے وقوف آدمی بھی سمجھ سکتا ہے کہ وہ یہ کہ موضوع پر ان کی گرفت اس قدر مضبوط ہوتی کہ منفی اور مثبت پہلو دونوں ان کی نظر میں ہوتے۔ آواز کا گراؤ چڑھاؤ، بیان میں حدت کے ساتھ شدت اور جذبات سے کھیلنا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ اللہ کا شکر ہے یہ سیاست کے میدان میں داخل نہیں ہوئے ورنہ ان سے الیکشن میں جیتنا ممکن کام نہیں تھا۔ یہ تو جہاں پیسہ بچا سفر پر روانہ ہو گئے اور پھر اپنے سفر کی داستانیں مزے مزے میں

بیان کر کے ہم جیسے ہزار ہا آدمیوں کا دل جلاتے ہیں اور حسد میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ بین السطور بات کہنے میں ماہر ہیں اور ایسی ایسی تلخ بات اتنے پریم سے کہہ جاتے ہیں کہ آدمی ششدر رہ جائے اور ایسے ہی لکھ دیتے ہیں۔ سفرناموں سے ان کی پہچان پاکستان اور بھارت میں خوب ہے۔ ہم نے ان کے کچھ سفرنامے قسط وار پڑھے ہیں اور اب انہوں نے اللہ اللہ کر کے مہربانی کی تو مفت میں سفر نامے نصیب ہوئے اور اب کتابی صورت میں دیدار ہوا ہے۔

احتشام رضا کاظمی (نیویارک)

عباسی صاحب کے سفرناموں کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ اپنے قاری کی انگلی پکڑ کر گلی کوچوں، بازاروں پہاڑوں اور سبزہ زاروں کی سیر کو چل دیتے ہیں۔ جملوں کی بناوٹ میں ایسی چاشنی ہوتی ہے جو پڑھنے والوں کو راحت اور سکون کا احساس دلاتی ہے۔ قمر علی عباسی اپنی تحریروں میں پورے وجود کے ساتھ نظر آتے ہیں۔ ان کے سفرناموں کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ اپنے سفرناموں کا ایک کردار بن جاتے ہیں۔ ان کی شوخ اور چنچل تحریریں ان کے مزاج کا پتہ دیتی ہیں۔ جہاں قاری شہر شہر اور گاؤں سے واقف ہوتا ہے وہیں قمر علی عباسی کی ذات کے مختلف پہلوؤں سے روشناس بھی ہوتا ہے۔ قمر علی عباسی کے لیے اگر میں یہ کہوں کہ وہ اردو ادب کی ایک مکمل درس گاہ ہیں کیونکہ علم و ہنر کا جو خزانہ ان کی چھوٹی چھوٹی تحریروں میں پوشیدہ ہوتا ہے ان سے موجودہ اور آنے والی نسلیں فیض یاب ہوتی رہیں گی۔ عباسی صاحب اس صدی میں اردو ادب کے لیے قدرت کا انمول تحفہ ہیں۔ وہ ایک سچے اور کھرے لکھنے والے ہیں۔ ان کی تحریروں میں جہاں بھرپور مزاح ہوتا ہے وہیں طنز کے ایسے نشتر چبھ جاتے ہیں کہ پڑھنے والے کسمسا کر رہ جاتا ہے۔

بیگم تسنیم قمر (نیویارک)

اگر افسانے یا سفرنامے عرق ریزی سے لکھے جائیں اور ہر بات کا خیال رکھا جائے تو وہ سفرنامے زندگی کی یادگار بن جاتے ہیں اور ایسے سفرناموں کو ہر شخص پڑھنا پسند کرتا ہے اور اگر خوبیاں نہ ہوں تو قاری ایک دو صفحات پڑھ کر کتاب کو بالائے طاق رکھ دیتا ہے۔ لیکن جو سفرنامے جناب قمر علی عباسی کی طرح لکھے گئے ہوں تو قاری کے ہاتھ سے کتاب جب تک نہیں چھٹتی جب تک سفرنامہ اپنی منزل پر پہنچ نہیں جاتا اور قاری کو چین نہیں مل جاتا۔ یہ خوبیاں جناب قمر علی عباسی کی تحریروں میں از حد موجود ہیں۔ قمر علی عباسی کا ہر سفرنامہ لاجواب، بے مثال ہے ان کے سو سے زائد سفرنامے ابھی تک منظرِ عام پہ آ چکے ہیں اور آئندہ بھی امکانات ہیں۔

ترغیب بلند نقوی (کوپن ہیگن)

قمر علی عباسی نے جس تیزی سے مہارت سے سفرنامے لکھے ہیں مجھے حیرت اور خوشی ہے۔ وہ جس ملک جاتے ہیں وہاں کے بارے میں قاری کو ہر وہ معلومات پہنچا دیتے ہیں جو ضروری اور دلچسپ ہوتی ہے۔ میری خوش قسمتی ہے کہ ان کے ہر سفرنامے کی تقریب میں صدر ہوتا ہوں۔ ہر بار ایک دلچسپ شگفتہ رواں تحریر پڑھنے کو ملتی ہے۔ ایسے مصنف کم ہوں گے جن کی تحریروں کو قبولیت عام ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ان کی تحریر میں زیادہ پختگی اور روانی آتی جا رہی ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے سفرنامہ لکھنا ان کے بائیں ہاتھ کا کام ہے۔ دنیا میں جتنی زبانوں میں سفرنامے لکھے گئے ہیں قمر علی عباسی کے سفرنامے سب سے زیادہ ہیں۔ میں ان کی صحت، درازیٔ عمر کے لیے دعا گو ہوں تا کہ وہ سفرنامے لکھتے رہے اور مجھے صدارت کا موقع ملتا رہے۔

جنرل معین الدین حیدر (کراچی)

قمر علی عباسی اردو ادب میں اپنا مقام بنا چکے ہیں خصوصاً سفرنامہ نگاری میں وہ اپنی انفرادیت منوا چکے ہیں۔ پاکستان میں قیام کے دوران بھی ان کی اس حیثیت کو ادبی حلقوں میں پذیرائی حاصل رہی۔ اب وہ امریکہ میں بھی اپنی ادبی سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے ہیں اور وہاں ایک ادبی انجمن نے ان کے ادبی کارناموں کے اعتراف میں پانچ ہزار ڈالر کا نقد انعام اور خلعت عطا کی ہے جس کے قمر علی عباسی بجا طور پر مستحق ہیں۔

ڈاکٹر اسلم فرخی (کراچی)

ہمارے والد محترم جناب قمر علی عباسی کو الفاظ اپنا شہنشاہ مانتے ہیں جب وہ قلم اٹھاتے ہیں تو الفاظ ان کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور کہتے ہیں ہم حاضر ہیں جس طرح چاہیں استعمال کریں اور ہمارے والد پورا پورا انصاف کرتے ہیں، ہر لفظ کو موتیوں کی طرح ایسے پروتے ہیں کہ ''لفظ'' کو بھی لگتا ہے کہ میں اسی تحریر کے لیے بنایا گیا ہوں۔

کسی بھی سلطنت کے دو بادشاہ نہیں ہو سکتے، یہ ہمارا بھی ماننا ہے اور پرنس چارلس کو دیکھ کر یہ یقین بھی ہے کہ ضروری نہیں کہ ہر بادشاہ کا بیٹا بادشاہ بنے، اب جو ہمارا خود ایمان ہو اس کو کسی اور کے سامنے کیسے غلط کہیں، کیسے ان لفظوں کو مجبور کریں ایمان بدلنے پر، ہم ڈرتے نہیں مگر وہ لفظ جو پچھلے کئی سال سے کسی اور کی رعایا بنے ہوئے ہیں ان کی ہائے نہیں لینا چاہتے۔ رشتے سالوں میں بنتے ہیں اور لمحوں میں ختم ہو جاتے ہیں مگر ہمارے والد جنہیں ہم بچپن سے ان لفظوں سے محبت کرتے دیکھا، وہ ان سے ایک ایسا رشتہ بنا چکے ہیں جو صدیوں تک قائم رہے گا۔

ہر باپ کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کی اولاد اس کے نقشِ قدم پر چلے اور ہمارے والد بھی یہ ہی چاہتے ہیں کہ ایک اچھی اولاد کی طرح ہم ان کے نقش قدم پر چلیں اور قلم اٹھائیں، اب ہم ان کو کیسے سمجھائیں کہ وہ الفاظ جو ان کے بہت گہرے دوست ہیں وہ ہم سے شاید ویسی وفا نہ نبھائیں مگر پھر بھی ایک سعادت مند اولاد کی طرح ہم نے یہ سوچ کر قلم اٹھا لیا کہ ہمارے والد دائیں اور ہم بائیں ہاتھ سے لکھتے ہیں اور اگر ہم ان جیسا نہ بھی لکھ پائے تو ہمارے پاس ایک بہت اچھا بہانہ ہوگا کہ بائیں ہاتھ والے دماغ کے دوسرے حصے سے سوچتے ہیں۔

وجاہت عباسی (امریکہ)

☆

○

جب بھی کسی محفل میں تیرا ذکر ہوا ہے
محسوس ہوا غزلوں کا دیوان کھلا ہے
(قمرانجم)

○
○○○

قرطاسِ اعزازاعلیٰ

○

نیلوفر علیم عباسی

○

کے نام

○○○
○

''وہی خدا ہے''

نیلوفر علیم عباسی

میں کون ہوں؟ خود سے یہ سوال اب نہیں جب میں چھوٹی تھی جب بھی کرتی تھی۔۔۔ میں بار بار دوہراتی ''میں نیلو ہوں'' اپنے ممی ڈیڈی کی بیٹی۔۔۔ میں اسکول جاتی ہوں وہاں میری دوست ہیں۔۔۔ اور ایسے ہی بے معنی بے تکے خیال اور سوال اور پھر عجب سی کیفیت ہوئی۔۔۔ آپ بھی اپنے آپ سے یہ سوال کر کے دوہرا کر دیکھیں یقیناً آپ بھی اس کیفیت سے گذریں گے۔ یہ کوئی Abnormal بات نہیں شاید ساری عمر انسان اسی تلاش و جستجو میں رہتا ہے کہ میں کون ہوں؟ کس لیے پیدا کیا گیا؟ کس ڈھنگ سے یہ جیون بتاؤں اور جو رنگ ڈھنگ میرے ہیں کیا درست ہیں؟ جو کچھ میں نے حاصل کیا ۔۔۔ کیا وہ کافی ہے؟ کیا میں زندگی کی دوڑ میں پیچھے تو نہیں رہ گیا، مقابلہ بازی کے اس دور میں یہ سوالات اور زیادہ سر اُٹھاتے ہیں۔

بچپن کا دور ہنسنے بولنے اور بے فکری کا زمانہ لڑکپن نوجوانی بھرپور انجوائے کرنے کے دن، حالانکہ کچھ بیچارے لوگوں کو نہ بچپن سہانا میسر ہوتا ہے اور نہ نوجوانی کے خوشگوار دن، ذمہ داریاں، غربت، افلاس اور بیماری کبھی کبھی نوجوانی میں ہی آ گھیرتی ہے یا ان انسانوں کی پیدائش ہی ان حالات میں ہوتی ہے۔

میرے ساتھ ایسا کچھ نہیں ہوا مگر نجانے کیوں ان سب کیفیتوں اور جذبات کو میں اپنے اندر پاتی ہوں۔ اُسی طرح محسوس کرتی ہوں جیسے ایک مجبور انسان کرتا ہے۔

یہاں نیویارک میں دسمبر جنوری میں باہر برف پڑی ہوتی ہے یخ بستہ ہوائیں شائیں شائیں کر رہی ہوتی ہیں تو گھر کا کوئی فرد یہ کہتے ہوئے ''اُف کتنی ٹھنڈ ہے، Heating ذرا اور بڑھانی چاہیے''۔ Heating بڑھا دیتا ہے ، ایسے میں اُس حرارت سے لطف اندوز ہونے کے بجائے مجھے اپنے وطن کی وہ خیمہ بستیاں یاد آنے لگتی ہیں جہاں کے خیمے عام ہوا کا مقابلہ کرنے کی سکت نہیں رکھتے تو بھلا برفیلے تھپیڑوں کا کیا مقابلہ کرتے ہوں گے؟ ان خیموں کے اندر ٹھٹھرتے انسان بلکتے بچے کس طرح صبح سے شام۔۔۔ شام سے رات اور پھر کیسے صبح کرتے ہوں گے!

میں پختون خواہ کے پہاڑوں پر رہنے والے اُس نابینا نوجوان کو کبھی نہ بھلا سکوں گی جو ایک ٹی۔ وی چینل پر اپنے خاندان کی پریشانیوں کا حال بتاتے کہہ رہا تھا ''میرے دو اور بھائی بھی نابینا ہیں۔۔۔ آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں۔ گاؤں والے کچھ مدد کر دیتے ہیں، اکثر تو ہم روزے کی حالت میں ہی رہتے ہیں، صبح پانی پی کر روزہ رکھ لیتے ہیں، جب یہاں امریکہ میں ڈھیروں تازہ بچا ہوا کھانا Garbage ہوتا ہے تو میں سوچتی ہوں یہ کھانا کتنے جسموں کو توانائی عطا کر سکتا تھا۔۔۔ لیکن میرے سوچنے سے کیا ہوتا ہے، میں تو Practically جو کچھ کر سکتی ہوں کرتی ہوں مگر وہ کم بہت کم ہوتا ہے۔ میرے پاس اتنی توانائی، طاقت اور وسائل ہوں کہ میں زیادہ سے زیادہ لوگوں کے کام آ سکوں۔

قمر علی عباسی میرے میاں اکثر مذاق میں مجھے ''ہمدرد دواخانے'' کا خطاب دیتے ہیں اور شعر پڑھتے ہیں:

مجھے کس شب ملالِ گریۂ شبنم نہیں ہوتا
مجھے وہ غم بھی ہوتا ہے جو میرا غم نہیں ہوتا

اللہ تعالیٰ مجھے سچ مچ اتنی ہمت دے کہ میں دکھی دِلوں پر مرہم رکھنے کا ذریعہ بن سکوں۔ رنگ بدلتے لوگوں سے بہت ڈر لگتا ہے۔ وہ لوگ جو ہمیشہ کرسی، اقتدار اور کہاں کس سے فائدہ اٹھانے کے چکر میں رہتے ہیں۔

کوشش کرتی ہوں کہ کسی کی سنی سنائی باتوں میں نہ آؤں۔۔۔ کوئی بات ہو تو Ont to One بات کر کے معاملے کی وضاحت کی جائے۔ پہلے ایسی باتوں پر آزردہ ہو جاتی تھی مگر وقت کے ساتھ Maturity آتی جاتی ہے۔ مگر لاکھ احتیاط کے باوجود کبھی کبھی یوں بھی ہو جاتا ہے کہ

گو ذرا سی بات پہ برسوں کے یارانے گئے
لیکن اتنا تو ہوا کچھ پہچانے گئے

رشتوں، دوستیوں کو بچا کر رکھتی ہوں۔ انہیں عزیز رکھتی ہوں۔ نئی دوستیاں اب کتنے برس کے لیے؟ کون جانے۔

بہت سے پرانے لمحوں کو، واقعات کو یاد کر کے خوش ہوتی ہوں کبھی کبھی افسردہ کہ وہ لمحے کبھی واپس نہیں لوٹتے جو گذر گئے جو ''کل'' ہو گئے۔

پسندیدہ مصنف کرشن چندر کے افسانے آج بھی اُسی ذوق و شوق سے پڑھتی ہوں جیسے پانچویں جماعت میں پڑھتی تھی۔ منیر نیازی کی شاعری پسندیدہ ترین، قمر علی عباسی کے سفرنامے دلچسپ اور زندگی کی توانائی اور حرارت سے بھرپور محسوس ہوتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے جو دیا ہے بہت زیادہ نوازا۔ اُس کی عنایات پر جتنا شکر ادا کروں کم ہے۔ ہم لاکھ منصوبے بنائیں، کوشش کریں لیکن اُن کی کامیابی صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔

Man Proposes... God Disposes

جو نظامِ ہستی چلا رہا ہے وہی خدا ہے۔

☆

مجلسِ چہارسُو

آج کا دن میری زندگی کا یادگار دن اس حوالے سے ٹھہرتا ہے کہ میں اُس عظیم شخصیت سے ہم کلام ہوں جو ایک زمانے میں بیک وقت ایک سے زیادہ میڈیم پر حاوی اور قادر رہی ہیں۔ محترمہ نیلوفر عباسی صاحبہ نے آواز اور انداز کو جو نئے زاویے عطا کیے، الیکٹرانک میڈیا آج بھی اُن کی پیروی پر مجبور ہے مگر محترمہ نیلوفر عباسی صداکاری وادا کاری سے آگے بہت آگے اپنا سفر جاری رکھے ہوئے ہیں جس میں علمی، ادبی، ثقافتی اور سماجی کام سرِفہرست ہے۔ خدا سے دعا ہے کہ وہ انہیں اسی طرح سلامت، باکرامت رکھیں تاکہ آنے والوں دنوں میں بھی اُن کے قلم اور قلب سے نئے نئے عنوانات اور نئے نئے مضامین دستیاب ہوں اور اردو ادب کا دامن وسعت اختیار کرتا جائے جس کے زیرِ اثر قاری کی بہتر تہذیب اور تربیت کا وسیلہ ہو۔

عطیہ سکندر علی

☆ آپ کا تعلق ایک بڑے علمی، ادبی گھرانے سے ہے۔ آپ اپنی زبان سے قارئینِ چہارسو کو بتلائیں تو لطف دوبالا ہو جائے گا؟

☆☆ میرے ڈیڈی علیم الدین کا تعلق اعظم گڑھ سے تھا جہاں علم وادب کا چرچا تھا، مولانا شبلی نعمانی اور جیّد عالم سیّد سلمان ندوی کا تعلق اُسی علاقے سے تھا، میرے والد کو انگریزی اور اُردو دونوں زبانوں پر عبور تھا اور اُن کے ہاں دونوں زبانوں کے عمدہ لٹریچر کا خزانہ تھا۔ وہ خود بھی بڑھیا مضمون نگار تھے اور الٰہ آباد یونیورسٹی کے طلباء کے جریدے کے انچارج ''جنگ'' میں اُن کا آخری مضمون اُن کی وفات کے ایک ہفتے بعد چھپا۔ میرے سب سے بڑے ماموں ڈاکٹر اسلم فرخی اور اُن کے صاحبزادے ڈاکٹر آصف فرخی بھی ادبی حلقوں میں نہایت محترم اور معتبر جانے جاتے ہیں۔ آصف فرخی کی والدہ یعنی میری ممانی بیگم تاج فرخی ڈپٹی نذیر احمد کے خانوادے سے ہیں۔ میری والدہ محترمہ ن۔ خاتون پاکستان کی پہلی تنقید نگار تھیں اُنہیں اُردو اور فارسی کے ہزاروں اشعار یاد تھے جنہیں موقع محل کی مناسبت سے استعمال بھی وہ خوب کرتی تھیں۔

☆ کچھ تفصیل تعلیمی ایّام کی بتلایئے تاکہ بہت سے قریبی احباب خاص کر مس بلبل سے تفصیلی تعارف حاصل ہو سکے؟

☆☆ اپنے والدین کی توجہ سے ابتدائی جماعتوں میں مَیں نے ہمیشہ اول پوزیشن حاصل کی لیکن آگے چل کر ''ڈبل پروموشنز'' کی وجہ سے یہ سلسلہ سب سے اونچی پوزیشن بحال نہ رکھ سکا لیکن ہمیشہ اتنے نمبر ضرور آئے کہ اللہ کے کرم سے اچھے سے اچھے کالج میں داخلہ ملا۔

مس بلبل کے متعلق آپ نے خصوصی طور پر پوچھا تو میں ضرور بتاؤں گی، وہ ینگ اور اسمارٹ تھیں سانولا پُرکشش چہرہ آواز بلبل جیسی سریلی بچوں سے بہت میٹھے انداز سے بات کرتی تھیں، شاید جو آپ کو اچھا لگتا ہے اُس کی عام سی بات بھی بہت خاص لگتی ہے۔ اس لیے مس بلبل ہماری فیورٹ تھیں وہ کسی خاص کلاس کی ٹیچر نہیں تھیں بلکہ جو ٹیچر کسی بھی کلاس کی غیر حاضر ہوتی تھیں وہ اُن کی کلاس میں چلی جاتیں، وہ ہماری پرنسپل مسز ممتاز کی چھوٹی بہن تھیں اور اس لیے تھوڑے ''اختیارات'' اُن کے پاس زیادہ تھے جن کو استعمال میں لا کر وہ بچوں کے لیے پکنک، پارٹیاں اور چڑیا گھر کی سیر کے پروگرام بناتی تھیں اور ہر دلعزیز تھیں۔

☆ شوبز کے لیے اعلیٰ تعلیم بالخصوص مائیکرو بیالوجی کی کیا اہمیت ہے؟

☆☆ شوبز اور مائیکرو بیالوجی کا براہِ راست تو کوئی تعلق نہیں نظر آتا لیکن ''تعلیم'' چاہے وہ کسی بھی مضمون یا میدان میں حاصل کی جائے آپ کے ذہن اور شخصیت کو جلا بخشتی ہے، زندگی کے بہت سے معاملات کو سمجھنے میں اور فیصلوں میں مددگار ہے، تہذیب وآداب سے آگاہی ہوتی ہے۔ تعلیم حاصل کر کے اگر یہ سب نہ ہو تو کسی بھی قسم کی تعلیم بے کار ہے۔

☆ ادب اور شاعری کے بجائے صداکاری آپ کا انتخاب تھا یا مجبوری؟

☆☆ میرا پسندیدہ انتخاب ریڈیو کے مائیک پر بولنا میرا بچپن کا خواب تھا اور جس طرح اس کی تعبیر ملی اور جو پذیرائی ہوئی اللہ کے کرم سے وہ بے مثال تھی۔

☆ ریڈیو کے تجربات اور اُن سے منسوب کچھ دلچسپ واقعات آپ کے حافظے میں یقیناً محفوظ ہوں گے؟

☆☆ یقیناً واقعات بہت زیادہ ہیں مگر ایک واقعہ جو دلچسپ ہونے سے زیادہ مجھے اہم لگتا ہے اور جب جب بھی اُسے یاد کرتی ہوں تفاخر کے ایک انہونے جذبے سے سرشار ہو جاتی ہوں۔

ستر کی دہائی میں ذوالفقار علی بھٹو صدرِ مملکت کے عہدے پر فائز ہوئے، عوام میں اُن کی پسندیدگی عروج پر تھی ریڈیو پاکستان نے کئی نغمے عوام کی پسند اور جذبات کو ملحوظ رکھتے ہوئے تیار کیے تھے۔ یہ نغمے بھٹو شہید کو بھی پسند تھے کیونکہ وہ عوامی لیڈر تھے اُن کی خواہش پر پسندیدہ نغموں کی فہرست ایوانِ صدر سے بھیجی گئی اور ایک خاص پروگرام ڈائریکٹر پروگرامز سلیم گیلانی صاحب نے ترتیب دیا کوئی بھی پروگرام ہو گیلانی صاحب اُس کے معیار کا خاص خیال رکھتے اور اس پر کوئی کمپرومائز نہ کرتے اسی لیے اس پروگرام کی کمپئرنگ کے لیے انہوں

نے بابائے براڈ کاسٹنگ جناب ذوالفقار علی بخاری کا انتخاب کیا۔ پروگرام ریکارڈ ہوا اور کئی دن پہلے سے قومی نشریاتی رابطے پر اس کے نشر ہونے کے دن اور وقت کی پبلسٹی شروع ہوگئی۔ سب کو بے چینی سے اس کا انتظار تھا جس رات یہ پروگرام ساڑھے آٹھ بجے نشر ہونا تھا گیلانی صاحب کا فون میرے پاس آیا کوئی پونے آٹھ بجے ''ریڈیو کی گاڑی آرہی ہے پلیز فوراً براڈ کاسٹنگ ہاؤس پہنچ جایئے''

مگر اس وقت۔۔۔اچانک؟ میں نے پوچھا

''وقت بہت کم ہے بس آپ فوراً پہنچ جایئے''۔

میرا گھر براڈ کاسٹنگ ہاؤس سے قریب ہی تھا۔ میں چند منٹ میں اسٹوڈیو کی سیڑھیاں چڑھ رہی تھی۔ ہوا یہ تھا کہ پریذیڈنس سے ملٹری سیکرٹری کا فون آیا تھا کوئی ڈیڑھ گھنٹے پہلے جس میں بھٹو صاحب کی پسند کے کچھ نئے نغمے شامل کرنے کو کہا گیا تھا، ظاہری بات ہے اُن کو ریکارڈنگ وغیرہ کی تکنیک اور مشکلات کا اندازہ نہیں تھا، صدر مملکت کی فرمائش ٹالی بھی نہیں جاسکتی تھی۔ بخاری صاحب سے رابطے کی کوشش کی گئی کہ وہ نئے نغموں کی کمپئرنگ کرسکیں مگر وہ نہیں ملے، سلیم گیلانی صاحب نے فیصلہ کیا کہ اب اس پروگرام کو لائیو (Live) پیش کیا جائے گا اور اس کی کمپئرنگ نیلوفر علیم کریں گی۔

گیلانی صاحب کے اس اعتماد پر جو خوشی مجھے ملی وہ ناقابلِ بیان ہے۔ یہ وہی سید سلیم گیلانی تھے جو ریشماں، مہدی حسن، شہناز بیگم، فریدہ خانم جی جیسے فنکاروں کو سامنے لائے اور ان میں سے کسی کی بھی گائیکی سے مطمئن نہ ہوتے تو دس پندرہ بار بھی ری ٹیک کروانے سے نہ چوکتے۔

☆ ٹیلی ویژن سے آپ کا بلاوا کب اور کس طور آیا۔ آپ نے اندازاً کتنے ڈرامے ٹیلی ویژن پر کیے اور کون سے میڈیم پر کام کرکے آپ کو زیادہ لطف آیا یہاں بھی کچھ انہونے واقعات ضرور گزرے ہوں گے؟

☆☆ ریڈیو پاکستان کراچی کے بزم طلباء سے اسٹوڈیو نمبر 9 کا سفر چند ہفتوں میں طے ہوا۔ ٹی۔وی کے ڈرامہ پروڈیوسر امیر امام صاحب نے ریڈیو پر میرے ڈرامے سنے اور ''میری پسندیدہ کہانی'' میں کاسٹ کرلیا۔ اس طرح چند ماہ میں میں نے ریڈیو اور ٹی۔وی کا سفر اختیار کیا امام صاحب اُن دنوں نامور افسانہ نویسوں کے افسانے اور کہانیاں ڈرامائی شکل میں پیش کررہے تھے۔ یہ افسانہ تھا ''خمارزہر آلود'' افسانہ نگار کا نام ذہن میں نہیں اس کے اگلے ہی ہفتے اے۔ حمید کے مشہور افسانے ''جہاں برف گرتی ہے'' میں امام صاحب نے مجھے پھر کاسٹ کرلیا پھر ''عید کا جوڑا'' اور پھر یہ سلسلہ دراز ہوتا گیا۔

ٹیلی ویژن پر میں نے بہت زیادہ ڈرامے نہیں کیے لیکن جو کیے وہ لوگوں نے بے حد پسند کیے اور یاد رکھا۔ آج تک زیادہ ڈرامے نہ کرنے کی وجہ پڑھائی کی مصروفیت تھی پہلے ڈی جے سائنس کالج کہ جہاں حاضری کم ہونے کی صورت میں فائنل امتحان میں نہیں بیٹھ سکتے تھے اور پھر یونیورسٹی میں Micro کے طویل Practicals جو Miss کرنا بہت مشکل تھا۔

ریڈیو کا اپنا لطف ہے اور ٹی۔وی کا اپنا مزہ لیکن مجھے ریڈیو زیادہ اچھا لگتا تھا کیونکہ یہاں صرف اور صرف اپنی آواز کے ذریعے ہر جذبے ہر کیفیت کا اظہار کرنا ہوتا ہے جو مشکل ہے اور نوجوانی میں مشکل کام انجام دینے کا زیادہ لطف ہے۔

دلچسپ واقعات بے شمار پیش آتے تھے اُن میں سے کچھ کا ذکر میں نے ''کہی ان کہی'' میں کیا ہے لیکن طلعت حسین کو ایک خان صاحب نے ''عید کا جوڑا'' کی آوٹ ڈور شوٹنگ میں پکڑ لیا تھا وہ واقعہ نہیں بھولتا میں اور عرش منیر خالہ شاپنگ کررہے ہیں اور طلعت حسین چھپ چھپ کر ہمارا پیچھا کررہے ہیں۔ چھوٹا سا سائیلنٹ کیمرہ تھا رش کی وجہ سے ری ٹیکس ہورہے تھے۔ خان صاحب نے ایک بار دیکھا دوبار اور پھر تیسری بار جب طلعت ہمارے پیچھے چلے تو اُن سے برداشت نہ ہوا اُنہوں نے طلعت کو جالیا۔ ''خوچہ ام بوت دیر سے تم کو اِن عورت لوگ کا پیچھا کرتا دیکھ رہا ہے۔۔۔تمہارا اماں بہن نہیں ہے؟'' سنجیدہ اور رکھ رکھاؤ والے طلعت حسین اس اُفتاد پر گھبرا گئے عرش منیر خالہ کو اپنی ماں اور مجھے بہن کے درجے پر فائز کردیا مگر پٹھان بھائی صاحب ماننے کے لیے نہ تیار تھے بڑی مشکلوں سے طلعت کی گلوخلاصی ہوئی۔ طلعت آج بھی ملتے ہیں تو پوچھتے ہیں ''بہن جی کیسی ہیں آپ؟''

☆ سنا ہے ''شہروری'' کے مکالمے ''میں بہت بُری آدمی ہوں'' کی شہرت کے بعد آپ کو فلم کی آفر بھی ہوئی تھی؟

☆☆ جی ہاں۔ پرویز ملک صاحب، ضیا سرحدی اور احتشام صاحب نے آفر زدیں تھیں میرے خیال میں ٹی۔وی ڈراموں کی ہیروز کو ایسی پیش کش ہوتی تھیں اور یہ سب اِتنے بڑے نامور فلم ڈائریکٹر تھے کہ جن کے ساتھ کام کرنا اعزاز کی بات تھی۔ اُن کے لیے جنہیں فلم میں کام کرنا تھا ایکٹنگ میرا شوق تھا۔ آج بھی ہے اس کو Proffesion نہیں بنایا۔ میری حد ٹی۔وی تھی بس۔

☆ نیشنل سینٹر کی سب سے کم عمر ڈائریکٹر نے استعفیٰ دینے میں عجلت کا مظاہرہ کیوں کیا۔ کچھ تجربات افسر شاہی کے بھی بتلایئے؟

☆☆ مزاج اور طبیعت کی بات ہوتی ہے، آرٹسٹک مزاج لوگ عموماً نوکری کی پابندیوں میں رہ کر خوش نہیں رہتے۔ چالاکی، سیاست، تین پانچ کرنا میرے مزاج میں نہیں۔ الحمدللہ نوکری کرنا میری ضرورت بھی نہیں رہی، اُس وقت سینٹر والوں کو شاید میری ضرورت تھی مجھے نہیں تو پھر میں دفتری جھمیلوں میں پڑ کر زندگی کے خوبصورت سال ضائع کیوں کرتی، خدانخواستہ معاشی پریشانی یا ضرورت ہوتی تو ناپسندیدگی کے باوجود استعفیٰ نہ دیتی۔

☆ قمر علی عباسی کی جانب سے شادی کی پیشکش پر آپ کا ردِعمل کیا تھا اور کیا آپ بھی پہلے سے اُنہیں پسند کرتی تھیں؟

☆☆ حیرت، خوشی۔۔ میں پسند کرتی تھی اُن کی بذلہ سنجی، ذہانت، خوبصورت گفتگو، خوش مزاجی لیکن یہ سوچ ذہن میں نہیں تھی کہ ان سے شادی ہو

جائے۔

☆ کچھ تفصیل شادی کے حوالے سے بتلایئے۔ سنا ہے! اُس وقت کی خاتونِ اوّل محترمہ نصرت بھٹو بھی شریکِ محفل تھیں؟

☆☆ شہر کراچی میں ہونے والی چند یادگار شادی کی تقریبات میں اسے ایک تھی، اس میں سب بہت خوشی اور دل سے شریک ہوئے تھے۔ انگریزی اُردو صبح شام کے اخباروں، رسالوں اور میڈیا نے اس میں شرکت کی اور زبردست کوریج کی۔ بیگم بھٹو خاتون اوّل نے اس تقریب میں شرکت کر کے اس کے اعزاز وافتخار میں اضافہ کیا۔

☆ نصرت بھٹو صاحبہ سے قریبی تعلق اور الیکشن ٹرانسمیشن کی میزبانی کے باوجود آپ نے سیاست میں کوئی رول کیوں نہ ادا کیا؟

☆☆ پاکستان میں عموماً سیاست کا مطلب شارٹ کٹ سے اقتدار اور دولت کا حصول سمجھا جاتا ہے، مجھے اس طرح کی سیاست سے کوئی دلچسپی نہیں۔

☆ آپ کے دل میں غریبوں کے لیے جو خصوصی محبت اور تڑپ ہے اُس کا عملی مظاہرہ نظر نہیں آتا۔ شوبز کے بعد سیاست نہ سہی سماجی میدان میں سرگرم رہا جاسکتا تھا؟

☆☆ میری والدہ Apwa (اپوا) کی بنیادی ممبران میں سے تھیں میں نے بچپن سے اُنہیں سماجی خدمت میں مصروف دیکھا اُن کی ساتھیوں میں جہاں بہت اچھی خواتین تھیں وہیں کچھ ایسی بیگمات بھی تھیں جو ایک سلائی مشین کا عطیہ کسی بیوہ خاتون کو دے کر دس جگہ اپنی تصویر چھپوانا چاہتی تھیں۔ مجھے یہ اچھا نہیں لگتا تھا، اسلام میں بھی ہے کہ اگر ایک ہاتھ سے دو تو دوسرے ہاتھ کو خبر نہ ہونے دو۔ امریکہ میں اچھی بات یہ ہے کہ ہر سطح پر لوگ اپنی حیثیت کے مطابق سماجی کام کرتے اور Donations دیتے ہیں مگر نہ اس کی تشہیر چاہتے ہیں نہ اس کو کوئی کمال کی بات سمجھتے ہیں۔

☆ مطالعے کے حوالے سے شوبز کے لوگ کم کم ہی نظروں میں آتے ہیں۔ آپ کے ہاں کیا صورت حال ہے یعنی آپ کس قسم کی کتب پڑھنا پسند کرتی ہیں اور آپ کے پسندیدہ قلم کار کون ہیں؟

☆☆ مجھے ناول اور افسانے پڑھنے کے علاوہ سوانح عمری (خودنوشت) پڑھنے کا بہت شوق ہے۔ پسندیدہ قلم کار بہت سے ہیں لیکن کرشن چندر، عصمت چغتائی، منٹو، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، رضیہ فصیح احمد، راجندر سنگھ بیدی، سلطان جمیل نسیم کو بہت شوق سے پڑھا۔ نوعمری سے شفیق الرحمٰن کے سحر میں گرفتار رہی۔ شعراء میں فیضؔ، منیر نیازی، جون ایلیا، عالی جی پسند ہیں۔ مرزا غالب سے بھلا کون متاثر نہ ہوگا۔

سوانح عمری کسی کی بھی ہو پڑھتی ہوں کچھ نہ کچھ نیا جاننے کا موقع ملتا ہے، بیگم حمیدہ اختر حسین رائے پوری کی سوانح عمری کا انداز بہت سادہ اور دلکش لگا، ادا جعفری کی سوانح ''جو رہی سو بے خبری رہی'' بھی بہت خوب ہے۔ نیلم بشیر کی ''چار چاند'' انوکھا انداز لیے وہ آخری سوانح ہے جو ۲۰۱۲ء میں پڑھی۔ اس کے علاوہ سائنسدانوں اور موجدوں کی سوانح بھی شوق سے پڑھتی ہوں سابق صدر انڈیا ڈاکٹر عبدالکلام کی سوانح سے جانا کہ ایک غریب گاؤں کا لڑکا کس طرح ایک بڑے ملک کا صدر بن سکتا ہے۔

☆ شنید یہ ہے کہ آپ کو عباسی صاحب کے سفرنامے بہت پسند ہیں۔ عباسی صاحب کے علاوہ آپ نے کن سفرنامہ نگاروں کو پڑھا ہے اور عباسی صاحب کو اوّلیت دینے کے اسباب کیا ہیں؟

☆☆ جی بہت پسند ہیں۔ اُن کی تحریر میں زندگی کی حرارت، محبت اور حسن رچا بسا ملتا ہے۔ میں نے ابنِ بطوطہ سے لے کر دورِ جدید کے مستنصر حسین تارڑ تک کے سفرنامے پڑھے ہیں، اے۔ حمید، جمیل الدین عالی، ابنِ انشاء، شفیق الرحمٰن، مجتبیٰ حسین، عطاالحق قاسمی، رضا علی عابدی، رفیق ڈوگر، ڈاکٹر ایس۔ ایم۔ معین قریشی، رضوان صدیقی، فردوس حیدر، پروین عاطف، انجم انصار، کشور ناہید سب کے سفرنامے میری لائبریری میں موجود ہیں۔ فہرست طویل ہے سب نام لکھنا ممکن نہیں۔ عباسی صاحب پسندیدہ ترین اس لیے ہیں کہ اُن کے ساتھ میں تقریباً ہر سفر میں ہوتی ہوں۔ وہ دنیا کو جس طرح دیکھتے ہیں اور عام سے منظر یا سچوئیشن کی جس طرح تصویر کشی کرتے ہیں وہ حیرت انگیز ہے، میں سوچتی ہوں میں نے بھی یہ سب دیکھا تھا مجھے ایسا کیوں نظر نہیں آیا؟

☆ کچھ دنوں سے آپ کا رجحان لکھنے کی جانب مائل ہے جس کا بڑا ثبوت آپ کے حالاتِ زندگی پر تحریر کردہ کتاب ''کہی ان کہی'' ہے۔ اس کے علاوہ اور کیا کچھ لکھ رہی ہیں یا لکھنے کا ارادہ ہے؟

☆☆ ''کہی ان کہی'' کی جس طرح پذیرائی ہوئی وہ میرے لیے بے حد حوصلہ افزا ہے۔ ڈاکٹر محمد علی صدیقی، ڈاکٹر اسلم فرّخی، آصف فرخی، امجد اسلام امجد، سحر انصاری اور عطاء الحق قاسمی جیسے قد وقامت والے نقادوں اور ادباء نے جس طرح پذیرائی کی اُس کے بعد دل تو چاہتا ہے کہ اور لکھوں۔۔۔ کیا؟ افسانہ کہانی یا خاکہ نگاری پر طبع آزمائی کروں؟

☆ سوال پرانا مگر اہمیت کا حامل ہے کہ ایک چھت کے نیچے دو بڑے فنکار شریکِ زندگی ہوں تو کس قسم کے مسائل جنم لیا کرتے ہیں؟

☆☆ ''بڑے فنکار'' اگر آپ نے مجھے اور قمر علی عباسی کو کہنا ہے تو ذرہ نوازی، پہلی اور سچی بات تو یہ کہ ہم نے کبھی اپنے آپ کو بڑا نہیں جانا جو کچھ اللہ نے دیا ایک عام انسان کی حیثیت سے بہت زیادہ بڑھ کر دیا۔ ہم نے ایک دوسرے کی صلاحیتوں (جتنی بھی ہیں) کا اعتراف، احترام کیا اور ان پر ہمیشہ پسندیدگی کا اظہار کیا اس لیے کبھی کسی مسئلے نے جنم نہیں لیا۔

☆ سنا ہے! آپ امریکہ میں ٹیلی ویژن، اخبار اور سماجی تقاریب میں بہت مصروف ہوتی ہیں۔ اس حوالے سے کچھ تفصیل ہمارے قارئین کو بتلایئے؟

☆☆ نیویارک میں پاکستانی کمیونٹی بہت فعال ہے۔ ادبی اور سماجی

تقریبات بے اندازہ منعقد ہوتی ہیں ان میں سے بیشتر کا معیار اعلیٰ ہوتا ہے مجھے خوشی ہے کہ امریکہ آنے کے فوراً بعد مجھے اور قمر علی عباسی کو جو اپنائیت اور محبت کمیونٹی سے ملی وہ نہایت خوشگوار تھی۔

تقریبات کی صدارت قمر علی عباسی کو اور نظامت مجھے سونپی گئیں جنہیں ہم نے احسن طریقے سے نبھانے کی کوشش کی۔ اگر میں نے ان کی ذراسی بھی تفصیل بتانی شروع کی تو کئی صفحے درکار ہوں گے اُمید ہے کسی شمارے میں آپ مجھے ایک مضمون کی شکل میں اس سوال کا جواب دینے کی اجازت مرحمت فرمائیں گے۔

☆ تجربے کی بات ہے کہ شوبز سے وابستہ خواتین اُس قدر اچھی بیوی، ماں اور خاتونِ خانہ ثابت نہیں ہوتیں جس قدر اُن کی ذمہ داریاں متقاضی ہوتی ہیں۔ آپ کے اہلِ خانہ اس بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں؟

☆☆ مجھے اس بات سے ذرا اختلاف ہے کیونکہ بعض خواتین جو نہ شوبز سے تعلق رکھتی ہیں اور نہ ورکنگ ویمن ہوتی ہیں وہ بھی کامیاب خاتونِ خانہ ثابت نہیں ہوتی ہیں۔ اہل خانہ کو الحمدللہ کوئی شکایت نہیں میں نے ہمیشہ کوشش کی ہے کہ جو وقت جس کا حق ہے اُس کو دے پاؤں۔ میں نے بچوں اور شوہر کی کمپنی کو اور انہوں نے میرے ساتھ کو انجوائے کیا۔

☆ اگر کوئی معقول شخص یا ادارہ آپ کو پاکستان سے شوبز میں مدعو کرے تو آپ کا ردِعمل کیا ہوگا؟

☆☆ مثبت ردِعمل۔ جب بھی پاکستان جاتی ہوں چینلز اور پروڈیوسرز ڈراموں میں کام کرنے کے لیے بات کرتے ہیں جن پر میں اُن کی مشکور ہوں لیکن اس کے لیے وہاں رکنا اور وقت دینا ضروری ہے جس کے لیے ایک معقول Planning کی ضرورت ہوگی۔

☆ امریکی معاشرے کا پاکستانی معاشرے سے تقابل کیا جائے تو نتائج کیا نکلتے ہیں۔ کیا آپ امریکی معاشرے میں اپنا اور اپنے بچوں کا مستقبل محفوظ سمجھتی ہیں؟

☆☆ امریکی اور پاکستانی معاشرے بالکل جدا ہیں۔ ہم ہزاروں برس پرانی تہذیب کے امین ہیں جبکہ امریکی معاشرت محض صدیوں پر محیط ہے۔ مگر انہوں نے بہت سے وہ اصول اپنائے ہیں جو اسلام ہمیں بتاتا ہے۔ ایمانداری، جھوٹ نہ بولنا، ہمسایوں کا خیال کرنا، حسن سلوک، عام امریکن خوش مزاجی اور دوستی کا رویہ اپنائے رہتے ہیں ہمارے مشترکہ خاندانی نظام کے متعلق تفصیل جانتے ہیں تو پسندیدگی کا اظہار کرتے ہیں۔ ہر سہولت کے ہوتے ہوئے تنہائی کے احساس کا شکار نظر آتے ہیں۔

دنیا جو کہ اب گلوبل ولیج ہے وہاں تقریباً ہر معاشرے میں جو بے یقینی کی فضا ہے اُس میں کیا امریکہ کیا کوئی اور ملک کہیں بھی کسی کے محفوظ مستقبل کی کیا ضمانت ہے۔

☆

میں نے نیلوفر علیم کی آواز ریڈیو پر سنی تھی اور آج پہلی بار ملاقات ہو رہی تھی، اُنہوں نے مجھے سلام کیا۔ کنور آفتاب نے بتایا کہ ''عید کا جوڑا'' میں یہ مرکزی کردار ادا کر رہی ہیں، چند رسمی باتوں کے بعد ریہرسل شروع ہوئی تمام فنکار اسکرپٹ سے اپنے مکالمے پڑھنے لگے۔ مجھے نیلوفر علیم کی آواز اور ادائیگی بہت اچھی لگی۔ ایک ہفتے بعد عید کا چاند ہوا اور ٹیلی ویژن پر میرے ڈرامے ''عید کا جوڑا'' کا ٹیلیپ چلنے لگا اور پھر عید کی رات ڈرامہ نشر ہونا شروع ہوا، میں نے اسکرین کی طرف دیکھ رہی تھی یقین نہیں آتا تھا کہ میرے لکھے ہوئے بے جان جملے زندگی سے کتنے بھرپور تھے اس میں سب ٹیلی ویژن کے منجھے ہوئے آرٹسٹ تھے۔ ایسا لگتا تھا نیلوفر علیم نہ جانے کتنے ڈراموں میں حصہ لے چکی ہیں حالانکہ ٹی۔وی پر یہ اُن کا محض تیسرا ڈرامہ تھا اُن کی ادائیگی، آواز کا زیر و بم اور ایکشن سے لمحے بھر کو احساس نہیں ہوتا تھا کہ اسکرین پر ایک ڈرامہ نشر ہو رہا ہے۔ ہر کردار حقیقی محسوس ہوتا تھا، سچ پوچھیں تو اس پورے ڈرامے میں جس نے سب سے زیادہ رنگ بھرا وہ نیلوفر علیم تھیں۔

شمع پرویز (امریکہ)

آج ہم عہد حاضر کی ایک ایسی ہمہ جہت شخصیت کے بارے میں بات کر رہے ہیں جن کی شخصیت کے مختلف پہلو ہیں اور ہر پہلو اپنی جگہ انفرادیت رکھتا ہے وہ اداکاری، صداکاری اور کمپیرنگ میں اپنا لوہا منوا چکی ہیں۔ یہ شخصیت ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی مشہور و معروف آرٹسٹ نیلوفر عباسی ہیں۔ ریڈیو اور ٹی۔ وی کے لیے نیلوفر کی بیش بہا خدمات ہیں۔ ریڈیو پاکستان میں صبح کا شوصبح نو کے عنوان سے کئی سالوں تک چلا۔ پاکستان ٹی۔وی میں حسینہ معین کے ڈرامے ''شہ زوری'' نے تہلکہ مچادیا۔ حسینہ معین کے ڈرامے چاہے وہ ٹی وی کے ہوں یا ریڈیو کے نیلوفر کا نام کامیابی کی ضمانت سمجھا جاتا تھا۔ نیلوفر کی دلکش اور خوبصورت آواز ہر تقریب کو ایک رونق بخشتی ہے۔ خواہ وہ ادبی محفلیں ہوں، پروگراموں کی نظامت ہو یا میلاد میں سیرت کی محفل ہو۔ نیلوفر کی بے ساختہ فطری اور پختہ صداکاری ان محفلوں کو چار چاند لگادیتی ہے۔ اب وہ صداکار اور اداکار ہونے کے علاوہ صاحبِ قلم بھی بن گئیں ہیں۔ انہوں نے اپنی کتاب ''کہی ان کہی'' میں لمحوں، موسموں اور محبتوں کو یکجا کر دکھایا ہے۔ اُن کا انداز، بے ساختہ، رواں اور دلچسپ ہے جو قارئین کی توجہ ایک لمحہ کے لیے بھی کتاب سے ہٹنے نہیں دیتا۔

مسز پروین سلطان (نیویارک)

''میری نیلو باجی''

ڈاکٹر آصف فرخی
(کراچی)

بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کا نام محض محاورے کے طور پر نہیں بلکہ صحیح معنوں میں بچے بچے کی زبان پر آجاتا ہے، وہ بھی ایسی ہی شخصیت کی حامل ہیں۔ شہرت اور کامیابی نے اُن کے قدم چومے اور ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے وہ ایسی نامور ہستی بن گئیں جن کی شاید اُس وقت تک کوئی اور مثال نہیں تھی۔ شہرت کا یہ آفتاب اب بھی نہیں ڈھلا ہے اور وہ جہاں سے گزرتی ہیں لوگ پہچان جاتے ہیں اور ذکر کرتے ہیں دیکھو۔۔۔ وہ ہیں نیلوفر عباسی۔۔۔ ٹی وی کی مشہور و معروف فنکارہ جو کسی زمانے میں نیلوفر علیم ہوا کرتی تھیں۔ اس کے باوجود میں اُن کا ذکر صرف ذاتی حوالے سے کروں گا اس لیے کہ پاکستان ٹیلی ویژن کے نامور اور قابل قدر فنکار تو اور بھی ہیں لیکن باجی صرف ایک ہی ہیں۔ ''میری نیلو باجی''۔

ریڈیو، ٹیلی ویژن کی دنیا میں وہ اپنی منفرد آواز اور فنکارانہ انداز کے لیے جانی پہچانی جاتی ہیں مگر گھر میں وہ ہمارے لیے نیلو باجی ہی تھیں اور ان کو اسی نام سے پکارا جاتا تھا۔ اُن کی امّی ان کو نیلو کے نام سے پکارتی تھیں اور باقی سارے کزنز کے لیے اس میں باجی کا اضافہ ہو گیا شاید اس لیے کہ میرے چچا اور پھپھیاں اپنی بڑی بہن کو ''باجی'' کے نام سے پکارتے تھے، وہ میرے والد ڈاکٹر اسلم فرخی کی چھوٹی بہن تھیں اور اپنے سارے بہن بھائیوں سے زیادہ عزیز، دونوں اوپر تلے کے بہن بھائی تھے اس لیے لاگ ڈانٹ بھی زیادہ تھی اور قربت بھی۔ کبھی دونوں کسی محفل میں ساتھ ہو جاتے تو اپنے بچپن کی باتیں سنانے بیٹھ جاتے۔ یادوں کی پٹاری کھُل جاتی اور اس میں سے باتوں کا خزینہ برآمد ہونے لگتا، پرانے قصّے، اس وقت کے لوگ وہ باتیں جن پر خوب ہنسی آتی تھی چھوٹی چھوٹی شرارتیں اور گھر کے لوگوں کا تذکرہ، میری پھوپھی کو اصل میں ایسی باتیں کرنے میں مزہ بھی خوب آتا تھا۔ وہ بڑی دلچسپ باتیں کرتی تھیں اور بہت لطف کے ساتھ ایسی باتیں دہرایا کرتی تھیں۔ اسی لیے وہ اپنے بہن بھائیوں ہی میں نہیں سارے خاندان میں مقبول تھیں۔ وہ تعلقات نبھانا بھی جانتی تھیں اور اپنے مزاج کے اعتبار سے ملنسار اور خلیق بھی تھیں۔ کبھی وہ اپنے گھر پر کھانے کا اہتمام کر رہیں اور کبھی سارے بچوں کو جمع کر کے پکچر دکھانے لے جا رہی ہیں۔ اس لیے پاکستان چوک میں اُن کا گھر ہمارے لیے خاص اہمیت رکھتا تھا۔

وہ میرے ساتھ بے حد محبت کا برتاؤ کرتی تھیں۔ میری سالگرہ کا دن خاص طور پر یاد رکھتی تھیں اور یہ ناممکن تھا کہ وہ دن آ کر گذر جائے اور اُن کی خلوص و محبت سے بھری مبارکباد موصول نہ ہو۔ مجھے جن کھانوں کا شوق تھا وہ بڑے اہتمام سے پکاتی تھیں۔ مجھے یاد ہے ایک بار میں بہت بیمار پڑا تھا (غالباً ٹائیفائیڈ ہو گیا تھا) اور کھانے پینے کا سخت پرہیز تھا۔ میرا دل طرح طرح کے کھانوں کے لیے مچلتا اُنہوں نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ ڈاکٹر اجازت دے دے تو وہ مجھے اپنے ہاتھ سے شاہی ٹکڑے پکا کر کھلائیں گی۔ مجھے آج بھی اُن کے شاہی ٹکڑوں کا ذائقہ یاد ہے۔

نیلو باجی کے والد یعنی میرے پھوپھا کو میرے والدِ علیم صاحب کہہ کر پکارتے تھے کیونکہ بہن سے شادی سے پہلے وہ میرے والد کے دوست تھے اور اُن کا یہ خصوصی تعلق آخر تک برقرار رہا اپنے والد کی دیکھا دیکھی میں بھی ''علیم صاحب'' ہی کہتا تھا پھوپھا نہیں۔ علیم صاحب دوسرے لوگوں کے سامنے کم آمیز تھے اور محفلوں میں شرکت سے گریز کرتے تھے لیکن پھوپھی کی طرح وہ بھی مجھ سے بہت محبت کا برتاؤ کرتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ وہ اپنی پسندیدہ کتابوں اور مصنفوں کے بارے میں خوب باتیں کرتے تھے اُن کو آرایل ایسٹونس بہت پسند تھا اور خاص طور پر اُس کے انشائیے، اُن کے کہنے سے میں نے وہ کتاب پڑھی اور ایک زمانے تک اُس کا گرویدہ رہا۔ ایک مختصر سی علالت کے بعد علیم صاحب اس دنیا سے چلے گئے اور مجھے آج بھی یاد ہے کہ اپنے مختصر سے خاندان کے لیے اُن کی ناگہانی موت کتنا بڑا صدمہ بن کر سامنے آئی ایسا صدمہ جس کا اثر سارے خاندان پر عرصۂ دراز تک محسوس کیا گیا۔

ان محبت کرنے والے اور جان چھڑکنے والے پھوپھی پھوپھا کی لاڈلی بیٹی نیلوفر ہمارے لیے نیلو باجی تھیں اور اسی خلوص و محبت کا پیکر جس کا نقش ان کے والدین نے قائم کیا تھا اور جس کی خوشبو سے میری مشام جاں آج تک سرشار چلی آ رہی ہے۔

نیلو باجی مجھ سے بڑی تھیں لیکن اُن میں گھل مل جانے اور اپنائیت سے باتیں کرنے کی وہ خاص عادت تھی جو یقیناً اُن کو میری پھوپھی سے ورثے میں ملی تھی۔ بچپن میں ہم اُن کے گھر جاتے تو وہ بہت خاطر تواضع کرتیں، طرح طرح کی چیزیں منگوائی جاتیں اور کھانے پینے کا خوب اہتمام ہوتا۔ ہماری پھوپھی کھانے پینے کی شوقین تھیں لیکن دوسرے کو کھلا کر زیادہ خوش ہوتی تھیں۔ نیلو باجی میری پسند کی مٹھائی دُکان سے منگوانا کبھی نہ بھولتیں۔

نیلو باجی کی اور میری ایک دلچسپی مشترک تھی اور وہ تھی ''بچوں کی کتابیں''۔ مجھے آج بھی نیلو باجی کے کمرے میں پلنگ کے ساتھ دیوار میں بنی ہوئی وہ الماری یاد ہے جس میں بچوں کے رسالے اور کتابیں جمع رہتے تھے وہ ''بچوں کی دنیا'' اور ''تعلیم و تربیت'' جیسے رسالے پڑھتی تھیں لیکن سب سے خاص بات یہ کہ اُن کے پاس کرشن چندر کی ''چڑیوں کی الف لیلہ'' کا پورا سیٹ

تھا۔ وہ ان کتابوں کی حفاظت اپنی جان سے بھی زیادہ کرتی تھیں لیکن مجھ کو خاص طور پر وہ کتابیں پڑھنے کے لیے دیتیں۔ میں نے ایک ایک کر کے وہ پڑھ ڈالیں اور بے حد متاثر ہوا پھر اُنہوں نے مجھے اُلٹا درخت اور چالاک خرگوش کے کارنامے پڑھنے کو دیئے۔ میرے ذہن پر ان کتابوں کے ان مٹ نقوش آج بھی واضح ہیں۔ نہ میں اِن کتابوں کو بھول سکتا ہوں اور نہ ان کتابوں کی فراہمی کا ذریعہ بننے والی مہربان ہستی کو۔

نیلو باجی نے جب کراچی یونیورسٹی میں داخلہ لیا تو وہ امتحان کے دنوں میں کبھی کبھار ہمارے یہاں آ جاتی تھیں۔ ہم یونیورسٹی کیمپس میں رہتے تھے اور یہ خیال تھا کہ اس طرح اُن کو آنے جانے میں مشکل نہیں ہوگی۔ پڑھائی کے لیے زیادہ وقت مل جائے گا۔ وہ پڑھتی تو بہت دل لگا کر تھیں لیکن پڑھنے کے وقفوں میں ان سے باتیں کرنے کا خوب موقع مل جاتا تھا اور پھر وہ باتیں بھی ایسی مزے دار کرتی تھیں۔ یونیورسٹی کے قصّے، ریڈیو اسٹیشن کی باتیں اور خاندان کے لوگوں کا تذکرہ، معمولی باتوں کو بھی نیلو باجی اس طرح بیان کرتی تھیں کہ سننے میں مزہ آنے لگتا۔

مجھے آج بھی یاد ہے کہ کالج کے دنوں میں شرارت کے قصّے سنایا کرتی تھیں خاص طور پر اپنی اُستاد پروفیسر ڈاکٹر بخش کے قصّے جن کی قابلیت کے ساتھ ساتھ غائب دماغی لڑکیوں کو بہت محظوظ کرتی تھی۔ صحن کے پاس تخت پر وہ بیٹھ جاتیں اور ایسے مزے مزے کے قصّے سنائے جاتیں۔ یہاں تک کہ کوئی آواز لگاتا ''نیلو باجی کو تنگ نہ کرو۔۔۔ انہیں پڑھنے دو!''

اسکول کا امتحان پاس کرنے کے بعد جب میں کالج آیا تو مجھے داخلہ اُسی ڈی۔ جے کالج میں ملا جہاں سے نیلو باجی نے پڑھا تھا۔ پھر یہ کالج ان کے گھر کے پاس تھا۔ مجھے جب بھی فری پیریڈ ملتا میں اُن کے گھر چلا جاتا۔ نیلو باجی نے مائیکرو بائیولوجی پڑھی تھی اور مجھے یاد ہے کہ ڈی۔ جے کالج کے اساتذہ خاص طور سے مسز میڈورا کا ذکر کرتی تھیں جن کو میں نے بھی دور سے دیکھا تھا۔ خاصی رعب دار شخصیت تھی اور ہم جیسے جونیئر طالب علموں کی کیا مجال کہ ان سے بات بھی کر لیں۔ نیلو باجی کے اساتذہ اور نیلو باجی کی سہیلیاں ہمارے لیے کہانیوں کی حیرت ناک مخلوق کا سا درجہ رکھتے تھے جیسے وہ اس زمین پر چلتے نہ ہوں بلکہ ہواؤں میں اُڑتے رہنے کے عادی ہوں۔

اسی زمانے میں نیلو باجی نے ریڈیو کے ذریعے سے افسانوی شہرت حاصل کر لی جس میں بہت اضافہ اس وقت ہوا جب ٹیلی ویژن نے ان کا نام گھر گھر پہنچا دیا لیکن اس بے اندازہ شہرت کے باوجود نیلو باجی کے مزاج میں کوئی تبدیلی نہیں آئی وہ اُسی بے تکلفی اور اتنی ہی دلچسپی سے باتیں کرتیں بلکہ اب تو ان کے پاس ٹیلی ویژن کے بہت سے واقعات تھے جن کو وہ ہنس ہنس کر سنایا کرتی تھیں۔

ہمارے ایک رشتے دار کو ڈراموں میں پارٹ کرنے کا بہت شوق تھا چاہے کتنا ہی معمولی پارٹ نہ ہو۔ آخر ایک دن نیلو باجی ان کو ٹیلی ویژن اسٹیشن لے گئیں جہاں اُنہوں نے ایک ڈرامے میں گھوڑے والے کا کردار ادا کیا۔ اس کا کام گھوڑے کو بس ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانا ہوتا ہے۔ اُنہوں نے اپنی اداکاری کے یہ جوہر دکھائے اور اس کامیابی پر پھولے نہ سمائے مگر ہمارا ہنس ہنس کر بُرا حال ہو گیا اور نیلو باجی کے ساتھ اس گھوڑے والے کے بارے میں مذاق بہت دن تک چلتا رہا۔

نیلو باجی کی شادی بھی مجھے خوب اچھی طرح یاد ہے کہ اس میں بڑی یادگار تقریبات ہوئی تھیں بہت مدت کے بعد نیلو باجی کی خودنوشت میں ان واقعات کا تذکرہ پڑھا تو ان کی یاد تازہ ہو گئی یہ میرے لڑکپن کی بہت خوشگوار یادیں ہیں۔

زندگی کا سفر جاری رہا اور نیلو باجی آگے آگے بڑھتی رہیں۔ طالب علمی کے زمانے میں مجھے بھی ریڈیو کا بہت شوق تھا۔ بچپن میں اسٹوڈیو نمبر ۹ کے ڈرامے بہت اشتیاق کے ساتھ سُنے جاتے تھے پھر اسکول براڈ کاسٹ اور بزم طلباء میں شرکت کا موقع ملا مجھ سے پہلے نیلو باجی کی شہرت وہاں پہنچ چکی تھی۔ ریڈیو اسٹیشن میں کبھی کبھار ہماری ملاقات ہو جاتی اور مجھے اندازہ ہوا کہ نیلو باجی تمام تر شہرت کے باوجود اپنے اخلاق کی وجہ سے وہاں کے عملے میں احترام کی نظر سے دیکھی جاتی تھیں انہوں نے خاندانی روایات کی پاسداری کی اور ان کا ذکر ہمیشہ اچھے الفاظ میں کیا جاتا تھا۔

نیلو باجی نے ان باتوں کو خاص طور سے نبھایا۔ میں نے ابھی ذکر کیا تھا کہ میری سالگرہ کے دن میری پھوپھی فون ضرور کیا کرتی تھیں وہ دنیا سے چلی گئیں مگر یہ رسم ابھی تک باقی ہے کیونکہ اس دن نیلو باجی کا فون آتا ہے اور یوں یہ سلسلہ ٹوٹنے نہیں پاتا۔

بچپن اور لڑکپن کے وہ دن خواب وخیال ہو گئے۔ بہت سے چہرے مہربان اور مشفق چہرے رخصت ہو گئے جن گلیوں، محلوں میں وہ گھر آباد تھے تبدیلی کے عمل سے گذر کر نامانوس اور اجنبی بن گئی ہیں لیکن ان دنوں کی یادوں سے جگمگاتا ہوا ایک چہرہ ابھی اُسی طرح روشن اور تابناک ہے اور اس چہرے کے پیچھے وہی من موہنی شخصیت ہے ''میری نیلو باجی''۔

○

محترمہ نیلوفر عباسی نے فنونِ لطیفہ کو جو وقار، اعتبار اور رونق بخشی ہے اُس کے باعث یہ شعبہ پہلے سے کہیں زیادہ اعتبار کا حامل اور اشتیاق کا مرکز بن گیا ہے۔

احمد ندیم قاسمی (●)

''فنونِ لطیفہ کی تاجدار''

مسز انجم خلیل (نیویارک)

نیلوفر علیم عباسی کا شمار ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے ان فنکاروں میں ہوتا ہے جنھوں نے اس فیلڈ میں نئی روایات کو جنم دیا۔ ایک ایسا راستہ بنایا جس پر ٹیلی ویژن ہی نہیں فلم کے فنکار بھی گامزن ہوئے اور کامیابی حاصل کی۔

ایک زمانہ تھا جب پاکستان میں لوگوں کو ان کے ڈرامے کا انتظار رہتا تھا۔ ان کے ڈرامے لوگ دیکھنے کے لیے باقاعدہ اہتمام کیا کرتے تھے۔ خصوصاً عید کا موقع ایسا ہوتا تھا جب لوگ ان کا ڈرامہ دیکھ کر عید کا لطف دوبالا کرتے۔ کیونکہ اکثر عید کے موقع پر ان کا کوئی نہ کوئی ڈرامہ آن ائیر ہوتا تھا۔

اُس وقت تو کمال ہو گیا جب ان کی منی ٹی۔ وی سیریل ''شہزوری'' ٹیلی ویژن سے نشر ہوئی۔ پہلے ہی Episode کے بعد یہ ڈرامہ اس قدر پسند کیا جانے لگا کہ اس ڈرامے کو دیکھنے کے لیے لوگ اپنے سب کام چھوڑ کر ٹی۔ وی کے سامنے بیٹھ جایا کرتے تھے۔ اس سیریل کی صرف سات (۷) قسطیں تھیں لیکن گزشتہ چالیس (۴۰) سال سے اس کی مقبولیت اور پسندیدگی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ یہ سیریل دنیا بھر میں جہاں اردو کے پروگرام نشر ہوتے ہیں دیکھایا گیا۔ پچھلے دنوں ایک خاتون بلقیس بانو بوچہ ماریشیس سے آئی تھیں ٹیلی ویژن کے پروگراموں پر بات کرتے ہوئے انھوں نے بتایا کہ لوگوں کی فرمائش پر ماریشیس ٹی۔ وی پر اردو ٹرانسمیشن میں ''شہزوری'' کئی بار ٹیلی کاسٹ کیا گیا۔

اس ڈرامے کے ایک جملے ''میں بہت بُری آدمی ہوں'' نے اتنی شہرت پائی کہ فلم ''انمول'' کی کہانی کے اسکرپٹ میں اس جملے کو شامل کیا گیا۔ اور فلم ''انمول'' میں یہ جملہ فلمسٹار شبنم نے ادا کیا۔ جس نے فلم کے منظر میں ایک جان ڈال دی۔ فلم میں شبنم کا وہی کردار تھا جو شہزوری میں نیلوفر علیم عباسی کا تھا۔

سیریل شہزوری نے ٹیلی ویژن کے کئی سیریلز پر گہرا اثر ڈالا۔ ٹیلی ویژن کی کئی فنکارائیں اسی انداز میں اداکاری کر کے مقبول ہوئیں۔ گویا نیلوفر عباسی کا یہ کردار شہرت اور مقبولیت کا سمبل بن گیا۔ رائٹر حسینہ معین کی یہ پہلی ٹی۔ وی سیریل تھی جس نے انہیں ٹی۔ وی پر کامیابی کا زینہ دکھایا۔ شہزوری نے پاکستان ٹیلی ویژن کی تاریخ لکھی۔

نیلوفر نے پاکستان ٹیلی ویژن کے لیے کافی سیریل کیے جن میں ''عروسہ'' بھی بہت مقبول ہوا۔ اس کے علاوہ ''نقش فریادی''، ''ہٹ پریڈ''، ''پیسے کا معاملہ'' رومی اور بہادر علی میں اپنی اداکاری کے جوہر دکھائے۔ یہ تمام سیریلز مقبول ہوئیں۔ نیلوفر نے کئی ایسے ڈراموں میں مرکزی رول ادا کیے جو یادگار بن گئے۔ ان میں ''خمار زبر آلود'' ''جہاں برف گرتی ہے''، ''مولا پہلوان''، ''نیا راستہ''، ''کالی بلی''، ''عید کا جوڑا''، ''پہلی عید مبارک''، ''بردہ فروش''، ''کرن رنگ حنا کی''، ''جملہ حقوق محفوظ''، ''راکھ'' اور ''رگ سنگ'' نیلوفر کے ان ڈراموں میں شامل ہیں جو اداکاری کے لحاظ سے بے مثال ہیں۔

نیلوفر عباسی نے کئی پرگراموں کی میزبانی بھی کی ہے جن میں معین اختر کے ساتھ ''سات رنگ'' خاص طور سے قابل ذکر ہے۔ اس کے علاوہ کوئز پروگرام سوجھ بوجھ بھی بے حد مقبول ہوا تھا اس کے علاوہ انھوں نے موسیقی کے کئی ممتاز اور شہکار پروگراموں کی میزبانی بھی کی ہے۔ نیلوفر نے پاکستان کے الیکشن کے سلسلے میں ہونے والی خصوصی ٹرانسمیشن کی میزبانی بھی نہایت خوبی سے کی۔ نیلوفر علیم عباسی کو پاکستان ٹیلی ویژن کی سلور جوبلی کے موقع پر بہترین فنکارہ کے ایوارڈ سے نوازا گیا۔ نیلوفر ریڈیو کی ایک منفرد، دلکش اور پرکشش آواز ہیں جنھوں نے ریڈیو پر ان گنت پروگرام پیش کیے۔ بے شمار ڈراموں میں حصہ لیا۔ ریڈیو پاکستان کی گولڈن جوبلی کے موقع پر انہیں بہترین صداکارہ کا ایوارڈ بھی دیا گیا۔

نیلوفر نے اپنی فنکارانہ زندگی میں بے شمار ایوارڈز اور اعزازات حاصل کیے ہیں جو انہیں پاکستان، امریکہ، کینیڈا اور ماریشیس سے ملے۔

پاکستان سے امریکہ آ جانے کے بعد انھوں نے یہاں بھی ٹیلی ویژن پر اپنی سرگرمیاں جاری رکھیں اور آج بھی نیویارک کی ادبی، معاشرتی، سماجی اور مذہبی تقریبات میں ان کی میزبانی کو اہمیت دی جاتی ہے۔

نیلوفر نے اپنی زندگی اور فنکارانہ دور کی داستان اپنی کتاب ''کہی ان کہی'' میں شامل کر دی۔ یہ کسی فنکار کی پہلی کتاب ہے جس میں وہ نہ صرف اپنے بارے بلکہ ساتھی فنکاروں، ہدایت کاروں اور مصنفوں کے بارے میں بات کر رہی ہیں۔ کتنے لوگ جو آج ہم میں نہیں ہیں معین اختر، سلیم ناصر، محمود علی، رشید عمر تھانوی، سبحانی بایونس، سلیم گیلانی، مہدی حسن کے تذکرے اس میں شامل ہیں اور وہ لوگ بھی شامل ہیں جو آج بھی رونقِ محفل ہیں جیسے انور مقصود، شکیل، قاضی واجد، بشریٰ انصاری، عظمیٰ گیلانی، حسینہ معین، قاسم جلالی، زینت یاسمین، مشی خان، ظہیر خان، عظیم سرور، یاور مہدی، منور سعید اور عمر شریف۔ یہ سب کہی ان کہی کے صفحات میں ملتے ہیں۔ یہ کتاب اہمیت کی حامل یوں بھی ہے کہ اس میں ایک فنکارہ کی اپنی زندگی کی کہانی ہے۔ اُن اداروں کی باتیں جو روایات، ثقافت اور ادب کے مرکز ہیں۔ جن سے قوموں کی شناخت ہوتی ہے۔ ''کہی ان کہی'' پاکستان کے الیکٹرونک میڈیا کی ایک پوری تاریخ ہے ایک ایسی تاریخ جو ایک اہم دستاویز ہے جسے صاحبِ ذوق پڑھنا اور اپنے پاس رکھنا پسند کریں گے۔

نیلوفر کی فنکارانہ صلاحیتوں کا ایک زمانہ معترف ہے لیکن میں ان کی تحریری صلاحیتوں سے بھی خوب واقف ہوں میری فرمائش پہ نیلوفر اکثر خوب صورت مضامین میرے اخبار کے لیے تحریر کرتی ہیں کبھی کبھی بالکل شارٹ نوٹس پر بھی انھوں نے میری فرمائش پوری کر دی۔ نیلوفر علیم عباسی ایک ہمہ جہت فنکارہ ہیں۔ جب صداکاری کی تو سامعین کو مسحور کر دیا اور جب اداکاری کی تو ناظرین کو محوِ حیرت کر دیا۔

''کلیاں سر اُٹھانا چاہتی ہیں''

نصرت انور

(نیویارک)

ادب کے کسی بھی ٹکڑے کو پڑھ کر چند تاثرات کا پیدا ہونا ایک قدرتی امر ہے۔ ہر تحریر قاری کی ذہنی اور حسیاتی صلاحیتوں کے رد و قبول کے تاروں کو ہلاتی ہے۔ کسی ادب پارے کو پڑھتے وقت ہر قاری اپنی صلاحیتوں، اپنی دلچسپیوں اپنے فکری جھکاؤ اور اپنے خیالات کا پیمانہ ساتھ رکھتا ہے۔

قاری کا تنقیدی ردِعمل اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ کسی کہانی، نظم یا نثری اقتباس کو پڑھتے وقت اُس کے دماغ میں کیا چل رہا ہوتا ہے۔ روایتی تنقید یہ کہتی ہے کہ Imaginative تحریر ایک تخلیقی عمل ہوتا ہے اور قاری کا ردِعمل بھی ایک تخلیقی عمل ہی ہوتا ہے۔ یوں بھی ہوتا ہے کہ قاری پڑھنے کے ساتھ ساتھ اُس تحریر کے مصنف کو بھی مٹھی میں دبائے رکھتا ہے اور گاہے گاہے دورانِ مطالعہ وہ اپنی پسند اور ناپسند کو لئے مصنف کے ذہن میں جھانکنے کی کوشش کرتا ہے اور اُس کی زندگی یا اُس کی نفسیات کے ساتھ اپنے ٹانکے جوڑنے کی کوشش کرتا ہے۔

فرائڈ اعتراف کرتا ہے کہ اُس نے نفسیات کے بارے میں بہت ساری معلومات ادب کے مطالعے سے ہی حاصل کیں۔

اس کی تھیوری کے مطابق انسانی ذہانت کا دعویٰ ہے کہ بہت کچھ جو ہم ظاہری طور پر بھول جاتے ہیں وہ درحقیقت Subconscious یعنی تحت الشعور میں جمع ہو جاتا ہے حتیٰ کہ وہ تکلیف دہ یادیں بھی جو بچپن سے متعلق ہوتی ہیں اور دبی ہوئی ہوتی ہیں۔

Mexico کے ایک شاعر Homero Aridijis کی ایک بہت خوبصورت نظم بچوں کے لیے ہے اُس کا عنوان ہے ''دِن جو گذر گیا'' اس کی چند لائنیں پیش خدمت ہیں:

وہ جو دن کٹ گیا۔۔۔ گونج موجود ہے۔۔۔ اُس کی ہر چیز میں۔۔۔ جو بھی گذرا ہے دن گنگناتا ہوا۔۔۔ گیت گاتا ہوا۔۔۔ چھوڑ کر ہے گیا۔۔۔ ہر ذہن میں وہ اک۔۔۔ دائمی روشنی (مترجم شوکت فہمی)

نیلوفر عباسی کی کتاب ''کہی ان کہی'' ایسے ہی گذرے دنوں کی یادوں کی پُڑیاں، ہر پُڑیا میں وقت بندھا ہے۔ کسی میں درد بندھا ہے تو کسی میں خوشی۔ جیسا کہ زندگی کا چلن ہے۔

کتاب پہلے ہی صفحے سے شروع ہو جاتی ہے۔ مگر کچھ تحفظات کے ساتھ جیسے ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' ''شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑا رحم اور مہربان ہے'' اور جب یہ آیت پڑھ لی تو کتاب تو پڑھنی پڑے گی ہی۔ دوسرے ہی صفحے پر ایک وظیفہ درج ہے۔

لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ سُبْحَانَکَ اِنِّیْ کُنْتُ مِنَ الظّٰالِمِیْنَ

''کوئی معبود اس کے سوا نہیں وہ ذات پاک ہے۔ بے شک میں ظالموں میں سے ہوں''

اس وظیفے کو ایک دفعہ پڑھنے سے در رحمت شاذ کھلتا ہے۔ عام طور پر سوا لاکھ مرتبہ پڑھنے سے ہی رحمتِ باری جوش میں آتی ہے۔ حضرت یونس کے خوفزدہ تنفس کی تیزی اور کچھ آیت کریمہ کے جلال نے مچھلی کا قافیہ تنگ کر دیا اور اُس نے اللہ اور اُس کے بندے دونوں سے ڈر کر جناب یونس کو اُگل دیا۔ ویسے بھی مچھلی کی زیادہ آکسیجن حضرت یونس خرچ کر رہے تھے۔

اس آیت کریمہ کا اندراج قاری پر اس کا ورد لازم کر دیتا ہے۔ اور یوں اس ورد کی برکت کی بارش کا صاحبِ کتاب پر ہونا لازمی ہو جاتا ہے۔

تیسرے صفحے پر ایک راز کی بات ہے۔ راز کی اس بات سے مجھے پھر بچوں کی ایک نظم یاد آ گئی۔ جس کو Jesus Carlossosto نے لکھا ہے۔ عنوان ہے۔ ''شاعر پنسل'' ایک دفعہ ایک پنسل تھی جو شاعری لکھنا چاہتی تھی۔ لیکن اُس کے پاس نوک نہیں تھی۔ ایک دن ایک لڑکے نے اس کو پنسل تراش میں ڈال دیا اور نوک کی جگہ سے دریا اُبل پڑا''

بس یہی راز کی بات ہے۔ یہ پنسل قمر علی عباسی صاحب کے ہاتھ لگ گئی۔ گھر میں لفظوں کا دریا بہنے لگا۔ کبھی پنسل وجاہت کے ہاتھ آ جاتی ہے تو وہ اس میں سے نہر نکال لیتے ہیں۔ میں نے اُن کا ایک کالم شرمین عبید چنائے پر پڑھا تھا جو کافی اچھا تھا اب نیلوفر نے اس پنسل کی معرفت ایک ندی نکال لی ہے۔ قمر علی عباسی صاحب نے پنسل پر لکھ دیا ہے If I can do it you can do it too۔ عباسی صاحب کی علم پروری کا یہی عالم رہا تو وہ دن دور نہیں کہ اُن کے گھر آ کر چند دن ٹھہرنے والے مہمان بھی صاحبِ کتاب ہو کر ہی گھر سے رخصت ہوا کرے گا۔ کاش یہ سعادت میرے حصے میں آ سکتی۔

وقت اپنے جسم کو ماضی کے عکسوں سے Nurture کرتا رہتا ہے۔ یہ دن جاتے جاتے اپنے ننھے ننھے Chips دماغ میں ایک ترتیب کے ساتھ چھوڑ جاتا ہے۔ بس نیلوفر نے اُنہی دنوں کو ترتیب کے ساتھ باہر نکال کر صفحوں پر پھیلا دیا ہے۔ گو یہ نیلوفر کی ذاتی زندگی یا داشتیں ہیں جن میں اُن کا اپنے بارے میں ذکر ہے۔ کہیں دوسری شخصیات کی باتیں ہیں۔ کچھ جگہوں کی تصویریں ہیں اور کچھ لمحوں کا انجماد ہے۔ دِن جو گذر جاتے ہیں لگتا ہے کہ ہم اُن سے دور نکل آئے ہیں۔ مگر ہمارا ہمزاد ہمیشہ اُن کا پیچھا کرتا رہتا ہے۔ اُن سے کھیلتا رہتا ہے۔

نیلوفر کا تعلق فنون لطیفہ سے رہا ہے۔ انہوں نے ریڈیو پاکستان کراچی پر ایک صداکار کی حیثیت سے اور ٹی وی پر ایک فنکار کے طور پر کام کیا۔

نیلوفر اور خواتین کی ایک پوری کھیپ فن وادب کے مختلف شعبوں میں پوری طاقت کے ساتھ اس Challange کو قبول کرتے ہوئے داخل ہوئیں کہ عورت ہونے کی وجہ سے اُن سے زیادہ دیر تک اُن کے حقوق اور آزادی چھینی نہیں جا سکتی۔ پروین فنا سید کچھ یوں گویا ہوئی:

جو فصلِ گل میں بھی سہمی ہوئی تھیں
وہ کلیاں سر اُٹھانا چاہتی ہیں

اس نئے رجحان کے تحت فنون لطیفہ سے جڑی ان خواتین نے مردانہ معاشرے کو للکارا اور عورت کی اہمیت کو اجاگر کرنے کے لیے ایک بڑا قدم اٹھایا اور اہل مذکر کو بتایا کہ معاشرے کی تعمیر کی ٹھیکیداری صرف اُن کے پاس ہی نہیں بلکہ عورت بھی برابر کی شریک ہے۔ نیلوفر سمیت سب خواتین ادیبوں، شاعروں اور فنکاروں کا پاکستان کی عورت کے آزاد وجود کی وکالت کرنے کا بڑا احسان ہے۔

نیلوفر کی کتاب ''کہی ان کہی'' میں اُن کی کہانی بچپن سے شروع ہوتی ہے۔ بچپن جو صرف ہنسنے، مسکرانے، مہکنے اور چہکنے کے لیے ہوتا ہے اور اُس بچپن میں سے اگر کوئی شہریار اوجھل ہو جائے تو اُس معصومیت کا کوئی کنگرا ٹوٹ جاتا ہے اور گاہے گاہے اُس کمی کا احساس دلاتا رہتا ہے۔ نیلوفر کی کتاب کو پڑھتے ہوئے کبھی ایک قاری اور کبھی دوسرا قاری خود کو نیلوفر کی کتاب کے مذکورہ کرداروں کے ساتھ خود کو جوڑتا نظر آتا ہے۔

انہوں نے ایک ڈرامے شہہ زوری میں ایک Role ادا کیا تھا۔ یہ ایک مقبول عام سیریل تھا۔ اس ڈرامے میں شہہ زوری ہر Challange سے نپٹتے ہوئے کہتی ہے ''میں بہت بُری آدمی ہوں'' نیلوفر نے تو شہہ زوری کے اس کردار کو کھیلا تھا مگر میری Association اس کردار کے ساتھ یہ بنتی تھی کہ میں سچ میں بُری آدمی تھی۔ ماں کو مجھے یاد دِلانا پڑتا تھا کہ میں اچھی لڑکی ہوں۔

کتاب میں کئی مقامات ایسے آتے ہیں کہ قاری کے لیے خود کو اُن موضوعات سے Relate کرنے کی گنجائش نکل آتی ہے۔ جیسے صاحبِ کتاب کا اپنی ابتدائی تعلیم میں مِس بلبل کا ذکر کرنا۔ ایسے میں ہر قاری اپنے اپنے پرائمری سکول کے دروازے کے سامنے کھڑا نظر آتا ہے جہاں کوئی نہ کوئی مِس بلبل یا ماسٹر چڑا کھڑے نظر آتے ہیں۔ انقلابی نوجوانوں کا ذکر کرتی ہیں تو نہ صرف کراچی میں مارشل لاء کے خلاف جدوجہد کے مناظر دکھائی دیتے ہیں بلکہ لاہور، پشاور، پنڈی اور ملتان کے قاری کو وہ تحریک اور اُس میں حصہ لینے والے جیالے یاد آجاتے ہیں۔

مجھے یاد ہے کہ کس طرح لاہور میں لوئر مال سے لے کر لاء کالج تک گورنمنٹ کالج لاہور۔ یونیورسٹی اور لاء کالج کے لڑکے سڑکوں پر لیٹ گئے تھے۔ اور گورنر امیر محمد خاں کی پولیس فورس نے مظالم کی داستانیں رقم کی تھیں۔ نیلوفر نے ایک جگہ اپنے ٹیوٹر جوہر حسین کا ذکر کیا ہے۔ وہ ڈاکٹر کرار حسین کے بیٹے تھے اور نیشنل سنٹر لاہور کے ڈائریکٹر تھے۔ مجھے یاد ہے میں اُن سے بھی بحثیں کیا کرتی تھی۔

طالبِ علمی کا زمانہ گذر جانے کے باوجود زندگی سے معمور ہوتا ہے۔ بار بار یاد آتا ہے غالباً دوستوں کی محبت اور اُستادوں کی شفقت سے تعمیر ہوا ہوتا ہے۔ نیلوفر جب کالج میں داخلے، فارم فِل کرنا اور مضامین کے چناؤ کا ذکر کرتی ہیں تو پڑھنے والے کو دُور کہیں اُس کے اپنے کالج یا یونیورسٹی کی عمارتیں خاموش آوازوں سے بُلانے لگتی ہیں۔

کتاب میں قمر علی عباسی صاحب سے ملاقات کا باب کافی دلچسپ ہے۔ لکھتی ہیں کہ ''معروف صاحب کے برابر ایک نوجوان بیٹھے تھے۔ سرخ و سفید، شرارتی موٹی موٹی آنکھیں اور مسکراتا ہوا چہرہ، ہلکی بلو کلر کی شرٹ پہنے اس تروتازہ وجود سے ریڈیو کا یہ کمرہ جگمگا سا رہا تھا''۔ میر نے شاید ایسی ہی کسی گھڑی کے لیے یہ شعر گھڑا تھا:

وہ آئے بزم میں اتنا تو ہم نے دیکھا میر
پھر اُس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی

اس کو کہتے ہیں Micro Scopic مشاہدہ۔ آسمانی رنگ کی قمیض والے جانے کب سے گھات لگائے بیٹھے تھے۔ حکمتِ عملی کے طور پر وہ تازہ ترین چیک کے علاوہ پچھلے تمام چیک قبھائے بیٹھے تھے۔ اب مرحلہِ عرضِ تمنا کو طے کرنے کے لیے اس سے اچھی پیش رفت ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ نیلوفر کو دام میں پھنسانے کے لیے کچھ اور پتے پھینکے گئے۔ مثلاً

''آپ کی باتیں ہمیں اچھی لگتی ہیں۔ آپ پُر اعتماد ہیں، غلط بیانی سے کام نہیں لیتیں۔ مذہب میں'' وغیرہ وغیرہ کے بعد آخری حربہ یوں آزمایا گیا ''اگر کھانا پکانا نہیں آتا تو ہم سکھا دیں گے بلکہ ہم تو خود ہی اس فن میں مہارت رکھتے ہیں''۔ ہوسکتا ہے یہ بھی کہا ہوگا ''پیاز اور سبزیاں کٹوا کر آپ کے ہاتھ تھوڑا ہی میلے کروائیں گے''۔ معلوم نہیں اس وعدے کو کہاں تک نبھایا ہوگا۔

نیلوفر کی تحریر میں ماں کی ملائمیت، شفقت اور سادگی جھلکتی ہے۔ انہوں نے مائیکرو بیالوجی میں ایم۔ایس۔سی۔ کی اس مضمون کا تعلق زندہ چیزوں کے بارے میں کھوج لگانا ہوتا ہے۔ بہت چھوٹی زندگی جس کو آنکھ سے دیکھنا دشوار ہو جیسے Bacteria, Fungi, Viruses اور سبزہ وغیرہ میں نے سوچا کہ اگر نیلوفر اس علم کو استعمال کر کے کہانیاں لکھتیں تو شاید کوئی کہانی ایسی ہوتی ''ماریہ اپنے گھر کے درخت سے چھ ناشپاتیاں اُتار کر لائی۔ میں نے اپنی Nana کو اُن کا سٹو پکانے کو کہا۔ ماریہ نے کہا نا، نا، نا اگر تم نے ان کو پکایا تو درخت یقیناً مر جائے گا۔ (میکسیکو کی کہانی سے مستعار)

یا پھر کوئی دوسری کہانی ایسے لکھتیں۔ میز اور کرسیاں صاف کر دو، بستر اور صوفے بھی۔ لیکن اگر تم نے دروازوں کو صاف کر دیا تو پتنگے کیا کھائیں گے۔ (Alberto Blanco)

بچیاں، بیٹیاں، لڑکیاں، مائیں اور بیبیاں ایسی ہی ہوتی ہیں۔

''گئے دنوں کا سراغ''

نیلوفر علیم عباسی

تیاریاں زوروں پر تھیں۔ ۱۴ اگست آنے والی تھی اور دوسرے محلّوں کی طرح ہمارے محلّے میں بھی یوم آزادی دھوم دھڑکے سے منایا جاتا، کسی سال لڑکے گھروں سے چندہ جمع کر کے قوالی کا اہتمام کرتے تو کسی برس قومی نغموں کا مقابلہ ہوتا اور اس بار سنا تھا کہ کسی زبردست ورائٹی پروگرام کا انعقاد ہے، کئی دن پہلے سے گلی کے درمیان میں اسٹیج بن رہا تھا، سجاوٹ ہو رہی تھی۔ پوری گلی ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک سبز سفید جھنڈیوں سے آراستہ کر دی گئی تھی۔

میں اور میری ہم عمر لڑکیاں اس ورائٹی پروگرام کو لے کر بڑے پرجوش تھے کیونکہ اس وقت ورائٹی پروگرامز یا اس نوعیت کے فنکشن ذرا کم کم ہی ہوتے تھے البتہ ممی ڈیڈی اور ماموں کے ساتھ مشاعرے اور ادبی محفلوں میں اکثر شریک ہوتے۔

۱۴ اگست روایتی آب و تاب کے ساتھ طلوع ہوا۔ اب ریڈیو پر قومی نغمے بج رہے تھے۔ گلیوں محلّوں میں بھی قومی نغمے مائیکروفون پر گائے اور بجائے جا رہے تھے لیکن ہم کو تو شام کا انتظار تھا کہ دن ڈھلے اور ورائٹی پروگرام شروع ہو اللہ اللہ کر کے انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں، روشن جگمگاتے اسٹیج پر منتظمین لڑکوں میں سے کسی نے مائیک سنبھالا اور پروگرام کا آغاز کیا۔ ورائٹی پروگرام میں جو کچھ ہوتا ہے اس میں بھی وہی تھا۔ گانے، مزاحیہ خاکے، لوک رقص اور کامیڈی۔ کامیڈی آئٹمز پیش کرنے والے نوجوان نے سب کا دل جیت لیا۔ نو عمر دبلا پتلا اسمارٹ سوٹڈ بوٹڈ یہ لڑکا اپنے گروپ میں بالکل منفرد اور جدا تھا۔ مہذب لب و لہجہ، شائستہ اور شستہ مذاق۔ یہ محسوس نہیں ہوتا تھا کہ یہ پرفارمنس کسی گلی میں منعقد ورائٹی پروگرام میں ہو رہی ہے بلکہ کسی عالی شان شو کا حصہ معلوم ہو رہی تھی اور اسی لئے اس لڑکے کا نام سب ہی لوگوں کے ذہن میں رہ گیا ''معین اختر''۔ آہستہ آہستہ معین اختر کراچی کی محفلوں کی جان بن گئے۔ کوئی ورائٹی شو ان کے بغیر مکمل نہیں سمجھا جاتا تھا اور پھر جب ٹیلی ویژن کا آغاز کراچی میں ہوا تو معین اختر اپنی خوبصورت برجستہ اور شائستہ کامیڈی کے ذریعے ہر سمت چھا گئے۔

معین اختر صرف کامیڈین نہیں تھے وہ بہت اچھے کمپیئر، گلوکار، نغمہ نگار اور کمپوزر بھی تھے۔ ڈرامہ آرٹسٹ بھی غضب کے تھے۔

ریڈیو، ٹی وی یا فلم ہو تو کسی غلطی پر آپ وہ شاٹ یا مکالمہ دوبارہ بھی ریکارڈ کروا سکتے ہیں لیکن اسٹیج وہ واحد میڈیم ہے کہ جہاں جو جملہ منہ سے جیسا نکل گیا وہ واپس نہیں ہو سکتا۔ معین اختر اسٹیج کے بادشاہ تھے۔ ہزاروں لاکھوں کا مجمع ہو ان پر کسی قسم کی کوئی نروس نس طاری نہیں ہوتی۔ وہ بلا دھڑک اسٹیج پر آتے پرفارم کرتے اور لوگوں کے دل جیت لیتے۔

دلیپ کمار جیسے عظیم آرٹسٹ نے کہا کہ ''میرے لئے اعزاز کی بات ہے کہ معین اختر میرا انٹرویو کر رہے ہیں''۔

معین اختر سے کراچی ٹی وی اسٹیشن پر اکثر ملاقات ہوتی ان کا مخصوص جملہ تھا ''بھئی بڑے زبردست ڈرامے کر رہی ہیں، کبھی اسٹیج کے لیے بھی وقت نکالیں''۔

''کیا کروں معین اسٹیج ڈرامے کے لیے وقت، بہت چاہیے ہوتا ہے اور یونیورسٹی کی پڑھائی میں تو ٹی وی ڈرامے بھی مشکل سے کر پاتی ہوں اور پھر اسٹیج پر تو بڑے بڑے آرٹسٹ کام کرتے ہیں''۔ میں ان کی طرف اشارہ کر کے کہتی تو وہ کہتے ''گھسیٹئے گھسیٹئے ہمیں کانٹوں میں گھسیٹئے''۔

معین اختر ہمیشہ مہذب لہجے میں معیاری زبان استعمال کرتے۔ جس طرح ان کی پرفارمنس میں ایک معیار تھا اسی طرح ان کی روزمرہ زندگی میں بھی ایک خاص قسم کا رکھ رکھاؤ تھا۔ ہمیشہ خوش لباسی کو اپنایا۔ اچھے کپڑے، عمدہ جوتے، سلیقے سے سنورے بال، معین اختر کی شخصیت کا حصہ تھے۔ وقت کے ساتھ ہر ایک میں تبدیلی آتی ہے کسی میں زیادہ کسی میں کم لیکن معین پر وقت نے کوئی خاص اثر نہ ڈالا تھا جس کا راز وہ مطمئن اور خوش رہنے میں مضمر جانتے تھے۔

اگست ۱۹۷۱ء میں قاسم جلالی اور عشرت انصاری کو ایک اسٹیج شو ''سچ جمع جھوٹ بٹہ دو'' کی ذمہ داری سونپی گئی۔ دونوں پاکستان ٹی وی کے باصلاحیت پروڈیوسر تھے۔ شو کو بہترین بنانے کے لیے اس وقت کے تمام نامور آرٹسٹوں کو بک کیا گیا اور اسٹیج شو تھا تو بھلا معین اختر کا نام سرفہرست کیوں نہ ہوتا۔ اسی شو کے دوران میری معین اختر سے صحیح معنوں میں جانکاری ہوئی۔ جب آپ اکٹھے کام کرتے ہیں تو ایک دوسرے کے مزاج، عادات و اطوار کا بہتر اندازہ ہوتا ہے۔ معین اسٹیج پر چھائے ہوئے تھے اس کے باوجود وہ شو کی ریہرسل انہماک اور نہایت توجہ سے کرتے۔ چھوٹے سے چھوٹے جملے کی ادائیگی اور Move کا خاص خیال رکھتے مگر سیٹ پر ہنستے ہنساتے اور دلچسپ چٹکلے سنا کر ماحول کو خوشگوار بھی بنائے رکھتے۔ یہ شو ہوٹل میٹروپول کے اسٹیج پر ریکارڈ ہوتا۔ اس کی کاسٹ میں راجو جمیل، جمیل الدین عالی صاحب کے بیٹے بھی تھے۔ دریا دل، ہر وقت پیسے خرچ کرنے پر تیار کبھی ساتھی آرٹسٹوں کو میٹروپول میں لنچ کرا رہے ہیں تو کبھی Village میں کھانا ہے پوری کاسٹ کا۔ بہت سے لوگ ''مال مفت دل بے رحم'' کے مقولے پر عمل کرتے ہوئے راجو جمیل سے لنچ ڈنر اڑاتے رہتے مگر معین

اختر اس بات پر بے حد کڑھتے ''یار راجو یہ تم کیوں بیکار میں اتنے پیسے اڑاتے ہو۔ سب آرٹسٹوں کو پی ٹی وی سے چیک ملتے ہیں ایک تم ہی کیوں؟'' مگر راجو نے کب ان باتوں کی پروا کی تھی۔ اسی شو کے دوران جب راجو جمیل نے باقاعدہ دوپٹہ اور مٹھائی لاکر مجھے بہن بنایا تو معین اختر بھی پیچھے نہیں رہے اور کہا کہ ایک نہیں آج سے تمہارے دو بھائی ہیں اور پھر اسے نبھایا بھی۔ معین کی شادی میں مَیں واحد آرٹسٹ تھی جو شریک تھی علاوہ ان کے عزیزوں کے میں نے پوچھا معین تم نے ریڈیو، ٹی وی سے کسی اور کو نہیں بلایا؟ ''نہیں۔۔ بھئی ایک کو بلاؤ اور دوسرے کو نہیں تو ناراضگیاں ہو جاتی ہیں'' معین نے وضاحت کی تو پھر مجھے کیوں بلایا؟ ''تم آرٹسٹ تھوڑی میری بہن ہو'' معین نے میرا مان بڑھا دیا۔

معین اختر اور میں ریڈیو کا ایک کمرشل پروگرام کرتے ریکارڈنگ ایک پرائیویٹ اسٹوڈیو میں ہوئی تھی۔ معین اختر کا عروج کا زمانہ، مصروفیت ہی مصروفیت لیکن ریکارڈنگ کا جو وقت ہوتا معین کبھی اس سے لیٹ نہ ہوتے۔ نہ آ کر دوسری ریکارڈنگز میں جانے کا شور مچاتے پوری توجہ اور لگن سے کام کرتے۔ اکثر کہتے ''نیلوفر ریڈیو پر بولنا میں آپ سے سیکھتا ہوں۔ آپ میں خداداد صلاحیت ہے'' میں شرمندہ ہو کر کہتی معین یہ کیا کہہ رہے ہو۔ اللہ تعالیٰ نے تمہیں جن صلاحیتوں سے نوازا ہے ان کا تو شمار ہی نہیں''۔ وہ سنجیدگی سے کہتے بے شک اللہ تعالیٰ نے ہر ایک کو الگ الگ صلاحیتوں سے نوازا ہے۔ اللہ تعالیٰ پر یقین و اعتماد ان کی کامیابی کا راز تھا۔

قمر علی عباسی کے وہ بڑے دلدادہ تھے اکثر اتوار کو گیارہ بجے کے قریب آتے اور پھر عباسی صاحب کے ساتھ لمبی نشست رہتی اور جب ہی معلوم ہوا کہ وہ ادب کے بھی شیدائی ہیں۔ پسندیدہ ادیبوں کی تحریریں پڑھنا ان کا سب سے عزیز مشغلہ ہے۔ عباسی صاحب کے تمام سفرنامے ان کے پاس موجود تھے جن پر گاہے بہ گاہے تبصرہ و تنقید بھی ہوتی رہتی تھی۔

میری شادی کے بعد معین نے مجھے کبھی ''تم'' نہیں ہمیشہ ''آپ'' کہا۔ کہتے تھے، بہنوئی کا ادب لحاظ ضروری ہے۔ خاندانی اقدار کے وہ قائل تھے۔

ہم لوگ امریکہ سیٹل ہو گئے۔ فون پر کبھی کبھی ان سے بات ہوتی۔ ہر بار کہتے اب کے پاکستان آئیں تو میرے گھر کا پروگرام رکھیں۔ میں گاڑی بھیج کر پک کروالوں گا۔ ہم بھی وعدہ کر لیتے مگر وہ وعدہ ہی کیا جو وفا ہو جائے۔

ہم تو نہیں جا پاتے مگر وہ قمر علی عباسی کی کتابوں کی رونمائی میں اب باقاعدگی سے آنے لگے تھے اور یہی تقریب کچھ تو بہر ملاقات بن جاتی تھی۔

۱۲ر دسمبر ۲۰۰۹ء کو ان سے آخری ملاقات ہوئی۔

پھر اسی وعدے کی تجدید کہ اگلے برس آئیں تو میرے گھر ضرور آنا ہے مگر اب وعدہ وفا کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ

گئے دنوں کا سراغ لے کر کدھر سے آیا کدھر گیا وہ
عجیب مانوس اجنبی تھا مجھے تو حیران کر گیا وہ

میں نے جن فنکاروں کے ساتھ کام کیا اُن میں کتنے ہی نام ایسے ہیں جنہیں ڈرامے میں کاسٹ کرنے کے لیے یہ اطمینان ہو جاتا تھا کہ سب کچھ ٹھیک رہے گا اور ان پر محنت نہیں کرنی پڑے گی۔ اُن میں ایک اہم نام نیلوفر علیم کا ہے۔ میں نے اُن کے ساتھ کئی ڈرامے کیے اور مجھے یقین ہو گیا کہ وہ بنیادی طور پر ایسی فنکارہ ہیں جو ڈرامے کے کرداروں کو سمجھ کر اُن میں اپنے آپ کو سمو لیتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے نیلوفر علیم کو ایک بڑی صلاحیت یہ دی ہے کہ وہ بڑی تیزی سے ڈرامے کے مکالمے یاد کر لیتی ہیں اور اُن میں کوئی غلطی نہیں کرتیں بلکہ زیادہ تر اُن کو دیگر ساتھی آرٹسٹوں کے جملے بھی یاد ہوتے ہیں۔ کئی بار ایسا ہوا کہ کوئی فنکار اپنا جملہ بھول گیا اور نیلوفر نے فوراً کہا ''مجھے ایسا لگتا ہے کہ تم یہ کہنا چاہتے ہو'' اور فنکار نے فوراً اپنا CUE پکڑ لیا۔ پاکستان ٹیلی ویژن میں ایسے فنکار ہیں جو اپنے کردار کو سنجیدگی سے پڑھتے ہیں اور انہیں اپنے اوپر طاری کر لیتے ہیں جب کمرے کے سامنے آتے ہیں تو وہی بن جاتے ہیں، نیلوفر علیم کا شمار اُنہی فنکاروں میں ہوتا ہے۔

محسن علی
پی۔ٹی۔وی (کراچی)

○

میں نے نیلوفر علیم کے ڈرامے ریڈیو پر سنے تھے اُن کی صدا کاری کا معترف تھا لیکن وہ ٹیلی ویژن پر اتنی اچھی اداکاری کریں گی یہ نہیں سوچا تھا۔ پہلے ہی ڈرامے میں انہوں نے سینئر فنکاروں کے ساتھ ایسی بے ساختہ اور نیچرل پرفارمنس دی کہ حیرت ہوئی اور میں نے انہیں فوراً ہی اگلے ہفتے اے۔ حمید کی کہانی ''جہاں برف گرتی ہے'' کے مرکزی کردار کے لیے بک کر لیا۔ پہاڑ کی بھولی بھالی لڑکی کا کردار بھی نیلوفر علیم نے اس طرح ادا کیا کہ وہ یادگار بن گیا اُس کے بعد میری کوشش ہوتی کہ میں جو ڈرامہ پروڈیوس کروں اُس میں نیلوفر علیم ہوں۔

امیر امام
(پی۔ٹی۔وی)
(کراچی)

''حسنِ عقیدت''

نعت

جو مجھ کو خواب میں اُن کا رُخِ انور نظر آئے
ستارہ میری قسمت کا بلندی پر نظر آئے

غلام اُنؐ کے شہنشاہوں سے بھی برتر نظر آئے
اور اُن کی راہ کے ذرّے مہ و اختر نظر آئے

یقیناً آپ کی چشمِ کرم کا یہ کرشمہ ہے
کہ بیمارِ محبت پہلے سے بہتر نظر آئے

دُعائیں اور قبائیں آپؐ نے اُن کو بھی بخشی ہیں
کہ جن کی آنکھ میں خوں ہاتھ میں خنجر نظر آئے

یہ فیضانِ نظر ہے یا مرا حُسنِ عقیدت ہے
میں جس جانب بھی دیکھوں حُسن پیغمبر نظر آئے

تصور میں درِ اقدس کی جالی چُوم لی میں نے
مجھے اپنے مقدر کس بلندی پر نظر آئے

جو اپنی کم نصیبی پر مری آنکھوں سے ٹپکتے تھے
ندامت کے وُہی آنسو مجھے گوہر نظر آئے

عطا کیجیے سُرور انبالوی کو وہ نظر آقاؐ
کہ دل کے آئینہ میں آپؐ کا جوہر نظر آئے

سرورانبالوی (لاہور)

نعتِ رسول ﷺ

(بارہ ربیع الاوّل کی مناسبت سے)

فضائے کون و مکاں نُور سے بھری ہوئی ہے
مِرے حضور ﷺ کی تشریف آوری ہوئی ہے!

وہ جن ﷺ کا سایہ نہ تھا، ہم پہ ہیں وہ سایہ کناں
کرم ہوُا ہے ، بڑی بندہ پروری ہوئی ہے

یہ انکشاف مدینے میں جا کے مُجھ پہ ہوُا
کہ اُن ﷺ کے نُور کی گاگر ابھی بھری ہوئی ہے

پیام لے کے وہ ﷺ آئے جو امن و آشتی کا
زمانے بھر کے مقدّر کی یاوری ہوئی ہے

بُتوں کو پُوجنے والوں کا عہد ختم ہوُا
شکستِ فاش سے دو چار آذری ہوئی ہے

پیمبر اَور بھی آئے تھے اُن سے پہلے، مگر
جو اُن کے آنے سے شانِ پیمبری ہوئی ہے !

خُدا نے آج خود افلاک پر جلائے دیئے
کہ آج آپ ﷺ کی تشریف آوری ہوئی ہے!

مَیں روشنائی سے لکھنے لگا جو نعتِ نبی ﷺ
تو دیکھا اُس میں تو اِک روشنی بھری ہوئی ہے !

جب اُن ﷺ کا ذکر چھڑا، روشنی زیادہ ہوئی
نسیم کیسی منوّر سخنوری ہوئی ہے !

نسیم سحر (جدہ)

نعتِ رسول مقبولؐ

ہم بھی عُشّاق کی قطار میں ہیں
پھر بُلاوے کے انتظار میں ہیں

یاد آئی وہاں کی آب و ہوا
اور لگتا ہے ہم بہار میں ہیں

لب پہ جاری ہے وردِ صلِّ علیٰ
یوں مدینے کی رہ گزار میں ہیں

آپؐ نے رکھ لیا بھرم ورنہ
ہم خطاکار کس شمار میں ہیں

ایک نقشہ فضائے طیبہ میں
اُن کے پیارے اسی خمار میں ہیں

جس میں ہونا کمالِ قسمت ہے
ہم اُسی چشم کے حصار میں ہیں

وہ کدورت سے آشنا ہی نہیں
جو بھی صلِّ علیٰ کے پیار میں ہیں

نورین طلعت عروبہ
(راولپنڈی)

نعت

جب نظر کے سامنے روضہ کا منظر آئے گا
خود بخود میری زباں پر ذکرِ سرور آئے گا

دیکھنا ہے سایۂ احمدؐ تو دیکھو عرش پر
آسماں کا سایہ آخر کیوں زمیں پر آئے گا

مجھ کو نسبت ہے محمدؐ سے نہیں دنیا کا خوف
مجھ سے ٹکرائی تو گردش کو بھی چکر آئے گا

تیرگی کو کاٹ دے گی جنبشِ نوکِ قلم
روشنی کے ہاتھ میں کرنوں کا خنجر آئے گا

جو محمدؐ کے نہیں نظریں جھکا کر جائیں گے
مدح خوانِ مصطفیٰ تو سر اٹھا کر آئے گا

آنکھ میں بھر لوں گا میں تو شربتِ دیدار کو
جام بھرنے جب میرا ساقیِ کوثر آئے گا

جس کے دل میں آئے گا عارف محمدؐ کا خیال
بخت کی تاریکیوں میں مثلِ خاور آئے گا

عارف شفیق
(کراچی)

اندر کا رنگ

نیلم احمد بشیر
(لاہور)

بُتِ رعنا نے مستعدی سے سیلوٹ مارا تو ایک بار کرنل سبحان بھی مبہوت ہو کر اسے تکنے پر مجبور ہو گئے کیا کوئی مرد اتنا خوبصورت بھی ہو سکتا ہے؟ انہیں یقین نہیں آ رہا تھا۔ فوج میں رہ کر انہیں پہلے بھی کئی بار اردلی ملتے رہتے تھے مگر اس جیسا بانکا، سجیلا نوجوان کبھی ان کی خدمت کے لیے عطا نہ ہوا تھا۔ سرخ و سپید رنگت، سنہرے گھونگریالے بال، ستواں ناک، بلوری چمکدار آنکھیں، ایسی نشیلی کہ پل بھر کو تو دیکھنے والا ٹھٹھک کر رہ جائے۔ ''یا اللہ شکر ہے میرے گھر کوئی جوان بیٹی نہیں ہے۔'' کرنل سبحان نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ انہوں نے اپنی جوان، خوبصورت، المیلی بیٹی زہرہ کی وقت پر شادی کر دی تھی اب وہ اور ان کی بیوی فارغ البال تھے۔ بڑا بیٹا طاہر امریکہ میں ڈاکٹر تھا اور کم کم ہی پاکستان آتا تھا۔ یہ کرنل سبحان کو ریٹائرمنٹ سے پہلے ملنے والا آخری اردلی تھا۔ انہیں اچھی طرح پتہ تھا کہ اس کے بعد اس قسم کی ذاتی خدمت کروانے کی عیاشی نصیب نہ ہو سکے گی، اس لیے وہ اس نعمت کا خوب خوب فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔

''جلدی سے میرے بوٹ پالش کر کے لاؤ۔۔۔ یونیفارم ٹھیک سے استری نہیں ہوئی، دوبارہ کر کے لاؤ، میری پسند کی کافی بناؤ۔۔۔ وہ ہر وقت اس پر حکم چلاتے رہتے اور وہ نظریں جھکائیں ان کا حکم بجا لاتا رہتا۔ اس خوبصورت اردلی کو اپنا نوکر بنا دیکھ کر کرنل سبحان کو ایک خاص قسم کی تسکین ملتی۔ حسد سے جلتے دل کو قدرے قرار سا آ جاتا۔

''کیوں دوڑاتے ہیں بے چارے غریب کو اتنا۔۔۔ ایک منٹ بھی ٹک کر بیٹھنے نہیں دیتے'' کبھی کبھار بیگم اس پر ترس کھا کر کہیں اٹھتیں تو بڑی نخوت سے جواب دیتے۔

کیوں نہ کام لوں آخر؟ آرڈرلی ہے میرا۔۔۔ آرڈرلی کا مطلب سمجھتی ہو نا۔۔۔ آرڈر لینے والا۔ ویسے بھی ان سالوں سے کام نہ لو تو ان کی ہڈیوں میں پانی پڑ جاتا ہے۔ وہ مطمئن ہو کر ٹانگیں پسار لیتے اور بُت خوبرو کو اشارے سے بلاتے کہ آئے اور ان کے پاؤں دبائے۔ ''انگریزوں نے یہ جاب ہمارے ہاں کے مقامی لوگوں کو غلام بنانے کے لیے ہی Create کی ہوگی''۔ بیگم صاحبہ نے ایک اور تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں مگر یہ جاہل ان پڑھ گنوار لوگ اسی قابل ہیں کہ انہیں خچروں کی طرح کام پر لگایا جائے۔ سالے کی شکل غور سے دیکھی ہے تم نے غور سے۔ اس کی دادی یا نانی نے یقیناً سکندر اعظم کے سپاہیوں کے ساتھ راتیں گذاری ہوں گی۔ کرنل سبحان نے کھی کھی کرتے ہوئے بیگم کو ایک غلیظ طریقے سے آنکھ ماری۔

بیگم کو ان کی بات اچھی نہ لگی۔ اس یوسفِ ثانی کے شہابی رنگ، باوقار چال ڈھال، مہذب لب ولہجہ دیکھ کر ان کا خوامخواہ ہی دل اس کی عزت کرنے کو چاہنے لگتا۔ انہیں یہ بہت کھلتا کہ کرنل سبحان اتنے نیک پیے، فرمانبردار اردلی سے خوامخواہ اتنی سختی سے کیوں پیش آتے ہیں۔ ہر وقت اسے اپنے فضول فضول سے کاموں میں الجھاتے رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بار بار جوتے پالش کرواتے ہیں۔ وہ خاموش رہتیں مگر دل ہی دل میں کڑھتی رہتیں۔

بُت کو کرنل صاحب کی اطاعت اور خدمت کرتے دیکھتیں تو اس کی شرافت اور برداشت کی دل ہی دل میں اسے داد دیتی رہتیں۔

اس کے ملکوتی حُسن سے اتنی متاثر رہتیں کہ اسے اپنے لئے کوئی کام ہی نہ کہتیں۔ کرنل سبحان کے کالے کالے سوکھے پاؤں، دو گورے گورے بھرے بھرے ہاتھوں سے دبتے دیکھنا انہیں بہت عجیب لگتا۔ ان کے شوہر اچھے تھے مگر شکل وصورت کے معاملے میں بس اللہ میاں کا بچہ ہی کہلائے جا سکتے تھے۔ سیاہی مائل گندمی رنگت، چھوٹی چھوٹی کشمشی آنکھیں، درمیانہ قد، گنجا سر، چہرے پر خضاب رنگی مونچھیں پہلے تو انہوں نے کبھی نوٹ نہ کی تھیں مگر اب نہ جانے کیوں تضاد میں سب کچھ بہت غیر مناسب سا لگنے لگا تھا۔ ''نہ کریں نہ آپ کی مونچھیں مجھے چبھتی ہیں'' ایک بار کرنل سبحان نے بیگم کے لبوں کا رات گئے بوسہ لینا چاہا تو وہ بے اختیار تلملا اٹھیں۔

''کیا مطلب؟ اب میری مونچھیں تمہیں چبھنے کیوں لگی ہیں؟ یہ کیا بات ہوئی بھلا'' وہ حیران ہو گئے۔

بیگم تڑپ کر ان کی آغوش سے علیحدہ ہو گئیں اور منہ پھیر کے خراٹے لینے شروع کر دیئے۔ کرنل سبحان نے چند لمحے بیگم کی گرمجوشی کی واپسی کا انتظار کیا اور پھر خود بھی منہ لپیٹ کر نیند کی وادی میں اتر گئے۔

انہیں گمان بھی نہیں گزرا کہ بیگم نے تو بس یونہی آنکھیں موند رکھی تھیں وہ کچھ ہی دیر میں اٹھ گئیں۔ شیشے کے آگے کھڑی ہو کر ایک عرصے بعد اپنے سراپا کا بغور جائزہ لینے لگیں۔ پینتالیس سال کی ہونے کی آئی تھیں مگر اب بھی جسم تنا اور پرکشش تھا۔ کرنل سبحان سے ایسے بھی نبھ رہی تھی جیسے عام طور پر شادیاں نبھا کرتی ہیں۔ نہ اونچ نہ نیچ، نہ گھاٹیاں نہ وادیاں، نہ جنگل نہ صحرا، نہ شور نہ سناٹا، راستہ سپاٹ تھا سفر بس طے ہوتا جا رہا تھا۔ زندگی کے بامعنی یا بے معنی ہونے سے کسی کو سروکار تھا نہ دلچسپی۔ دونوں ایک ہی ڈگر پہ گھسیٹتے چلے جا رہے تھے کہ یکدم گھر میں ایک بتِ مرمر، ایک خوبصورت وجود چلتا پھرتا، نظر آنے لگا

تھا۔اب اس کے حسن کے مقابلے میں ہر چیز اور ہر شخص کم صورت دکھائی دینے لگا تھا۔بیگم صاحبہ نے اپنے جسم کی رعنائی پہ ہلکا سا فخر محسوس کیا مگر ساتھ ہی انہیں شدت سے احساس ہونے لگا کہ اس بدن کے صحرا پر مدت ہوئی ابر ٹوٹ کے نہ برسا تھا۔ان کا ہم نفس، ہم قدم فوجی کب کا پسپا ہو چکا تھا اور فتوحات کے زمانے مدت ہوئی لد چکے تھے؟ مگر وہ خود کو ہاری ہوئی محسوس نہ کرتی تھیں۔یوں جیسے منتظر تھیں کہ کوئی آئے اور آ کے انہیں ہرائے۔انہیں پسپا کردے، ڈھیر کردے مگر اب تو انہیں اپنے صحرائے حیات میں کسی گھڑ سوار کے گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز سنائی دیتی تھی نہ ہی اڑتی ہوئی گرد کے بگولے دکھائی دیتے تھے۔ہر طرف ویرانی ہی ویرانی تھی۔

کرنل سبحان نے اگلی صبح اُس کو صرف اس بات پر زور سے تھپڑ جڑ دیا تھا کہ ان کے مطابق اس نے ان کے پالتو کُتے شیرو کو کھانا دس منٹ لیٹ دیا تھا۔ تھپڑ اس قدر شدید اور آواز اتنی زیادہ تھی کہ راتب کھائے شیرو نے بھی ایک بار تو منہ اٹھا کر اس زور سے میاؤں چیاؤں کی کہ لگا کسی نے اُسے ہی کس کر لات رسید کر دی ہو۔

بیگم نے بھی ٹوسٹ پر جیم لگاتے لگاتے ایک بار تو زور سے سی کر دی۔انہیں نادر پر بہت ترس آیا بے چارہ غریب نوکری کی وجہ سے کتنی ذلت برداشت کر رہا تھا۔بعد میں انہوں نے کرنل سبحان کو پیار سے سمجھانے کی کوشش کی تو کرنل صاحب کی آنکھوں سے شعلے برسنے لگے۔

''بیگم آپ اپنے کام سے کام رکھیں۔اس طبقے کو زیادہ ہمدردی دکھانے کی ضرورت نہیں ہے میں نے بس ایک تھپڑ ہی لگایا ہے۔کرنل فخرالدین کا پتہ ہے نا وہ تو اپنی بیلٹ اتار کر ان سالے اردلیوں کی پٹائی کر دیا کرتا ہے۔فوجی لوگوں میں ایسا ہی ہوتا ہے۔میں تو پھر بھی بہت رحمدلی دکھاتا ہوں۔'' انہوں نے وضاحت پیش کی تو بیگم نے خاموشی سے موضوع ہی بدل دیا۔وہ کہہ اور کر بھی کیا سکتی تھیں؟ اس روز انہوں نے لان میں واک کرتے اپنے دل میں اُس کے کوارٹر کی طرف جانے کی خواہش شدت سے محسوس کی مگر وہ جھجک گئیں۔ویسے ہی انہیں دور سے نظر آ گیا تھا کہ بُتِ مرمر کوارٹر کے باہر پڑی چارپائی پر چت لیٹا آسمان کی طرف دیکھتا تھا اور آنسو اس کے گالوں کو بھگوتے جا رہے تھے۔انہیں یکلخت اس پر پیار آ گیا۔یوں جیسے وہ اسکی ماں ہوں اور وہ ان کا خوبصورت سا بچہ، جس کا سر گود میں سہلا کر وہ اسے کسی پُرسکون دنیا میں لے جانا چاہتی ہوں۔اردلی کی نظریں بیگم صاحبہ سے جا ملیں تو وہ فوراً چارپائی سے اٹھ کھڑا ہوا۔گھر پر اس وقت کوئی نہ تھا، کرنل سبحان بھی شیرو کو لے کر لمبی واک پر نکلے ہوئے تھے۔

بیگم کے دل میں نہ جانے کیا آئی۔باورچی خانے میں گئیں اور چائے کی ایک پیالی بنا کر اُس بُتِ سوگوار کے آگے رکھ دی۔وہ حیراں سا ہو گیا۔

''نہیں جی بیگم صاحبہ۔۔۔کیا کر رہی ہیں جی آپ؟ آپ کا بہت بہت شکریہ۔صاحب غصہ ہوں گے جی۔'' وہ بوکھلا کر بولتا چلا گیا۔

''کوئی بات نہیں، مت ڈرو چائے پی لو، طبیعت بحال ہو جائے گی۔'' بیگم صاحبہ نے غیر اختیاری طور پر اُس کی خوبصورت پیشانی کو چھو لیا تو وہ ایک دم شانت سا ہو گیا اور نظریں جھکا کر جلدی جلدی چائے کے گرم گرم گھونٹ بھرنے لگا۔اس کے ماتھے پہ پسینے کی بوندیں اور زیادہ نمایاں ہونے لگیں۔

اس روز کے بعد نہ جانے کیا ہوا بیگم صاحبہ اور اُس بُت وجاہت کے درمیان خاموشی کی زبان میں بات چیت شروع ہو گئی۔نظریں ملتیں اور لب کھولے بغیر ہی کچھ نہ کچھ کہہ سن لیا جاتا۔بیگم صاحبہ اس کی موجودگی میں خوامخواہ چہکنے لگتیں تو کرنل سبحان سمجھتے وہ ان کی کمپنی میں خوش ہو رہی ہیں اور اسی خوشی میں وہ بھی ہنستے مسکراتے، بات بات پر اس پر حکم چلاتے، سر اور گردن کو مزید اکڑا لیتے۔

سر پر تیل مالش کرواتے کبھی کبھی اونگھ کر خراٹے لینے لگتے تو نادر خاں اور بیگم صاحبہ ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر چپکے سے مسکرا بھی لیتے۔بیگم صاحبہ کو زندگی کچھ اچھی اچھی سی لگنے لگی تھی۔وہ پہلے کتنی بور اور یکسانیت کا شکار تھیں۔انہیں ہر وقت احساس رہنے لگا تھا ایک بے کلی سی تھی جس میں چین اور سکون بھرا ہوا تھا۔

ایک روز عجیب واقعہ ہوا۔کرنل صاحب نے اپنا جمعہ کی نماز کا شلوار کرتا نادر سے استری کروا کر کمرے کی الماری میں لٹکانے کو کہہ دیا اور خود کسی باہر سے آنے والی فون کال کو سننے کے لیے لان میں دور ایسی جگہ جا کر کھڑے ہوئے جہاں سے سگنل کیچ ہو رہے تھے۔

بُت فرمانبردار نے بیڈ روم میں ہولے سے دستک دی اور کوئی جواب نہ ملنے پر آرام سے پٹ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔کمرے میں کوئی نہ تھا وہ کپڑے الماری میں لٹکانے کو پلٹا ہی تھا کہ یکدم ایک تیز مدھر خوشبو نے اسے مسحور سا کر دیا۔بیگم صاحبہ نہا کر نکل آئی تھیں اور اب اپنے جسم پر پرفیوم چھڑک کر تولیئے سے خود کو پونچھ رہی تھیں وہ ایک دم گڑبڑا گیا اور دروازے کی طرف رخ کر کے پلٹنا ہی چاہتا تھا کہ بیگم نے اس کا راستہ روک لیا۔

کپڑے الماری میں لٹکا دو۔۔۔انہوں نے اس کے ہاتھ سے ہینگر لے کر دوبارہ اسی کے حوالے کر دیا۔اسی ایک لمحے میں انہوں نے لذت کے ایک جہان کی سیر کر لی۔دونوں کے ہاتھ مس ہوئے تو جسموں میں جیسے کرنٹ سا دوڑ گیا۔بیگم صاحبہ کی آنکھوں میں شراب سی بھر گئی۔انہوں نے ذرا سی اوٹ کر کے قمیض پہن لی اور زپ بند کروانے کو اپنی پشت کمرا اس کے سامنے کر دی۔کمر تھی کہ بجلیوں کا دمکتا ہوا سیلاب۔وہ جلتا بھنتا زمین میں دھنستا چلا جا رہا تھا۔بیگم نے اس کے ماتھے پہ آیا ہوا پسینہ انگلی سے صاف کر کے اپنی قمیض سے پونچھ دیا اور ہولے سے سرگوشی کی ''اے یوسف تجھے زپ بند کرنا نہیں آتی؟'' اس کے ساتھ ہی وہ کھلکھلا کر ہنس دیں۔

''مجھے معاف کر دیں بیگم صاحبہ جی۔غلطی ہو گئی'' کہہ کر بُت مرمر

فوراً ہی اٹھا اور باہر کو سرپٹ بھاگا۔ بیگم صاحبہ کے لبوں پر ایک مستانی سے مسکراہٹ کھل گئی۔ ''انہیں اس ہلکے پھلکے نازک، رنگین سے واقعے نے حددرجہ محظوظ کیا تھا۔ کتنے عرصے بعد زندگی میں ایسا کوئی مزے دار لمحہ آیا تھا جب صفِ مخالف کے کسی پرکشش مرد کی قربت انہیں ایک لمحہ کے لیے ہی سہی نصیب تو ہوگئی تھی۔ وہ دل ہی دل میں جھوم اٹھیں اور بقیہ کپڑے پہننے اور گنگنانے لگیں۔

کرنل سبحان کی کال ختم ہوگئی تو وہ اپنے بیڈ روم کی طرف چل دیئے۔ کاریڈور میں بدحواس بھاگتا اردلی نظر آیا تو کچھ اچھنبے میں پڑ گئے۔ پھر سوچا کمرے میں کپڑے ہی رکھنے گیا ہوگا۔ میں نے خود ہی تو اسے کہا تھا۔

''یہ؟'' اِدھر کیا کر رہا تھا'' انہوں نے مشکوک انداز میں بیگم سے سوال کیا۔

''کون؟'' انہوں نے بھولپن سے پوچھا۔

''وہ۔۔۔ آیا تھا ادھر؟'' انہوں نے ایک بار پھر پوچھا۔

''یہاں کس نے آنا ہے؟ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟'' کرنل سبحان نے پھر بیگم کی طرف دیکھا جو بے چاری خود ہی اپنے ہاتھوں سے اپنی کمر کی زپ بند کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ ابھی ابھی رونما ہونے والے حسین اتفاق کی وجہ سے ان کے ہاتھ الٹے سیدھے پڑ رہے تھے۔ مگر انہوں نے اپنے شوہر پر کچھ ظاہر نہ کیا۔

''Let me help you'' کرنل صاحب نے آگے بڑھ کر اپنی خدمات پیش کرنے کی آفر کی۔

''نہیں میں کرلوں گی'' بیگم نے رکھائی سے جواب دیا اور خود زپ بند کر کے بالوں میں کنگھا پھیرنے لگیں۔

''کس وقت آیا تھا وہ؟'' نہ جانے کیوں کرنل سبحان کو کچھ بے چینی سی ہونے لگی۔ کہیں اس نے کسی ایسے غلط وقت میں تو بیڈ روم میں قدم نہیں رکھ دیا جب۔۔۔ اس سے آگے وہ سوچنا نہ چاہتے تھے مگر طبیعت میں عجیب بے چینی سی بھر گئی تھی۔

انہوں نے اچانک بیڈ روم کی چٹخنی لگا کر پیار بھرے انداز میں بیگم کو اپنی طرف ہولے سے کھینچا۔

''بڑی پیاری لگ رہی ہو سویٹ ہارٹ'' وہ سرگوشیاں کرنے لگے۔

''ہٹیں نا۔ مجھے پارٹی میں جانا ہے۔ دیر ہو رہی ہے۔۔۔ شیریں انتظار کر رہی ہوگی''۔ اس نے انہیں پیچھے دھکیلتے ہوئے اپنی دوست شیریں کے ہاں جانے کا یاد دلایا۔

''بھئی آدھے گھنٹے لیٹ چلی جانا۔۔۔ جلدی کیا ہے۔ کرنل صاحب نے اپنے آپ کو بیگم سے چھوڑتے ہوئے کہا۔

''چھوڑیں۔ آدھے گھنٹے کی بات تھوڑا ہی ہے۔ کئی گھنٹے ضائع ہو جائیں گے''

بیگم نے کرنل صاحب کو یاد کروادیا کہ وہ اب ایک تھکا، ہارا پسپا، پرانا سپاہی ہیں میدان جیتنا اُن کے لیے اتنا آسان نہیں رہا جتنا پہلے ہوا کرتا تھا۔ سپاہی نے ہتھیار پھینک دیے اور خاموشی سے ٹی۔ وی آن کر دیا۔

بیگم تیار ہو کر گاڑی میں بیٹھ گئیں تو کرنل سبحان بستر پر پڑے کڑھتے رہے۔ کہیں وہ باسٹرڈ۔۔۔ ان کے دماغ کی سوئی بار بار اٹکنے لگی۔ مگر وہ اس خیال کو ناممکن سمجھ کر ٹالتے رہے۔ ایسا کیسے ہوسکتا ہے ایک اردلی کی اتنی جرأت کیسے ہوسکتی ہے۔ نہیں نہیں مجھے یونہی وہم ہونے لگا ہے۔

اس روز کے بعد نہ جانے کیا ہوا۔ کرنل صاحب نے اُس پر حد سے زیادہ سختی اور ظلم کرنا شروع کر دیا۔ بات بے بات انہیں اس پر غصہ آتا تو وہ اسے جھڑکتے اور ذلیل کرنے لگتے۔ ایک روز تو حد ہوگئی۔ بیگم باہر گئی ہوئی تھیں ان کے گھر میں گھستے ہی انہوں نے پیٹی اتار لی اور اسے بے دردی سے مارنا شروع کر دیا۔ اس کا قصور بہت ناقابلِ معافی تھا۔ وہ فروٹ منڈی سے صبح سویرے جو تربوز لایا تھا وہ مکمل طور پر سرخ نہیں بلکہ اندر سے سفید یعنی کچا تھا۔

''تجھے سودا صحیح لانے کی تمیز نہیں ہے؟ نالائق، میرے پیسے ضائع کروادیئے تو نے۔۔۔''

وہ اسے دھنا دھن پیٹ رہے تھے اور بکتے جا رہے تھے۔

''نہ ظلم کریں اس بے چارے پر۔۔۔'' بیگم صاحبہ زبان پر قابو نہ رکھ سکیں اور بیچ میں بول پڑیں۔ بُت مظلوم کو بچانے کے لیے انہوں نے ہاتھ آگے بڑھا دیا تو اس پر بھی ایک ضرب لگی۔

''پاگل ہوئی ہو! ہاتھ پیچھے ہٹاؤ اپنا۔ اس بے شرم کو میں سبق سکھا کر رہوں گا۔ آج کے بعد اسے ہمیشہ یاد رہے گا کہ تربوز کے اندر کا رنگ کیسا ہونا چاہیے؟''

انہوں نے زور سے اپنی بیلٹ کو گھما کر بُتِ مجبور کی کمر کے گرد چوٹ لگائی وہ تڑپ کر بولا ''مجھے معاف کر دیں''۔

''صاحب جی۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ یہ اندر سے لال نہیں ہے۔ دکاندار نے گارنٹی دی تھی میرا اس میں کوئی قصور نہیں''۔ یہ سن کر کرنل سبحان کے ہاتھوں میں اور طاقت بھرتی چلی گئی۔ اس واقعے کے بعد وہ بالکل خاموش رہنے لگا۔ اب اس نے بیگم صاحبہ سے نظریں ملانا بھی چھوڑ دیں تھیں وہ سمجھ گیا تھا کہ وہ نوکر ذات ہے، اسے اپنی حد سے تجاوز نہیں کرنا چاہیے۔ بس کسی طرح سے میری نوکری بچی رہے۔۔۔ یہ سوچ کر وہ خود کو سمجھا بجھا کر بہلانے کی کوشش کرتا رہا۔ بیگم صاحبہ کو لگا جیسے وہ اس سے ناراض ہوگیا ہو۔ وہ اکثر اس کی بلوری آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کرتیں مگر وہ اپنی نگاہیں اوپر ہی نہ اٹھاتا۔ گھر میں عجیب اداسی اور بیزاری کی فضا قائم ہوگئی تھی۔ وہ سوچنے لگیں پھیکے پھیکے رنگوں کی خوبصورت دھنک، ایک بار بھولی بھٹکی ان کے دل کے ویران آسمان پر ابھری تو تھی مگر اب پھر تپتی دھوپوں کا موسم چلا آیا تھا۔

صبح اخبار پڑھتے پڑھتے بیگم صاحبہ نے کرنل سبحان کے سامنے ہی اسے پہلی بار اپنے کپڑے استری کرنے کو کہا تو وہ سر جھکا کر ''جی بیگم صاحبہ'' کہہ کر ان کے کپڑے اٹھا کر چلا گیا۔ کرنل صاحب کا یکبارگی تو خون کھول اٹھا مگر وہ اُس کے سامنے بیگم کو کچھ کہنا نہ چاہتے تھے مگر انہیں رہ رہ کر یہی خیال آتا رہا کہ اس ناہنجار دوٹکے کے اردلی کو میری بیوی کا کام کرنا، اس کے خوبصورت کپڑے استری کرنا کتنا اچھا لگ رہا ہوگا۔ ان باریک ملائم مہین کپڑوں پر ہاتھ پھیرتا وہ نہ جانے کیا سوچ رہا ہوگا۔ کہاں کہاں جا پہنچ رہے ہوں گے اس خنزیر کے خیالات۔

یہ سب سوچتے سوچتے کرنل صاحب کو از حد وحشت ہونے لگی۔ وہ گھبرا کر سوچنے لگے ''یہ سالا تو مجھے نفسیاتی مریض بنا دے گا۔ اسے واپس رجمنٹ بھجواتا ہوں اور کوئی اور اردلی منگواتا ہوں'' انہوں نے دل ہی دل میں فیصلہ کر لیا کہ اب جلد ہی اسے فارغ کر دیں گے۔

اگلے روز نہ جانے کیا ہوا۔ وہ پھر وہی غلطی کر بیٹھا۔ منڈی سے تربوز لایا اور چپکے سے بیگم صاحبہ کے آگے رکھ دیا۔ چھری اور بڑی سی ٹرے بھی پاس ہی رکھ دی اس روز اس نے سیاہ کرتہ شلوار پہن رکھا تھا جس میں اس کی مردانہ وجاہت مکمل طور پر نکھر کے سامنے آ رہی تھی۔ ''ماشاءاللہ'' بیگم نے اسے دیکھتے ہوئے زیر لب کہا اور تربوز کاٹتے کاٹتے نہ جانے کیسے اپنی انگلی کاٹ بیٹھیں۔

''بی بی آپ کا دھیان ہے کدھر آخر؟'' کرنل صاحب نے انگلی سے خون کی پتلی سی لکیر پھوٹتی دیکھی تو چیخ کر بولے۔ ساتھ ہی ان کی نگاہ کٹے ہوئے تربوز پر جا پڑی۔

''اوئے بے وقوف، جاہل، بے عقل آج پھر ویسا ہی تربوز اٹھا لایا ہے؟ انہوں نے سفیدی مائل کچے تربوز کو ہوا میں بلند کر کے زور سے کہا:

''او باسٹرڈ تجھے کوئی عقل بھی ہے یا نہیں؟'' وہ غرّائے

اردلی اپنی جگہ سے یوں اچھلا جیسے اسے کسی بھڑ نے کاٹ لیا ہو۔

''کرنل صاحب جی۔ مجھے یہ گالی نہ دیں'' وہ بھی جواباً چیخا۔ میجروں، کرنیلوں کے درمیان رہتے رہتے اسے اس گالی کا مطلب اچھی طرح پتہ چل گیا تھا۔

''گالی نہ دوں باسٹرڈ؟ میں تو تیری چمڑی ادھیڑ دوں گا'' پھر سفید تربوز اٹھا لایا ہے۔

کرنل صاحب نے اپنی چمڑے کی پیٹی کھول لی۔

معاف کر دیں جی مجھے پتہ نہیں تھا کہ تربوز کتنا لال ہونا چاہیے۔ وہ منت کرنے لگا۔

''تربوز اتنا سفید بھی نہیں یہ دیکھیں گلابی سا تو ہے'' زلیخا بے چین ہو کر بولیں۔ نہ جانے کیوں اس کا دل بے طرح گھبرانے لگا تھا۔

''گلابی نہیں لال ہونا چاہیے۔ لال۔۔۔'' کرنل صاحب نے پیٹی گھما کر زور سے اردلی کو مارنا شروع کر دیا۔ ان کے منہ سے مغلظات بھی جاری ہو گئیں۔

پھر نہ جانے کیا ہوا۔۔۔ بت منجمد کو بھی غصہ آ گیا اس نے پھرتی سے ایک زقند بھری اور میز پر پڑی چھری کرنل کے بڑے سے پھولے ہوئے پیٹ میں گھونپ دی۔ سرخ سرخ خون کا فوّارہ اُبلا اور زمین پر گر کے لکیریں بنانے لگا۔

''زلیخا'' کرنل سبحان کے حلق سے گھٹی گھٹی چیخ نکلی۔

''کیوں کرنل صاحب۔۔۔ تربوز کو اتنا لال ہونا چاہیے۔ بتایئے کرنل صاحب اندر کا یہ رنگ ٹھیک ہے نا؟'' وہ ہذیانی کیفیت میں چیختا اور وار کرتا چلا گیا۔

☆

..... رشتے .....

فلم، ڈرامہ، ناول، افسانہ، اداکاری، صداکاری کی دنیا کے نامور تخلیق کار جناب انل ٹھکّر نے ادب کو شغل یا تفریح کا ذریعہ بنانے کے بجائے ہمیشہ معاشرتی ناہمواریوں کی نشاندہی کو اوّلیت دی ہے۔ زیرِ نظر ناول

..... رشتے .....

میں جناب انل ٹھکّر نے نہایت راست فکری سے سماج کے مزاج، معیار اور روزمرّہ لین دین سے متعلق ان گنت معاشرتی بیماریوں کی کچھ اس طرح نشان دہی کی ہے کہ ہر باب اور اُس میں درج ہر قصّہ اپنے گردوپیش کی جیتی جاگتی کہانی محسوس ہوتی ہے۔

..... رشتے .....

قریب تین صد صفحات مجلد، عمدہ کاغذ، اعلیٰ طباعت کے ساتھ ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، گولا مارکیٹ، دریا گنج، دہلی پر فقط تین صد ہندوستانی روپے کے عوض دستیاب ہے۔

''صنم تراشیدہ''

آغا گل

(کوئٹہ)

ہمارے استاد ذی وقار عنائیت اللہ ڈائریکٹر جنرل سول سروس اکیڈمی لاہور نے محسوس کیا کہ افسر نہ تو سول (شائستہ) بن پائے ہیں اور نہ ہی سرویئنٹ (عوام کے خادم) تو مئی ۱۹۸۱ء میں ہمیں تین ماہ کے لیے حوالہ فوج کر دیا گیا۔ یہ ایک نہایت ہی غیر شاعرانہ موسم تھا۔ غضب کی گرمی، اس پر حبس کا عالم۔ مجھ جیسے مہم جو تو خوش ہوئے کہ چند ماہ ڈائریکٹر جنرل کی ڈانٹ ڈپٹ اور خشمگیں نگاہوں سے دور رہیں گے۔ مگر پپوٹائپ افسر جنہیں ممّی بچپن سے ہی کار میں اسکول لایا لے جایا کرتی بے حد پریشان ہوئے کیونکہ فوج میں ریشمی یا ململ کی وردی پہننے کی اجازت نہ تھی۔ علاوہ ازیں انہیں یہ بھی خدشہ تھا کہ کہیں جان چھڑانے کے لیے فوج کشمیر نہ بھجوا دے جہاں وہ جہاد کے نام پر خندقوں میں رومانی ناول پڑھنے پر مجبور ہوں۔ مجھ صحرائی کو لاہور میں متعین کیا گیا۔ ہمیں اجازت تھی کہ پوسٹنگ پر اعتراض ہو تو بریگیڈ کمانڈر کے گوش گزار کر سکتے ہیں۔ میں نے بھی انٹرویو مانگا اور عرض کی کہ مجھے جنگلوں بیابانوں میں لگایا جائے۔ بریگیڈ کمانڈر سخت متعجب ہوا کیونکہ لاہور کی پوسٹنگ کے لیے تو ایک زمانہ لگ جاتا ہے۔ میں نے بتلایا کہ بلوچستان سے میرا تعلق ہے میں دشت و جبل اور کھلی فضاؤں کا عادی ہوں۔ جبکہ لاہور میں انسان ہی انسان ہیں۔ ایک اینٹ اٹھاؤ تو دو انسان نکل آئیں۔ ایسا اژدھام کہ میرا دم گھٹتا ہے۔ بریگیڈ کمانڈر زیر مونچھ مسکرایا ''بارڈر پہ جاؤ گے؟'' عرض کی مجھے چاہے چولستان لگا دیں مگر انسانوں کے بے ہنگم ہجوم سے بچائیں عین نوازش ہو گی۔ بریگیڈ کمانڈر کا اس نرالے مطالبے پر دل یوں پسیجا کہ آخر کار یہ فیصلہ ہوا کہ مجھے فائیو بلوچ رجمنٹ میں لگا دیا جائے جوان دنوں باڈر ڈیوٹی پہ تھی۔ وہیں بریگیڈ میجر سے ملاقات ہوئی جو میرے بھائی میجر احمد گل کا کورس میٹ نکلا اس نے کچھ اسرار و رموز سمجھائے مبارکباد بھی دی کہ پرانے یونٹوں کی اپنی روایات ہوا کرتی ہیں۔ فائیو بلوچ رجمنٹ کی قابل رشک تاریخ ہے۔ مجھے اکیڈمی سے سامان لانے کے لیے ڈھائی ٹن کا ٹرک مرحمت ہوا۔ بڑے سے ٹرک میں اکیڈمی پہنچا تو لوگ خوفزدہ ہو گئے کہ شائد فوجی حملہ ہو گیا ہے۔ ان کی تشفی اور تسلی کی۔ پھر اپنا بیگ اسی ٹرک میں رکھ کر یہ گیت گنگناتا بارڈر کی جانب روانہ ہوا۔

''اے مردِ مجاہد جاگ ذرا اب وقتِ شہادت ہے آیا''

پیچھے مڑ کے دیکھا تو میرا بیگ دل مضطر کی طرح اچھل کود کرتا ٹرک کے مختلف گوشوں میں سر پٹک رہا تھا۔ بارے میں سائیفن کی پوسٹ پر پہنچا۔ مجھے خدشہ تھا پھدکتا ہوا بیگ باہر نہ گر چکا ہو الحمدللہ بیگ موجود تھا۔ یہاں میرا تعارف کرنل شفیق نیازی سے کرایا گیا۔ میجر اشفاق پرویز کیانی، میجر شفیع قریشی، میجر جہانیاں، کیپٹن خالد اور دیگر افسروں سے ملا۔ ایک عدد خیمہ برائے رہائش مجھے عطا ہوا۔ یہ فرمودہ بھی ملا کہ مجھے وردی پہننی ہو گی۔ عرض کی اس جنگل میں درزی کہاں تلاش کروں۔ یہ جان کر دل ناتواں کو فرحت ہوئی کہ چونکہ میں باقاعدہ فوجی نہیں ہوں۔ ہر مطلوبہ شے مجھے لون پر مل سکتی ہے۔ وطن عزیز بھی لون پر زندہ ہے قلبی مسرت ہوئی کہ میرے تین ماہ بھی بہ خیر و خوبی لون پر ہی گزریں گے۔ اُن کے پاس کسی موٹے تازے فوجی کے ناپ کی وردی موجود تھی، وہی مجھے پہنا دی گئی۔ اس پر ایک PIP سکینڈ لیفٹیننٹ کا بطور ریںک لگا دیا گیا۔ شائد فوج نے کبھی حالات سے مجبور ہو کر گینڈے کی کھال کے بوٹ بنوائے تھے۔ کمبخت بوٹ کیا لوہے کا شکنجہ تھا۔ اس کی بجائے ننگے پیر چلنا بہتر تھا۔ مگر فوج نے اجازت نہ دی کہ وردی کے لوازمات اور پروٹوکول ملحوظ رکھنا ہو گا۔ یوں لگتا کہ تازہ ریںک کے باعث لنگڑا کے ابّا کی وردی میں چلا جا رہا ہوں۔ اس وقت تو مجبوری تھی مگر بعد میں سائز کے مطابق وردی مہیا کرنے کی نوید سنائی گئی۔ میں نے فوجی میس (Mess) ہی دیکھے تھے۔ آرمی کلبوں میں کھانا کھایا تھا یہ شہزادہ بدر منیر والا فوجی ماحول پہلی بار ملا تھا۔ بدر منیر کی تو حاتم طائی دل جوئی کر دیا کرتا یہاں تو یہ عالم کہ باہر درجہ حرارت چالیس ڈگری ہوتا تو خیمے میں اڑتالیس ڈگری۔ اس خیمے میں استراحت فرماتے ہوئے یوں لگتا کہ جیسے کسی تندور میں آ گھسا ہوں۔ ساتھ ہی ایک لمبوترا خیمہ تھا جس پہ دُور سے محمل لیلیٰ کا گماں ہوتا۔ یہ واش روم تھا۔ جی میں آتا کہ اکیڈمی جا کر ڈی جی کے قدم لوں اور برمحل مصرعہ سناؤں ''کر ساری خطائیں معاف میری تیرے در پہ میں آن گرا'' مگر مجھے تین ماہ کی فوجی جیل کاٹنی تھی ورنہ تو مجھے Renegade قرار دے دیا جاتا یہاں بجلی بھی نہ تھی۔ ہمارا میس ایک دہشت ناک بنکر میں تھا۔ کھانا کھاتے خوف آتا کہ چھت ہی نہ آ گرے۔

میرے فرائض منصبی میں وردی پہن کر اونگھنا اور جمائیاں لینا شامل تھا۔ فوجی افسر اپنے کاموں میں تندہی سے مصروف رہتے۔ جیپوں میں اِدھر اُدھر نکل جایا کرتے۔ واقعی لاعلمی بڑی نعمت ہے چونکہ مجھے کوئی کام آتا نہیں تھا مجھے ڈیوٹی ہی نہ دی جاتی۔ ایک جنگی مشق میں جبکہ گینڈے کی کھال والے ادھارے جوتے میں مارچ کر رہا تھا تو بار بار گمان ہوتا کہ حبس اور گرمی میں بیہوش ہو کر گر ہی نہ پڑوں۔ یہ تو تسلی تھی کہ ہٹالین اٹھالے گی مگر خفیہ جائزے سے یہ دہشت ناک انکشاف ہوا کہ کسی جوان کے سر پر چار پائی نہیں ہے۔ مجھے وہ اٹھاتے کیسے؟ کہیں گمنام شہید کا کتبہ لگا کر آگے ہی نہ بڑھ جاتے۔ اسی سے پہلے کہ میں وطن کی راہ میں جان دیتا مجھے ایک ٹینک پر سوار کرا دیا گیا۔ جس سے جان میں جان آئی۔ ٹینک بالکل لیاری کی گدھا گاڑیوں کی طرح اچھلتا کودتا چلا جاتا

ہے، مضبوطی سے نہ پکڑا جائے تو کیا عجب سوار اس کے Tracks میں گر کر چوہا چاپر ہو جائے۔ ٹینک کو سڑک کی بھی ضرورت نہیں ہوتی جہاں چاہا راستہ بنا لیا۔ دل ہی دل میں سوچا جب اللہ نے توفیق دی تو کار کی بجائے ٹینک کی خریدوں گا نہ رش کی پرواہ نہ ہی ٹکر لگنے کا خطرہ۔

میں نے کمانڈینٹ شفیق نیازی سے فریاد کی کہ لاکھ سویلین سہی مگر میں عسکری خاندان کا فرد ہوں مجھے کوئی کام دیا جائے۔ بیکار بیٹھے سے سبکی ہوتی ہے معیوب سا لگتا ہے کہ یونٹ کے افسر اور جوان تو جان لڑا رہے ہوں اور سویلین ڈھیلی وردی پہنے درختوں تلے بیٹھا رہے۔ اس سے تو ہارا کاری ہی بہتر ہے۔ کرنل نیازی نے مجھے ڈاک سے متعلق کام تفویض کیا۔ اور یہ کہ اہم ملکی خبریں روزانہ پیش کیا کروں۔ تاریخ میں میری دلچسپی سے متاثر ہو کر مجھے یونٹ کے ریکارڈ کی مدد سے اس کی تاریخ مدون کرنے کا کام بھی سونپا گیا۔ ہمارا یونٹ ڈھائی سو برس سے سلامت تھا۔ پہلے پہل اس کا نام غوث کی پلٹن تھا۔ اعلیٰ کارکردگی کے سبب اس یونٹ کو برما بٹالین کے نام سے Raise کیا گیا۔ کارہائے نمایاں انجام دینے، دلیری اور شجاعت کے باعث فائیو بلوچ رجمنٹ مقبول اور محترم ہوئی۔ غرض یہ کہ کام ملنے کے باعث طمانیت سی محسوس ہوئی۔ یوں میں اس یونٹ کا حصہ بن گیا۔ کرنل نیازی ممتاز کرکٹر عمران خان کے کزن تھے۔ تاریخ پہ انہیں عبور حاصل تھا۔ سہ پہر میں واک پہ مجھے ساتھ لے جاتے۔ تمام تر گفتگو تاریخ پہ رہتی۔ قبل ازیں میرا گمان تھا کہ فوجی محض بندوق چلانا اور لڑنا ہی جانتے ہیں مگر ان کے ساتھ رہ کر انکشاف ہوا کہ صاحبِ علم اور وسیع مطالعہ کے لوگ ہیں۔ ان میں حب الوطنی رکھ رکھاؤ اور قابل تقلید بھائی چارہ تھا۔

یہاں ایک نئی اصطلاح کا علم ہوا On Prade میں افسر شیر کی آنکھ سے دیکھتے۔ ان کا مکمل پروٹوکول ہوتا۔ ذرا ایک سے دوسری بات کی تو وہ جان نکال لیتے۔ مگر ڈیوٹی کے بعد Off Prade ہونے پر بھائی چارہ لوٹ آتا۔ کمانڈنٹ میس میں لفٹین سے تبادلہ خیال کرتے، لطیفے بھی سن لیا کرتے۔ پورا یونٹ ایک خاندان کی طرح تھا۔ میں جلد ہی ان سب سے گھل مل گیا ان کے دکھ سکھ سانجھے تھے۔ یونٹ ایک گھر کی طرح تھا۔ یونٹ میں آتے تو سارے سائیٹ ملیریا ختم غم ختم کے نعرے کی طرح ختم ہو جایا کرتے۔

سہ پہر میں فرصت رہا کرتی میں نے خاندانی مرغ قریبی گاؤں سے منگوا کر ان کی سجی بنائی تو افسروں کو بہت پسند آئی۔ اب سجی کی فرمائشیں ہونے لگیں۔ مگر شرط یہ تھی کہ میس کی جانب سے مرغ منگوائے جائیں گے۔ ایسے میں ہم اپنی مدد آپ کے تحت تفریحاً جنگل سے خشک لکڑیاں اکٹھی کرتے، آگ جلاتے اور سجی بنایا کرتے۔

میجر شفیق قریشی مجھے اپنی شارٹ گن دے دیا کرتے جس سے میں شکار کرتا پھرتا۔ میجر اشفاق کیانی باقی افسروں سے قدرِ مختلف تھے۔ وہ سنجیدہ سے رہتے۔ وہ Professionally Sound تھے۔ زیادہ وقت اور توجہ فوج اور فوجی امور پہ مبذول رکھتے۔ کیپٹن خالد سے البتہ خوب گپ شپ رہتی۔ وہ میرا Next Door Neighbour بھی تھا یعنی ساتھ کا خیمہ اسی کا تھا۔ رات میں خوب قصے کہانیاں چلتیں۔

مجھے جی تھری بندوق طلب کرنے پہ بھی نہ دی گئی کہ Wild Boar کا شکار کروں۔ مجھے بتلایا گیا کہ گولی کی رینج بہت زیادہ ہے چونکہ ہر سمت جنگل ہے اور قد آدم ایلی فینٹ گراس بھی ہے۔ سمت کا اندازہ بھی نہ ہو پاتا۔ پگڈنڈیاں بھی ادھر اُدھر گھوم جاتیں۔ یہاں چلتے ہوئے چہرے کے دائیں بائیں ہاتھ بلند رکھنے پڑتے مبادا قد آدم گھاس آنکھوں کو زخمی نہ کر دے۔ گولی غلطی سے دشمن کے علاقے میں چلی جاتی تو اسے اشتعال انگیز کاروائی یا حملہ تصور کیا جاتا۔

فوجی افسروں نے مجھے بھی تاکید کر رکھی تھی کہ شارٹ گن سے شکار کرتا زیادہ دور نہ جاؤں۔ اگر بھٹک کر دشمن کے علاقے میں جا نکلا تو چونکہ میں فوجی نہیں ہوں وہ مجھے جاسوس گردانیں گے۔ جنگی قیدی اور سپاہی کا تو عالمی طور پر احترام کیا جاتا ہے مگر جاسوس کی درگت بنتی ہے۔ مجھے پہلو میں بیٹھے گھات لگائے دشمن کا ہمہ وقت خوف رہتا۔ کبھی آمنا سامنا ہوتا تو اس شارٹ گن سے جس میں چار نمبر کے کارتوس تھے کچھ بھی نہ کر پاتا۔ میرے پاس شارٹ گن کے Slugs بھی ہوتے تو ذرا ڈھارس بندھی رہتی۔ میں دشمن سے دل ہی دل میں خائف بھی رہا کرتا کہ جانے کب شب خون ماریں یا غفلت میں ہی آ لیں۔

ایک روز افسر کہیں نکلے ہوئے تھے۔ میں نے اکیلے ہی شام کے لیے ہفتہ وار سجّی بنائی۔ نہا دھو کر لباس بدلنے کیلئے مخمل لیلیٰ میں گیا۔ غسل کیا ہی تھا کہ اتنے میں کہیں سے ایک سانپ چلا آیا اور باہر نکلنے کی جگہ پہ پرال میں جا چھپا۔ ایک بار تو دل میں آیا کہ خیمہ کاٹ کر ارشمیدس کی طرح نعرے لگاتا باہر بھاگ جاؤں مگر یوں بڑی سبکی ہوتی۔ جیسے تیسے تیار ہوا اردلی کو آواز دی کہ سجی کے پاس پڑی قصابوں والی چھری اندر پھینک دے۔ چھری ہاتھ میں لے کر میں پرال پر ٹوٹ پڑا۔ دیوانہ وار چھریاں چلائیں تو پرال کے ساتھ ہی سانپ کے بھی دو ٹکڑے ہو گئے۔ بہت خوشی ہوئی کہ موذی کو مار ڈالا۔ ان دنوں بھارتی فلموں میں عموماً ریکھا اچانک ناگن بن جایا کرتی پھر گھوم پھر کے دوبارہ ایک میک اپ زدہ عورت میں منقلب ہو جایا کرتی۔ سانپ اگر ریکھا بن کر یونٹ میں آتا تو مجھے ازحد خوشی ہوتی مجھے ریکھا کا پرکار کے دائروں سے بنا جسم خوبصورت لگتا۔ چہرے کی ملاحت اور آنکھیں اچھی لگتی تھیں۔ یہ الگ بات کہ میرا کمانڈر ناراض ہوا مگر خیر۔ شیخو نے بھی تو انارکلی کے لیے مغل اعظم کو تپا دیا تھا۔ اور میرا تو کورٹ مارشل بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ کیونکہ میں سیویلین تھا اور نہ ہی جنگل میں اینٹ نام کی کوئی چیز تھی کہ کمانڈر مجھے دیوار میں چنوا دیتا۔ البتہ کئی ایک انگریزوں کی کتابوں میں پڑھ رکھا تھا کہ ایک سانپ کو مار ڈالو تو اس کی آنکھوں میں مارنے والے کی تصویر رہ جاتی ہے جسے دیکھ کر اس کا جوڑی دار قاتل کا پیچھا کرتا ہے اور انتقام لیے بغیر نہیں چھوڑتا۔ میں نے سانپ کے ٹکڑے سلگتے کوئلوں پہ ڈال دیئے اور کچھ

ٹہنیاں اوپر بھی رکھ دیں کہ خاک ہو جائے۔ ساتھی کو خبر ہونے تک سانپ کا یہ بھی پتہ نہیں چلتا کہ نر ہے یا مادہ۔ دوسرا سانپ رنڈوا ہوا ہے یا بیوہ۔

یہ چٹا ابھی سلگ ہی رہی تھی کہ دو کیپٹن اور ایک لفٹین چلے آئے۔ میری جواں مردی کی تعریف کی اور سانپ کو آگ میں ڈالنے کا سبب پوچھا۔ میں نے اپنا سارا علم ان پر لنڈھا دیا۔ بات آئی گئی ہوگئی۔

رات میں ہم بنکر میں کھانا کھا رہے تھے کہ ایک اژدھے کا ذکر چل نکلا۔ معلوم ہوا کہ دشمن کے علاقے میں رہتا ہے۔ جس کے باعث آج تک مارا نہ گیا۔ گھاس میں رینگ رینگ کر آتا ہے گھات لگائے رہتا ہے موقع پاتے ہی چھوٹے چھوٹے جانور منہ میں دبوچ لیتا ہے اور دوبارہ دشمن کے علاقے میں چلا جاتا ہے۔ دشمن چونکہ ناگ دیوتا کی عزت کرتا ہے اژدھے کو وہ کچھ نہیں کہتے بلکہ اس کی تواضع کے لیے دودھ کی بالٹیاں رکھ دیتے ہیں۔ مجھے سینے میں سانس رکتی ہوئی محسوس ہوئی۔ کیا پتہ اژدھا اسی مقتول سانپ کا جد امجد یا ابّا جان ہو میں نے گھبرا کے سوال کیا ''اب تک اسے مارا کیوں نہیں؟''

کیپٹن خالد نے آہ بھری ''کیا کریں ساٹھ برس سے کوششیں ہو رہی ہیں وہ کمانڈو ٹائپ کا اژدھا ہے رینگتا ہوا آتا ہے گھنٹوں دم سادھے پڑا رہتا ہے۔ گھات لگائے انتظار کرتا ہے۔ انسان پر بھی حملہ کرتا ہے اور یوں نکل جاتا ہے''

بنکر سے واپسی پر میں نے احتیاط سے قدم اٹھائے ہر لہراتی جھاڑی اور آہٹ پر اژدھے کا گمان ہوتا۔ اب شارٹ گن ساتھ لئے پھرنا بھی تماشہ سا بن جاتا۔ واحد ہتھیار جسے چھپایا جا سکتا تھا وہ چھری تھی اسے احتیاط سے پنڈلی کے ساتھ باندھ لیا کرتا۔ چھری اژدھے پر کس قدر کارگر ہوگی اس میں بھی تذبذب تھا کیونکہ مجھے بتلایا گیا تھا کہ اژدھے کی عمر ننانوے برس ہے۔ سو برس کا ہوا تو پھر اپنی شکل بدلنے پر بھی قادر ہوگا۔ کیا عجب کچھ مال پانی دے کر شناختی کارڈ بنوالے اور حسب معمولی جعلی ووٹوں کے ذریعے ہمارا صدر ہی بن جائے۔

میں نے اردلی کو کچھ رقم دی کہ قریبی گاؤں سے ایک ٹارچ خرید لائے، قریب ترین گاؤں بھی خاصا دور تھا چونکہ وہ فوجی تھا ایلی فینٹ گراس میں چھپی پگڈنڈیوں میں راہ تلاش کرتا کسی طور شام تک ٹارچ خرید لایا۔ فلمی ہیرو مولا جٹ کا گاؤں بھی اسی علاقے میں تھا۔ یہ ایسا دشوار گزار علاقہ تھا کہ ڈاکو تو کیا اژدھا بھی ایسا کیموفلاج رہتا کہ ڈھونڈے نہ ملتا۔ میرا بس چلتا تو ہنومان کی طرح یہ جنگل ہی اٹھا لیتا اور جا کے جھالاوان میں رکھ دیتا۔ اس اژدھے کا انسان سے خدا مارے کا بیر تھا۔ اژدھے کے سبب میں رات کو باہر نکلتا تو چاندنی رات کے باوجود ٹارچ جلائے رکھتا۔ اس کی روشنی دائیں بائیں ڈالتا رہتا۔ مبادا کہ اژدھا اچانک حملہ آور ہو تو میں نپٹ نہ پاؤں۔ تعجب اس بات پہ تھا کہ صرف کیپٹن اور لیفٹیننٹ ہی اژدھے کے دہشت ناک واقعات سنایا کرتے کبھی کسی میجر یا پھر کمانڈو نے اس بارے میں بات نہ کی۔ ایک بار میجر کیانی سے میں نے دریافت کیا ''اس جگہ پر سنا ہے کہ سانپ اور اژدھے بھی ہوتے ہیں''

میجر کیانی نے لاپرواہی سے جواب دیا ''ظاہر ہے کہ یہ ایک جنگل ہے ایسی جگہوں پر تو ایسی چیزیں ہی پائی جاتی ہیں''

میجر اشفاق پرویز کیانی نے مجھے غور سے دیکھا ''کیوں خیر تو ہے''۔

میں بوکھلا گیا فوجی کیا کہیں گے سیویلین افسر حشرات الارض سے خائف ہے۔ میں بھی مصلحت کے تحت خاموش رہا اور موضوع بدل دیا ان ہی دنوں خیمے میں سرخ رنگ کا ڈیڑھ فٹ لمبا ہزار پا چلا آیا۔ پورا سرخ اور درمیان میں کالا تھا۔ اسی چھری کے ذریعے میں نے اس کا خاتمہ کیا۔ اژدھے کا خوف مزید راسخ ہوتا چلا گیا۔ فوجیوں سے چھپ چھپا کر میں پتھر پہ چھری تیز کرتا رہتا۔ وہ کچھ زیادہ تیز تو نہ ہوئی بلکہ پتلی ہوگئی۔ ایک جانب دشمن کا ساتھ اس کے ہمراہ اژدھے کا خوف، حبس، شدید گرمی اور تندور ٹائپ خیمے۔ مجھے ڈر پیدا ہوا کہ کہیں چارلی چپلن کی مانند میرا نروس بریک ڈاؤن ہی نہ ہو جائے۔

میرے کندھے پر ایک PIP لگایا گیا تھا۔ خدا کی ذات اکیلی اچھی لگتی ہے۔ اکیلا PIP مجھے اچھا نہ لگا۔ سوچا کہ تین چار لگا لوں تا کہ رونق تو رہے۔ لہٰذا میں نے اپنے بیٹ مین کو ہدایت دی

''یہ ایک دانہ اور بھی لگاؤ''

اس نے لاہور سے جہاں ہمارے یونٹ کا Rear تھا منگوالیا اور میرے شولڈر پر سجا دیا۔ اگلے روز میں دفتر پہنچا جسے میں مہاجر کیمپ کہا کرتا تھا تو داد و تحسین کا شور مچ گیا ''مبارک۔ مبارک۔ پروموشن مبارک ہو۔ اب تو پارٹی ہونی چاہیے''۔

مجھے گماں نہ تھا کہ میرے کندھوں کو ایسے غور سے دیکھا جائے گا۔ میں گھبرا کر کمانڈر کے دروازے پر آیا اور باریابی کی اجازت چاہی۔ میرا رینک دیکھ کر کمانڈر کو بھی حیرت ہوئی۔ کمانڈر کے کسی سوال سے پہلے ہی میں نے درد بھری کہانی سنا ڈالی۔

کمانڈر نے کچھ دیر تو ہنسی روکی اور بریک مار مار کر اسے مسکراہٹ پہ ہی ہالٹ کرا دیا۔ پھر مجھے تاکید کی کہ:

''او کے! میں کہہ دوں گا میں نے پروموشن دی ہے، مگر مزید PIP نہ لگانا خصوصاً گول گول شکل کے''

شام میں میری جانب سے پروموشن پارٹی دی گئی۔ سبھی افسر ہنستے مسکراتے اپنے خیموں کی جانب گئے تو جونیئر افسروں نے اسی منحوس اژدھے کا ذکر چھیڑ دیا اور ساتھ ہی ساتھ اس کی خونچکاں داستانیں بیاں کیں پھر مجھ سے سوال کیا کہ میں رات کھانا کھانے کے لیے ٹارچ جلائے، روشنی دائیں بائیں لہراتا بھلا کیوں آتا ہوں۔

میں نے بتایا کہ یوں اژدھا دکھائی دے گا۔ وہ انجانے میں وار نہ کر سکے گا۔ اسے چھٹی کا دودھ یاد دلا دوں گا۔ انہوں نے نیا انکشاف کیا کہ اژدھا محض زمین سے وار نہیں کرتا بلکہ درختوں پہ چڑھ جاتا ہے۔ اپنی دم شاخوں سے لپیٹ کر

اوپر سے نیچے بھی وار کرتا ہے۔ یہ ایک نئی افتاد آن پڑی۔ اب میں رات میں کبھی زمین پر روشنی پھینکتا کبھی اوپر درختوں میں۔ درختوں کی شاخوں سے لپٹا اژدھا تلاش کرتا۔ عجب دشواری تھی۔ دل ہی دل میں دعائیں مانگتا کہ اول تو اژدھے سے مڈبھیڑ ہی نہ ہو۔ خیریت سے اکیڈمی واپس چلا جاؤں۔ وہاں کے ڈائریکٹر جنرل لاکھ سخت سہی کم از کم اژدھے تو وہاں نہیں ہوتے۔ قدرِ نعمت بعد از زوال۔ اب مجھے اکیڈمی کی قدر ہوئی۔ حالانکہ اس کے ساتھ بھی ایک مقام کو قینچی کہا جاتا ہے اور اکیڈمی آر۔اے (رائیل ایئر فورس) بازار کے ساتھ واقع ہے۔ آر۔اے اور قینچی یا ڈی جی کی گھر کیاں اس اژدھے کے مقابل میں کچھ بھی نہ تھیں۔

یہ دن سولی پہ گزرے۔ جب میں یونٹ سے واپس ہوا تو نہایت محبت سے مجھے ڈائین آوٹ کیا گیا۔ فائیو بلوچ رجمنٹ میں گراں قدر خدمات انجام دینے پر مجھے یونٹ کی شیلڈ بھی دی گئی۔ میں نے وہ تھیلا نما قمیض اور گینڈے کی کھال والے بوٹ دیگر فوجی سامان کے ہمراہ یونٹ کو واپس لوٹا دیئے۔ میں اچھی یادیں اور شیلڈ ساتھ لے جا رہا تھا۔ اس رات جونیئر افسروں نے مجھے گھیر لیا اور ہنستے ہوئے انکشاف کیا کہ پورے علاقے میں کوئی بھی اژدھا نہیں ہے۔ تفریح کے لیے انہوں نے خود ہی یہ کہانی گھڑ لی تھی اور سبھی مل کر مزید رنگ آمیزی کیا کرتے، میرا خون خشک کرنے کے لیے وہ ہر شام اژدھے کے نت نئی Episode سنایا کرتے۔ حیرت سے میرا منہ کھلا رہ گیا۔ ہماری جان گئی۔ آپ کی اداٹھہری خود پہ بھی غصّہ آیا۔ ایک انجانے خوف میں زندگی کے کئی ماہ ضائع کر دیے ایک ایسے دشمن سے ڈرتا رہا جس کا وجود ہی نہیں ہے۔ سچ کہا ہے کسی نے کہ انسان خدا نادیدہ کی جگہ صنم تراشیدہ رکھ دیتا ہے۔ Deification یا انجانا ذہنی خوف مارے ڈالتا ہے۔ پھر ان کے قہقہوں میں خود بھی شامل ہو گیا۔ میں نے پنڈلی سے بندھی چھری جھاڑیوں میں پھینک دی۔ اس رات پہلی بار پاؤں پھیلا کے سویا۔

اگلی صبح ڈھائی ٹن ٹرک کی بجائے جیپ مجھے لاہور پہنچانے کے لیے آئی تھی میرے ملے جلے تاثرات تھے۔ اس تکلیف دہ جنگل لائف سے نکلنے کی مسرت تھی اور ساتھ ہی ساتھ فائیو بلوچ رجمنٹ سے بچھڑنے کا ملال تھا۔ جس رجمنٹ نے مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا میری بدحواسیوں اور Discipline کو خندہ پیشانی سے برداشت کیا۔ مجھے Family Feeling دیں۔ مجھے خیال آیا ہے کہ اب کہاں اس جنگل میں آنے کا موقع ملے گا بہتر ہے کہ لگے ہاتھوں دشمن کو بھی دیکھتا چلوں۔ دو دو ہاتھ تو نہ ہوئے دیدار ہی کرتا چلوں کہ کس قدر خون آشام اور خون خوار ہیں۔ میں ساتھیوں سے اجازت لے کر واچ ٹاور کی جانب بڑھا۔ سبھی مجھے رخصت کرنے کے لیے جمع ہو رہے تھے کیا افسر کیا جوان۔ سینئرز تو رات کو ہی خدا حافظ کہہ گئے تھے۔

مارے تجسس کے میں دوڑ کر واچ ٹاور کے قریب پہنچا ایک جوان سے دوربین لے لی۔ سیڑھیاں چڑھتا میں کھڑا ہوا۔ بادلوں کی وجہ سے دھندسی چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ یہاں سے بخوبی دشمن کا جائزہ لیا جا سکتا تھا۔ میں نے دشمن کی جانب رخ کیا۔ دوربین آنکھوں سے لگائی فوکس درست کیا اور دشمن کے علاقے کا مشاہدہ کرنے لگا۔ مجھ پہ حیرت کے خلیفت اور چلتن ٹوٹ پڑے۔ دور ہریالی میں ایک مندر تھا۔ چھتنار درخت اور فرلانگ بھر کے فاصلے پر ایک مسجد تھی جس کے پہلو میں کسی صوفی کا مزار تھا جس پہ سبز جھنڈا لہرا رہا تھا۔ کسان ہل چلا رہے تھے۔ کھیتی باڑی میں مصروف فصلیں سینچ رہے تھے۔ ڈھڈے پیڑ بہار دکھا رہے تھے۔ عورتیں روزمرہ کے کاموں میں مصروف تھیں۔ داہنے ہاتھ آبِ جو پہ اپنے بچے نہلا رہی تھیں۔ کپڑے دھو رہی تھیں۔ لڑکے کتابیں بستے لئے اسکول جا رہے تھے۔ کچھ نوجوان تالاب پر مویشیوں کو پانی پلا رہے تھے۔ ایک مرد بڑے انہماک سے چارہ کر رہا تھا۔ سفید رنگ کی چند گائیں جگالی کرتی دُمیں ہلاتیں پگڈنڈی پہ دھن میں رواں دواں تھیں۔ میرے پاؤں تلے سے مچان نکلی جا رہی تھی۔ دوربین کا وزن بڑھتے بڑھتے ناقابل برداشت ہوتا چلا گیا۔ میرے ہاتھ لرزنے لگے تو دوربین میرے ہاتھوں سے چھوٹ گئی اور کسی پتھر کی طرح واچ ٹاور کے نیچے ایستادہ مسلح سپاہی کے سر پہ آن گری۔

''بند مٹھی''

نپولین بونا پارٹ کی جرأت و بہادری کے بے شمار قصّے اور کہانیاں تاریخ کے اوراق میں بکھرے پڑے ہیں۔ ان قصّوں اور کہانیوں میں نپولین کی نسبت بہت حد تک مبالغہ آرائی کی گئی ہے۔ اصل میں نپولین بونا پارٹ اس حد تک ضعیف الاعتقاد شخص تھا کہ گھر سے باہر قدم رکھنے سے قبل اپنے ستارہ شناس سے باہر کا احوال دریافت کرنا نہ بھولتا تھا۔ ''واٹرلو'' کی جنگ جس میں روس کے ہاتھوں نپولین کو شکست ہوئی پہ در پہ فتوحات کے نشے میں اپنے ستارہ شناس سے مشورہ کیے بغیر نپولین نے جنگ کا طبل بجا دیا۔ ستارہ شناس کو واپسی پر صورت حال کا علم ہوا تو وہ بونا پارٹ کے پیچھے میدان جنگ کی طرف دوڑ پڑا۔ میدان جنگ کے قریب پہنچ کر بھی وہ بونا پارٹ سے ملاقات میں کامیاب نہ ہو سکا۔ نپولین کی شکست کے بعد جب فوجیوں کی لاشیں اکٹھی جا رہی تھیں تو اُس میں ایک لاش ستارہ شناس کی بھی تھی۔ اس کے ایک ہاتھ کی مٹھی بند تھی اور اُس مٹھی کے اندر پرچی تھی جس پر لکھا تھا ''نپولین آج تمہاری زندگی کا منحوس ترین دن ہے''

○

''محبت کے افسانے''

ڈاکٹر رینو بہل
(چنڈی گڑھ، بھارت)

ستمبر کی ایک سہانی شام، صبح کی ہلکی ہلکی بارش نے موسم کو خوشگوار بنا دیا تھا۔ لوگ سکھنا جھیل پر موسم کا مزا لینے اُمڈ پڑے تھے۔ جھیل کے اُس پار گھنا جنگل اور اُس کے پیچھے سینا تانے کھڑی لشوالک پہاڑیاں۔ بھیڑ سے دُور سیڑھیاں اُتر کر جھیل کے کنارے بیٹھے اُن لہراتی بل کھاتی لہروں نے بھی مسرت اور سکون میں اضافہ کر دیا تھا۔ شام ڈھل گئی فلک پر پورا چاند اپنے حسن و جمال کے ساتھ روشن ہو گیا۔ جھیل کے اُس پار کولی کی پہاڑیوں پر ٹمٹماتی روشنیاں جھیل میں دکھتا چاند کا عکس مجھے اس قدر محو کر گیا کہ میں اپنے ہی وجود سے ان بھیگ ہو گئی۔ کسی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

''تم وہی ہو نہ جو افسانے لکھتی ہو''

''افسانے تو میں لکھتی ہوں۔ کہو کیا بات ہے؟''

''میں جاننا چاہتا ہوں تم افسانے کیوں لکھتی ہو؟''

''یہ بات تو میں خود سے کئی بار پوچھ چکی ہوں۔ بہت سوچنے پر یہ سمجھ میں آیا کہ میں کسی کے لیے نہیں بلکہ خود کے لیے لکھتی ہوں''

''خود کے لیے؟ وہ کیوں؟''

''کبھی کبھی مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میرے ذہن کی تہہ در تہہ کے اندر ایک دریا بہتا ہے جس میں کبھی ماضی کی یادیں، کبھی حال کے درپیش آنے والے مسائل، کبھی اردگرد کا ماحول، کبھی کھلی آنکھوں سے دیکھے خواب تو کبھی ادھوری خواہشوں کی موجیں اٹھتی ہیں، ٹکراتی ہیں، دل پر دستک دیتیں ہیں اور کبھی کبھی اُن کی رفتار اتنی تیز ہو جاتی ہے کہ خیال کی کڑی جڑ پکڑ لیتی ہے۔ پھر وہ خیال مسلسل دستک دینے سے ذہن کے ایک گوشے میں عارضی گھر بنا لیتا ہے۔ چلتے پھرتے، سوتے جاگتے وہ جڑ پنپنے لگتی ہے اس سے مختلف کردار اپنی صورتیں لئے اُبھرنے لگتے ہیں اور اپنی ایک دنیا بسا لیتے ہیں۔ پھر جب اُن کی رفتار تیز ہو جاتی ہے اور وہ پودا پھول بن کر کھل اُٹھتا ہے تو اپنی مختصر سی زندگی کو بھرپور جینے کے لیے دباؤ ڈالنے لگتا ہے۔ اور اس دباؤ سے بڑھتی بے چینی سے نجات پانے کے لیے اس پھول کے مرجھانے سے پہلے اُسے توڑ کر اُس پودے کو جڑ سے اکھاڑ کر ذہن سے کاغذ پر اُتار دیتی ہوں۔ وہ گوشہ کسی دوسرے خیالات کے لیے خالی ہو جاتا ہے جیسے ایک کرایہ دار نے دوسرے کے لیے وہ گھر وہ کمرہ خالی کر دیا ہو۔ جب اُس پھول کا وجود کاغذ پر سمٹ جاتا ہے تو مجھے راحت محسوس ہوتی ہے۔ اسی لئے کہتی ہوں میں افسانے خود کے لیے لکھتی ہوں۔

''کہنے والے کہتے ہیں تمہاری کہانیاں ہمیشہ رشتوں کے اردگرد ہی گھومتی ہیں۔ کیا یہ صحیح ہے؟''

''ہم یہ کہتے ہیں کہ ادب زندگی ہے اور زندگی رشتوں کے بغیر بے معنی ہے اس لیے تینوں کا رشتہ گہرا ہے۔ صدیوں سے رشتوں پر ہی تو لکھا جا رہا ہے۔ وقت کے ساتھ معاشرے کے حالات بدلتے ہیں۔ قدریں بدلتی ہیں، تہذیب بدلتی ہے مگر رشتے تو ہمیشہ موجود رہتے ہیں صرف ان کی گرماہٹ یا وقار میں ہی تبدیلی آتی ہے۔ کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے:

بتائے جاؤ محبت کے لاکھ افسانے
جنوں وہی ہے دیوانے بدلتے رہتے ہیں

کہانیاں تو وہی ہیں صرف لکھنے والے کا اندازِ بیان مختلف ہوتا ہے۔ رشتے تو ہر کہانی میں ہوتے ہیں صرف اُن کی نوعیت مختلف ہوتی ہے۔

''تم خود ایک عورت ہو پھر بھی تم عورتوں کے کردار کی خامیاں کیوں بیان کرتی ہو؟''

''میں عورت ہوں اسی لیے عورت کی خامیاں، اُس کی خوبیاں، اُس کی کمزوریاں، اُس کی طاقت، اُس کی نفسیات، اُس کی فطرت سے بخوبی واقف ہوں۔ عورت صنفِ نازک بھی ہے ایک لحاظ سے نصف بہتر بھی ہے اور ایک طرح سے مرد کو جنت سے نکلوانے والی بھی۔ عورت کا ایک پہلو اُس کے قدموں تلے جنت کا بھی ہے۔ ایک مغربی مفکر نے کیا خوبصورت بات کہی ہے۔

''عورت زمین پر فطرت کی شاعری ہے اسی طرح جس طرح آسمان پر ستارے قدرت کے اشعار کی مانند ہیں''

کہتے ہیں جب عورت نفرت کرتی ہے تو مرد کو اُس سے ڈرنا چاہیے کیونکہ مرد کے دل میں بدی ہوتی ہے اور عورت کے دل میں اُس کے خلاف جذبہ۔ اسی لئے میرے افسانوں کی عورت خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ کہانیوں میں اُبھرتی ہے۔''

''میں نے تو یہ بھی سنا ہے کہ لوگ تُم سے اکثر پوچھتے ہیں کہ غیر مسلم ہو کر تم اردو میں کیوں لکھ رہی ہو جب کہ تمہاری مادری زبان پنجابی ہے؟''

''مجھے ایسے لوگوں کی سوچ پر حیرت بھی ہوتی ہے اور افسوس بھی۔ زبان، ادب اور محبت کا کیا کوئی مذہب ہوتا ہے؟ یہ تو ہر قید سے آزاد ہیں یہ تو وہ خوش رنگ ہوا ہے جس نے اِسے چھو لیا اُسی کی ہو گئیں۔ کم ظرف لوگ اِسے کبھی مذہب کبھی سرحدوں کے دائروں میں تقسیم کرتے رہتے ہیں۔

اُس نے دھیرے سے مسکراتے ہوئے ایک اور سوال چھوڑا:

''لوگ کہتے ہیں تمہاری کہانیاں Craftsmanship کے ہُنر سے محروم ہیں اور کسی بھی کہانی کا حسن افسانہ نگار کی Craftsmanship سے ہی نکھرتا ہے''۔

باقی صفحہ ۶۷ پر ملاحظہ کیجیے

ٹک ٹک دیدم

سید سعید نقوی
(نیویارک)

بڑا گھنٹا گھر شہر کے بالکل وسط میں تھا۔ شروع میں شاید اس کا رنگ سرخ رہا ہو مگر اب وقت کی گردنے اسے ایک ایسا رنگ دے دیا تھا جو صرف وقت ہی چن سکتا ہے۔ بلند اتنا کہ میلوں دور سے نظر آجائے۔ چوکور مینار کی طرز پر تعمیر کیا گیا تھا۔ اس کی ہر سمت پر لگی گھڑی بلکہ گھڑیال ہی کہیئے، بھی جہازی تھے۔ اہلیانِ شہر کے لئے فخر کی بات تھی کہ کوئی سو سالہ پرانے اس گھنٹا گھر کی سوئیاں کبھی نہیں رکی تھیں۔ اور پابند ایسی کی جب چاہیں سوئیاں ملالیں۔ کہنے والے تو یہاں تک بتاتے ہیں کہ جب گورے یہاں سے گئے تو انہوں نے بی بی سی کی سوئیاں اس سے ملالی تھیں اور اب بھی ہر سال موازنہ کر لیتے ہیں کہ کہیں ان کا وقت پیچھے نہ رہ جائے۔ حالانکہ ذرا سوچیئے اس بات کا کتنا امکان ہے۔ تو خیر، اس گھنٹا گھر کے اطراف کی عمارتیں بھی ذرا جگہ چھوڑ کر تعمیر کی گئی تھیں۔ شہر کی شان و شوکت بڑھانے لئے کچھ ایسی پلاننگ کی گئی تھی کہ کسی بھی وقت یہاں ہزاروں شہری جمع ہو سکتے ہیں یوں اسے مرکزیت سی حاصل ہو گئی تھی۔ آپ اسے قاہرہ کا طاہری چوک یا چین کا تیانامن چوک کہہ سکتے ہیں، لیکن جو تاریخ زمیں کے ان گول ٹکڑوں میں لکھی گئی تھی یہ گھنٹا گھر چوک ہنوز اس سے محروم تھا۔ حالانکہ لوگ اکثر آس لگا لیتے تھے کہ بھئی چوک تو مل گیا ہے اب ذرا سی آنچ کی کسر باقی ہے۔ نادان یہ نہیں جانتے کہ اس ذرا سی آنچ کو خونِ جگر درکار ہوتا ہے۔

عموماً گھنٹا گھر چوک پر چند درجن افراد موجود ہوتے تھے۔ چند ہاکر حضرات، کچھ بے فکرے، اور کچھ لوگ اپنی جلدی میں ایک طرف سے داخل ہو کر دوسری طرف نکلنے کی جلدی میں۔ روز کے معمول کے برخلاف اس وقت گھنٹا گھر چوک شہریوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ دائرے کی شکل کے چوک میں لوگ قطار اندر قطار کھڑے تھے۔ دائرے کے اندرونی حصے میں جو لوگ تھے وہ سب ٹکٹکی لگائے بڑے گھڑیال کو دیکھ رہے تھے، جیسے ابھی اس میں سے کوئی پرندہ نکل کر تبدیلی کی نوید دے گا۔ جب کہ بیرونی دائروں میں جمع لوگ اندرونی دائرے والوں کی پشت پر نظریں جمائے تھے، کہ اس بات کا علم کسی کو نہیں تھا کہ یہ سب لوگ یہاں کیوں جمع ہیں۔ یہ بھی عام سے انسانوں کا اجتماع تھا اور وہی انسانی نفسیات یہاں بھی کارگر تھی۔ چند لوگ ٹکٹکی باندھے ایک سمت میں دیکھنے لگیں تو تھوڑی سی دیر میں ایک اجتماعی تجسس وہاں جمع ہو کر اسی سمت دیکھنے لگتا ہے۔ بلکہ اگر آپ دیکھنا چاہیں تو سب مل کر آسمان پر تلوار دیکھ سکتے ہیں، گزرتے رتھ بھی دیکھے گئے ہیں اور چرخہ کاتتی بڑھیا بھی، یہ سب دیکھنے والوں کے حسنِ ظن پر ہے اور کچھ اس ضرورت پر کہ آسمان پر اس وقت کس معجزے کے نظر آنے کی ضرورت ہے۔ کچھ بیوقوف اسے اجتماعی نظر بندی کا نام دیتے ہیں مگر کہنے والوں کی زبان کس نے روکی ہے اور ہمارے ہاں تو ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو برا کہتے ہیں۔

یہ گھنٹا چوک میری روزانہ کی گزرگاہ ہے۔ یہاں سے کوئی چوتھائی میل کے فاصلے پر ایک بلند قامت عمارت کی بائیسویں منزل پر ایک دفتر میں کام کرتا ہوں۔ دوپہر کے کھانے کے لئے تقریباً روز ہی یہاں آجاتا۔ اور گھنٹا گھر چوراہے کے اطراف کسی ریسٹورانٹ میں کھانا کھا لیتا۔ باہر کی تازہ ہوا مل جاتی اور ذرا چہل قدمی بھی ہو جاتی۔ آج جو یہاں پہنچا ہوں تو یہ چوراہا ایسا کھچا کھچ بھرا ہوا ہے کہ دوسری طرف پہنچنا ناممکن ہو گیا۔

''کیا قصہ ہے بھائی یہ لوگ یہاں کیوں جمع ہیں'' میں نے اپنے سامنے کھڑے ایک شخص سے دریافت کیا۔

''پتہ نہیں میں خود بھی یہی معلوم کرنے کے لئے رک گیا ہوں''۔

جب معلوم نہیں تو یہاں رک کر کیوں اپنا وقت برباد کر رہے ہو۔ میں نے اپنا سوال زبان تک نہیں آنے دیا۔ ہمارے شہر میں لوگوں کے پاس ایک ہی چیز کی فراوانی ہے اور وہ ہے وقت۔ دن کے کسی بھی وقت اگر آپ اپنے گھر، دکان یا دفتر سے باہر نکلیں تو ایسے سینکڑوں لوگ جنہیں کسی کام میں مصروف ہونا چاہیئے تھا، آپ کو بیکار اور بے مصرف بیٹھے، کھڑے یا لیٹے ملیں گے۔ وقت ان کے دائیں بائیں تیزی سے گزر رہا ہوگا، مگر وقت کی پرواہ وہی کرے جس کی پرواہ خود وقت کر رہا ہو۔

''ارے صاحب لگتا ہے گھنٹا گھر خراب ہو گیا ہے، وقت رک گیا ہے'' میرے دائیں ہاتھ پر موجود ایک صاحب بولے۔

''وقت رک گیا ہے، کیا مطلب؟''

''یہی کئی کئی گھنٹوں سے یہ گھنٹا گھر کام نہیں کر رہا''

''ارے تو گھنٹا گھر خراب ہو گیا ہوگا، انتظامیہ ٹھیک کروا دے گی، یہاں لوگوں کو تو بس مجمع لگانے کے لئے بہانہ چاہیئے''۔

''نہیں جناب گھنٹا گھر خراب نہیں ہوا۔ وقت رک گیا ہے، شہر کی تمام گھڑیاں رک گئی ہیں۔ وقت آگے نہیں بڑھ رہا''

''یہ کیسے ہو سکتا ہے؟'' میری نظر فوراً اپنی کلائی پر پڑی۔ واقعی میری گھڑی رکی ہوئی تھی اور دو گھنٹے پہلے کا وقت بتا رہی تھی۔

''لیکن''

''لیکن کیا؟''

''لیکن وقت رک گیا ہے کا مطلب ہے۔ اس کے کیا اثرات ہوں گے۔ رک گیا ہے تو رک جائے؟'' میرے سامنے کھڑے ایک شخص نے الجھ کر کہا۔

''یہی کہ اب ہم انسانی اور تہذیبی تاریخ میں جمود کا شکار ہو گئے ہیں۔ جب تک وقت کا پہیہ دوبارہ اپنی گردش شروع نہیں کرے گا، ہم تاریخ کے اسی گوشے میں پھنسے رہیں گے!''

''لیکن میرا کیا ہوگا؟ میری تو آج چھ بجے شادی ہے۔ گھڑی کی سوئی تو بارہ پر ہی اٹکی ہوئی ہے۔ بارہ بج کر ایک سیکنڈ ہونے سے انکاری ہے۔ اگر چھ نہیں بجیں گے تو میری شادی کیسے ہوگی'' ایک طرف سے روہانسی آواز آئی۔

''ارے میاں اسے عطیۂ خداوندی سمجھو کہ تمھیں بیوی سے بچا لیا'' کسی بیوی جلے کی آواز آئی۔

''اور مجھے اپنے بچوں کو چار بجے ہی اسکول سے لینا ہے۔ کیا وہ اسکول میں ہی رہیں گے، نہ چار بجے گا نہ بچوں کو اسکول سے لے سکوں گا۔'' ایک اور آواز ابھری۔ اب سارے مجمع کو پتہ چل گیا تھا کہ معاملہ کیا ہے۔ ہر طرف سے قسم قسم کی بولیاں سنائی دے رہیں تھیں۔ خلقت کو سمجھ میں یہ نہیں آرہا تھا کہ وقت نے ہمسفری سے انکار کر دیا تو وہ تاریخ کے اس موڑ سے کیسے آگے بڑھیں گے۔

''یہ وقت رک گیا ہے یا ہم اس کی مخالف سمت میں جارہے ہیں'' کسی دیوانے نے آگ لگائی۔

''کیا مطلب ہم پیچھے کی سمت کیسے لوٹ سکتے ہیں؟''

''بھئی اگر وقت ایک گھنٹہ آگے جارہا ہو، لیکن ہم اس سے ایک گھنٹہ پیچھے، تو ان دونوں سمتوں کی کشمکش میں ہمیں تو یہی لگے گا کہ وقت جیسے رک گیا ہو'' میرے دائیں جانب جو صاحب کھڑے تھے وہ کافی ذہین معلوم ہوتے تھے

''یعنی وقت کو دوبارہ چلانے کا ایک طریقہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ہم واپسی کا سفر روک دیں'' کسی اور فرزانے نے آواز لگائی۔

اب چوراہے پر کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی، جتنے منہ اتنے مشورے۔ کہنا تو یہ چاہئے کہ جتنے ذہن اتنے مشورے مگر اس کے لئے ذہن اور زبان میں ربط درکار ہوگا جو کچھ اتنا عام بھی نہیں۔ میری سمجھ میں یہ نہیں آرہا تھا کہ اگر وقت رک گیا ہے تو مجھے اب بھوک کیوں محسوس ہورہی ہے، صبح کا کھایا ہوا کھانا معدے میں ہی رک کیوں نہیں گیا۔ شاید بھوک وقت کی قید سے آزاد ہے۔ بھوک نے کتنی ہی بار ثابت کیا ہے کہ وہ زمان ومکان، جن اور عمر کی قید سے بالاتر ہے۔ میں نے بے چارگی سے پیٹ پر ہاتھ پھیرا، اس جمِ غفیر کو چیر کر اس وقت کسی غذا کی توقع رکھنا معجزے سے کم نہ ہوتا۔ میں نے بیچارگی سے کاندھے اچکائے۔ وقت سے انسان کا رشتہ تو بڑے بڑے فلسفیوں کی سمجھ میں نہیں آیا، میں کیوں اپنے آپ کو ہلکان کر رہا ہوں، میں نے اپنے آپ کو سمجھا لیا۔ مجھے اب نوکری کے لئے واپس لوٹنا چاہئے۔ لیکن وقت اگر تھم گیا ہے تو مجھے واپس جانے کی کیا ضرورت ہے، جس وقت میں کھانے کے وقفے کے لئے نکلا تھا، وقت تو اس سے آگے بڑھا ہی نہیں ہے۔ جب جانے کا وقت آئے گا تو چلا جاؤں گا اور جانے کا وقت اب آئے گا نہیں۔ لیکن اگر مینیجر کی گھڑی چل رہی ہوئی تو کیا ہوگا؟

''ارے جناب یہ زمان ومکان کا مسئلہ تو آئن اسٹائن سے بھی حل نہیں ہوا تھا۔ آپ کیوں فکر کر رہے ہیں، سارے شہر کی گھڑیاں بند ہیں'' میرے برابر میں کھڑے ہوئے صاحب واقعی بہت ذہین تھے، اپنی کلائی پر بندھی گھڑی کی جانب بار بار دیکھنے سے وہ میری بے چینی کو بھانپ گئے تھے۔ گھنٹا گھر کے اطراف مجمع اب زمین پر بیٹھ گیا تھا، لگتا تھا سارا شہر امڈ آیا ہے۔

''ان لوگوں کو ویسے بھی کہاں جانا ہے؟'' میرے پڑوسی نے زہر خند لہجے میں طنز کیا۔ ''گھر گئے تو بھوک منہ پھاڑے کھڑی ہوگی۔ ان کے لئے وقت کا منجمد ہونا تو گویا آسمانی تحفہ ہے۔ شام ہوگی تب ہی تو اگلے وقت کی بھوک کا انتظام کرنا ہوگا۔ آنے والے کل کی مصیبتوں اور صعوبتوں سے بھی محفوظ ہوگئے۔''

میں اس قنوطیت کے لئے بالکل تیار نہیں تھا۔

''ارے صاحب یہ کیا بات ہوئی۔ آنے والے کل میں کسی کی شادی، کسی کی پیدائش، کسی کی نئی نوکری، کسی کی پہلی تنخواہ، آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ کل تو اتنا دلفریب، اتنا پرامید،

اتنا پرکشش ہوتا ہے۔ کل کی آس ہی تو ہمیں رواں رکھتی ہے۔''

میں نے احتجاج کیا۔

''میاں، کیا مریخ سے اترے ہو؟'' میرا پڑوسی اب مڑ کر پوری طرح میری طرف متوجہ ہو چکا تھا۔

''کیا مطلب؟''

''بھائی، بہت سیدھا سادھا سا سوال ہے، کیا مریخ سے اترے ہو؟''

''ارے مریخ سے کیوں اترتا؟ اسی شہر کی پیدائش ہے میری۔' لیکن اس شہر میں بھی لوگ کل کے انتظار میں جیتے ہیں کہ شاید، شاید۔' میری آواز میں ناراضگی تھی

''تو کیا اس شہر کے کسی کنویں میں رہائش ہے آپ کی جو اس قسم کی گفتگو کر رہے ہو۔ مستقبل میں بہتری۔ لگتا ہے تمھارے گھر میں لغت نہیں۔ جا کر دیکھ لینا۔ م سے مستقبل ضرور ہوتا ہے لیکن ب سے بہتری نہیں۔''۔ پھر وہ اچانک ہنس پڑا۔ ''تم یقیناً گرامر اسکول میں پڑھے ہوگے، مجھے یاد ہے آکسفورڈ کی انگریزی لغت میں ایف سے فیوچر اور بی سے بیٹر مینٹ کے الفاظ موجود ہیں۔''

میں منہ کھولے پڑوسی کو حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ اسے کیسے پتہ چلا کہ میں گرامر اسکول میں پڑھا ہوں۔

''ارے میاں بقراط اب اس وقت کو کیسے چلایا جائے؟'' بہت سے لوگ اب ہماری گفتگو کی جانب متوجہ ہوگئے تھے، ان ہی میں سے ایک نے طنزیہ انداز میں آواز اٹھائی۔ باقی مجمع تو اب بھی گھنٹا گھر کی جانب متوجہ تھا لیکن ہمارے اطراف میں ایک بڑھتا ہوا مجمع ہم دونوں کے ساتھ گفتگو میں شریک ہوگیا تھا۔

''بھئی جس خدا نے ہر چیز بنائی ہے، اسی نے وقت بھی۔ استخارہ کرلیں وہی یقیناً راہ بھی سجھادے گا۔'' کسی صاحب نے صلاح دی۔

میرے پڑوس میں کھڑے شخص کی حیثیت اب ایک لیڈر کی سی ہوگئی تھی۔ لوگ جو جملے اچھال رہے تھے، سوال کر رہے تھے، حل بتا رہے تھے، ان سب کا رخ خود بخود اس کی طرف ہوگیا تھا۔ وہ بھی اس غیر متوقع سرافرازی پر

بہت خوش نظر آتا تھا۔ جو ساری عمر محنت کر کے لیڈری کماتے ہیں ان کی مسرت تو چھپائے نہیں چھپتی، یہاں تو حادثاتاً مل گئی تھی۔ اس نے ایک غیر محسوس طریقے سے یہ مرکزیت قبول کر لی تھی۔ اس نے اس جملے کا جواب نہیں دیا صرف مسکرا کر نفی میں سر ہلا دیا۔

''کیا مطلب آپ نفی میں کیوں سر ہلا رہے ہیں، کیا خدا کے پاس اس کا حل نہیں؟ کسی اور سمت سے آواز آئی۔

''بھئی دو چیزیں ایسی ہیں جنہیں خدا بھی نہیں چھیڑتا، ایک تاریخ اور دوسرا وقت'' میں اپنے پڑوسی کی مدد کو آیا۔

''نہیں چھیڑتا یا نہیں چھیڑ سکتا'' کہیں سے چیلنج کیا گیا۔

اب لوگوں کی ایک کثیر تعداد ہماری طرف متوجہ ہو چکی تھی۔

''یہ آپ کی ذہنی کیمیا پر منحصر ہے'' میں نے اطمینان سے جواب دیا۔ میں اس خطرے سے بے خبر تھا جو مجھے گھیر رہا تھا۔ اپنے لئے یہ خندق کھودتے دیکھ کر، میرا پڑوسی جیسے سرگوشی میں بولا:

''میاں مریخ سے نہیں تو باہر سے ضرور آئے ہو۔ ذرا دور ہٹ کے کھڑے ہو ورنہ اپنے ساتھ مجھے بھی مروا دو گے۔ اب اپنی یہ سیکولر چونچ بند رکھنا اور مجمعے کے کسی سوال کا جواب مت دینا۔''

''کیوں مرواؤں گا، کیا مطلب ہے تمہارا؟'' مجھے اپنی خوفزدہ سی آواز سنائی دی۔

''ہائے گرامر اسکول کے یہ گھامڑ۔ بند ذہنوں سے آزاد خیالی کی امید رکھتے ہیں۔ بھئی بند کمرے میں تو گھٹن ہی رہے گی ناں، تازہ ہوا کے لئے کوئی کھڑکی یا دروازہ تو کھولنا ہی پڑے گا۔ یہاں تو معمار یہ کہہ گئے ہیں کہ دروازہ یا کھڑکی کھولی تو گھر مسمار۔''

میرے چہرے پر شاید حماقت منجمد دیکھ کر وہ بے بسی سے بولا:

''بھائی کسی نادیدہ سمت سے کوئی گولی، کوئی جنت کا دلدادہ خودکش تمہاری سوچ کے پرکتر دے گا، چپ رہو یا پرے ہٹ کے کھڑے ہو۔ میں ابھی جینا چاہتا ہوں۔ وقت جاری ہو یا ساکت میں نے ابھی جینے کی آس نہیں چھوڑی، اور ہاں جینے کے گر بھی سیکھ گیا ہوں'' مجھے لگا اس نے مجھے آنکھ ماری ہے۔

''ارے بھئی آپ لوگ کس بحث میں پڑ گئے ہیں۔ اس امتحان میں ہمیں جب اللہ نے ڈالا ہے، تو وہ خود کیوں نکالے گا۔ وہ تو غالباً یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ اس کی دی ہوئی عقل ہم کیسے استعمال کرتے ہیں اور ہم کیا سبب پیدا کرتے ہیں'' اس نے مجمعے کی طرف دیکھ کر بلند آواز سے کہا۔

''تو بقراط تم ہی کوئی ترکیب نکالو'' اس طنزیہ جملے میں بھی ایک التجا ایک امید ضرور تھی۔

''ارے صاحب کمشنر صاحب کے انتظار میں ہی تو یہ مجمع جمع ہے، وہ ہی آ کر کوئی صورت نکالیں گے'' کسی اور صاحب نے آواز بلند کی۔

''کمشنر صاحب'' اب میرے پڑوسی سے بھی چپ نہ رہا گیا ''بلی سے دودھ کی رکھوالی کی امید کی جا رہی ہے''۔

مجمع یہ سن کر ہنس پڑا۔ اب قسم قسم کی آوازیں آنے لگیں۔ کچھ زندہ باد مردہ باد کے نعرے بھی لگنے لگے۔ لوگوں میں دبا دبا سا جوش با آسانی محسوس کیا جا سکتا تھا۔

''بقراط اپنی بات واضح کرو'' ایک آواز اٹھی۔ اب مجمعے کا موڈ ذرا سا بہتر ہو چکا تھا، توجہ مجھ پر سے ہٹ چکی تھی۔

''بھئی ان ہی لوگوں کی وجہ سے تو وقت رک گیا ہے۔ یہ وقت سے آگے آگے بھاگ رہے تھے۔ ان کے تعاقب میں تو وقت بھی ہانپ جاتا ہے۔ دوسری سمت بہت سے لوگ وقت کو گویا پیچھے کھینچ رہے ہیں۔ اس کھینچا تانی میں اور کیا ہوتا۔ حکمراں آگے بھاگ رہے ہوں اور وقت ان کے تعاقب میں۔ دوسری طرف ایک طبقہ وقت کو پیچھے کھینچ رہا ہو۔ تو وقت کا انجماد کیوں کر حیرت کا باعث ہے۔'' بقراط واقعی بقراط تھا۔

''پھر اس کا حل تو بہت دشوار نہ ہوا'' میرے ذہن میں ذہانت کی ایک بجلی سی کوندی۔ لوگ فوراً مڑ کر میری طرف متوجہ ہو گئے۔ پڑوسی نے غیر محسوس طریقے سے میرا ہاتھ دبایا، گویا میری گرامر اسکول کی اپج کو وارننگ دے رہا ہو۔ حدِ ادب یہاں زبان سینے، کاٹنے اور کھینچنے کے ماہرین جمع ہیں۔

''یا تو وقت کے آگے بھاگنے والوں کی طنابیں کاٹ دو تا کہ یہ وقت کے آگے بھاگنا بند کر دیں۔ نہ بھی بند کریں تو ہماری اوقات کا ان کے وقت سے رشتہ ٹوٹ جائے، وہ اپنے وقت کی لہر میں رہیں، ہم اپنے وقت کی۔ انہیں قابو نہ کر سکیں تو آزاد کر دیں۔ دوسری صورت یہ ہے کہ وقت کو پیچھے کی سمت کھینچنے والوں کو ماضی سے حال میں لے آئیں۔ صدیوں کی محرومیاں۔۔'' اس سے پہلے کہ میری بات مکمل ہوتی میرے بقراط پڑوسی نے میرا ہاتھ اس سختی سے دبایا کہ درد سے میرا منہ بند ہو گیا۔ کیا کہا آپ نے، درد سے منہ بند نہیں ہوتا بلکہ تکلیف کی شدت سے چیخ نکل جاتی ہے۔ آپ درست کہہ رہے ہیں مگر اس کی چیخ کے بعد کا مرحلہ بھول رہے ہیں۔ یقین نہیں آتا تو اپنے اطراف کی خاموشی پر کان دھریے۔

''تجویز تو گرامر کی اچھی ہے لیکن بلی کے گلے میں گھنٹی کون باندھے گا؟'' بقراط نے میرا مذاق اڑا کر گویا میری بات کی تمام تلخیوں کو مزاح کے مصالحہ تشرف سے دھو دیا۔

''بھئی بقراط اپنے دوست کو تو خاموش ہی رکھو'' نہ جانے کیوں مجھے یہ آواز جانی پہچانی سی لگی۔ پیروں کے بل اچک کر دیکھا تو اپنے مینیجر کی شکل نظر آئی، نظریں ملتے ہی اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے خاموش رہنے کی ہدایت کی۔

''بقراط تم بولتے رہو، ان صاحب کی باتیں تو احمقانہ ہیں'' مینیجر نے پھر آواز لگائی۔

اب گویا خاموشی میرے ذاتی مفاد میں تھی۔ مینیجر کی ناراضگی مول

لینا وقت کو کھو دینے کے مترادف تھا انجماد کو تو جانے ہی دیجئے۔

''وقت کو پیچھے کھینچ لینے میں حرج ہی کیا ہے، صرف آگے بھاگنے والوں کی طنابیں کاٹ دو۔ صدیوں پہلے بھی تو وقت چلتا ہی تھا، اسی رفتار سے چلتا رہے گا، ذرا نیکیوں کے امکانات کا تصور کیجئے۔ جو لوگ ہمارے شاندار ماضی، ہمارے نظامِ راشدین سے آگے بڑھنا چاہتے ہیں، ان کا وقت آ گیا ہے'' ایک باریش نوجوان جس کے کاندھے پر ایک انگوچھا پڑا تھا مجمعے کو کہنیوں سے ہٹاتا آگے بڑھنے لگا، اس کی نگاہیں مجھ پر پیوست تھیں۔

''ہاں بھئی بقراط کیا طریقہ نکالیں کہ وقت کا پہیہ دوبارہ گھومنے لگے'' مجھے تو لگتا تھا جیسے اب سارا مجمع اپنا رخ گھنٹا گھر سے موڑ کر ہماری طرف متوجہ ہو چکا ہے۔ ہزاروں کے اس مجمعے میں ہماری معمول کی آواز کی بحث کیسے ان تک پہنچ رہی تھی۔ یہ بہت حیرت انگیز بات تھی۔ شاید سارا مجمع ہی اپنے آپ سے اس بحث میں الجھا ہوا تھا۔ ہماری گفتگو تو بس ایک بازگشت تھی۔ ابھی بقراط نے کوئی جواب دیا بھی نہیں تھا کہ مجمعے میں ایک ہلچل سی پیدا ہو گئی۔

''کمشنر صاحب آ گئے، کمشنر صاحب آ گئے'' لوگوں میں ایک دبا دبا جوش تھا۔ آنکھوں میں امید کے دیپ جل اٹھے تھے۔ گھنٹا گھر کی منجمد سوئیاں مذاق اڑا رہی تھیں۔

بائیں جانب کا مجمع کائی کی طرح پھٹنے لگا۔ انسانوں کا سمندر حکمرانی کے لئے پھٹنے لگا۔ فرق صرف اتنا ہے کہ یہ موسیٰ اکیلے ہی اس راستے پر چل کر اپنی کھال بچا لیتے ہیں۔ درمیان میں جو جگہ بنی تو کمشنر صاحب اس سے گزرتے گھنٹا گھر کی جانب بڑھنے لگے، لیکن ان کے دائیں بائیں آگے پیچھے بہت سے بھاری بوٹ چل رہے تھے۔ مجمعے میں جو انبساط کی لہر سی دوڑی تھی وہ جھاگ کی طرح بیٹھ گئی۔ جوتوں کی آواز اور سنگینوں کے سر کیا نظر آئے، تبدیلئ اوقات کے امکانات معدوم ہونے لگے۔

''ابھی تو پچھلے قدموں کی دھول بھی نہیں جمی تھی کہ پھر'' بقراط نے شاید اپنے آپ سے کہا تھا۔ وہ زور سے کہتا تب بھی شاید کوئی نہ سنتا۔ سب آوازیں بھاری جوتوں کی دھمک میں دب گئی تھیں۔ ان جوتوں کی بناوٹ میں اس خوبی کا خاص خیال رکھا جاتا ہے کہ باقی سب آوازیں دب جائیں۔ میں نے داہنی جانب دیکھا تو وہ انگوچھا بردار جوان مجمعے کو کہنیوں سے ہٹاتا، اس سمندر میں خود اپنی جگہ بناتا تیزی سے ہماری سمت بڑھ رہا تھا۔ میں نے چاروں طرف نظر دوڑائی تو ایسے کئی نوجوان ہماری طرف بڑھتے نظر آئے۔

''ہاں بھئی بقراط کیا حل نکالیں'' ہمارے اطراف کا مجمع ان تبدیلیوں سے جیسے ناواقف بقراط سے حل طلب کر رہا تھا۔ لوگ جیسے ایک مسیحا کے انتظار میں خود اپنی ذہنی سوجھ بوجھ کھو بیٹھے تھے۔

بھاری جوتوں، باریش جنت کے طلب گاروں اور وقت کے آگے بھاگتے کمشنروں کے درمیان منجمد وقت کو دوبارہ چلانے کی کیا امید رہ گئی تھی۔

بقراط، اسے تو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔ اس کی گرفت میں میرا ہاتھ بہت تکلیف میں تھا۔ میں نے اپنا ہاتھ اس کی گرفت سے نکال کر بھاگنا چاہا، تو اس نے پکڑ کر کھینچ لیا اور ہم دونوں نیچے بیٹھ گئے۔ نہ چیونٹی دیکھو گے نہ کچلنے کو دل چاہے گا۔

بقیہ: محبت کے افسانے

''لوگ کہتے ہیں تو ٹھیک ہی ہوگا۔ دراصل میں ایک جذباتی انسان ہوں اور جذباتی فطرت والے لوگ دماغ سے نہیں دل سے سوچتے ہیں۔ میں سوچتی بھی دل سے ہوں لکھتی بھی دل سے ہی ہوں اور جس دن میں دماغ سے لکھنا شروع کر دوں گی شاید اُس وقت یہ ہُنر بھی حاصل کر لوں۔''

''میں دل سے یہ دعا کروں گا کہ رب آپ کو اس ہُنر سے نوازے اور۔۔۔۔''

میں نے اُسے بیچ میں ہی ٹوک دیا۔

''یہ تمہاری ذرّہ نوازی ہے کہ تم میرے لیے دعا کر رہے ہو مگر مجھے خوشی ہوگی اگر اس دعا سے پہلے تم یہ دعا کرو کہ ہمارے گھروں، شہروں، مُلک اور پوری دُنیا کی ماں، بیٹیوں کو آزاد، پُرسکون اور محفوظ ماحول ملے، اُنہیں عزت کی نگاہ سے دیکھا جائے۔ اُنہیں کوکھ کے اندر اور کوکھ کے باہر عزت سے جینے کا حق مل سکے۔ اس وقت سب سے بڑی دُعا کی ضرورت ہے''۔

ہم دونوں کبھی نہ ختم ہونے والی گفتگو میں محو تھے کہ مجھے کچھ منچلے نوجوانوں کی پھبتیوں نے چونکا دیا۔ میں نے اپنے اردگرد دیکھا میں بالکل تنہا تھی وہ کہیں نہ تھا اور رات کی سیاہی چار سو پھیل چکی تھی۔ ماحول کی نزاکت سمجھتے ہوئے میں تیز قدموں سے سیڑھیاں چڑھ کر لوگوں کے ہجوم میں شامل ہو گئی۔ میرے کانوں میں وہ پھبتیاں سیسے کی طرح پگھل رہی تھیں اور اپنی پشت پر جمی شراریں بھری نگاہیں مجھے اس بات کا احساس دلا رہی تھیں کہ وہ ہوس بھری نگاہیں میرا پیچھا کر رہی ہیں اور مجھے جلد ہی محفوظ جگہ پہنچ جانا چاہیے۔ میرے قدم اور تیز ہو گئے اور ذہن اس سے بھی تیز اڑنے لگا اُس سنہرے مستقبل کی اُور جہاں آنے والی بیٹیوں کی نسل کے لیے پُرسکون، محفوظ، آزاد ماحول ہوگا جب اس دنیا میں آنے پر اُن کا استقبال ہوگا اور وہ بے خوف آزاد پرندے کی طرح ۔کاش! ان جاگتی آنکھوں کا یہ خواب جلد ہی سچ ہو جائے۔

☆

''جوشِ جنوں''

محمود الحسن (راولپنڈی)

روئے زمیں سے کہکشاں تک پہنچ گئے
جوشِ جنوں میں لوگ کہاں تک پہنچ گئے

کچھ لوگ دُشمنی میں کہاں تک پہنچ گئے
کیا کیا دروغ ہیں جو زباں تک پہنچ گئے

تُم ہو کہ ہم پہ کر نہ سکے اِک نگاہِ لطف
ہم ہیں کہ لے کے ہدیہِ جاں تک پہنچ گئے

اس دورِ حادثات میں کیا کیا نہیں ہُوا
اہلِ یقیں بھی وہم و گماں تک پہنچ گئے

کِس کی نگاہ کا ہے کرشمہ کے دفعتاً
ہم سے خدائے کون ومکاں تک پہنچ گئے

تکلیفِ التفات گوارا نہ تھی جنہیں
جانے وہ کس طرح دل وجاں تک پہنچ گئے

کیسے کہوں کہ میں رہِ اُلفت سے آشنا
وُہ لوگ جو کہ آہ و فغاں تک پہنچ گئے

جب دُوریاں تھیں اُن سے بہت دُوریاں سی تھیں
یہ کیا ہوا کہ وہ رگِ جاں تک پہنچ گئے

اہلِ ستم بھی دیکھ کے حیران کیوں نہ ہوں
نالے کہاں تھے اور کہاں تک پہنچ گئے

واعظ کا جوش صِرف زباں تک پہنچ سکا
سَر اور تھے جو نوکِ سِناں تک پہنچ گئے

محمودؔ ہم بھی کھاتے زمانہ کی ٹھوکریں
خوش قسمتی سے پیرِ مُغاں تک پہنچ گئے

آصف ثاقب
(بوئی، ہزارہ)

کوئی سی قدرِ بالا ہے زمیں پر
ستارہ گرنے والا ہے زمیں پر

ترا سہرا فلک پر سج رہا ہے
مرے زخموں کی مالا ہے زمیں پر

فلک سے کون اُترا ہے شکاری
یہ کس نے جال ڈالا ہے زمیں پر

یہ کس نے روشنی روکی ہوئی ہے
کوئی تو دل کا کالا ہے زمیں پر

نکالے سے تھے نکلے بے سہارا
ہمیں کس نے سنبھالا ہے زمیں پر

بلندی پر کہاں جائیں گے ثاقبؔ
ہمارا ہر نوالا ہے زمیں پر

مشکور حسین یاد
(لاہور)

ہم آئے! حُجّتِ عالم تو سامنے آئے
ذرا فراستِ عالم تو سامنے آئے

ہم اپنے کام ابھی چھوڑنے کو ہیں تیّار
کہاں ہے فرصتِ عالم تو سامنے آئے

رکھے ہے واسطہ چھپ کر وہ علم و حکمت سے
کبھی حماقتِ عالم تو سامنے آئے

ہمارے آئینہ ہونے میں کچھ کلام نہیں
مگر وہ حیرتِ عالم تو سامنے آئے

سراپا گوش ہیں ہم اُس کی بات سُننے کو
کوئی شکایتِ عالم تو سامنے آئے

ہماری آنکھیں ترستی ہیں دیکھنے کو اُسے
وہ خوبصورتِ عالم تو سامنے آئے

ہم اختصار کو رکھ دیں گے اک طرف مشکورؔ
کوئی وضاحتِ عالم تو سامنے آئے

تجھے ملائیں گے ہم یادؔ اپنے نازک سے
ذرا نزاکتِ عالم تو سامنے آئے

○

پروفیسر خیال آفاقی
(کراچی)

مجھے یہ غم نہیں کہ میرے نالے بے اثر نکلے
مجھے دُکھ ہے تو یہ دُکھ ہے کہ وہ نامعتبر نکلے

اسے کیا کہیے اپنے ہاتھ پہ جو رکھ کے سر نکلے
وہ دیوانہ جو سُوئے جاں بہ اندازِ دگر نکلے

جسے سینے میں رکھا تھا ، وہی اپنا نہ ہو پایا
تو کوئی کیا کہے کہ دوست بھی دشمن اگر نکلے

زرا سویا ہی تھا رستے میں کہ شب خوں پڑا مجھ پر
جو دیکھا رہزنوں کو غور سے تو ہم سفر نکلے

ہمارے بعد کیا رہ جائے گا محفل میں اے ہمدم
تجھے بھی ساتھ لے جائیں گے محفل سے اگر نکلے

تلاشی لی گئی اجڑے ہوئے میرے نشیمن کی
تو کیا نکلا، فقط ٹوٹے ہوئے کچھ بال و پر نکلے

گلی کے پھیری والوں سے لیا کرتا ہوں میں سودا
کہ شاید ان میں ہی تیرا بھی کوئی نامہ بر نکلے

بنالیں کیوں نہ پہلے ہی سے کوئی بوریا گھر میں
نہ جانے کب کسی کے جلد آنے کی خبر نکلے

بہت چاہا کہ اپنے حال پہ بھی روئیں ہم لیکن
ہمارے اشک جب نکلے، ترے زیر اثر نکلے

خیالؔ اس آرزو میں ہم سخن کے پاس جاتا ہوں
کہ اس کی بات نکلے، گو کسی بھی بات پر نکلے

انتظار باقی
(جھنگ)

ریزہ ریزہ حیات ہے ساری
ایک جنبش کی بات ہے ساری

ہے سفر میں شدید بکھراؤ
رہگذر پات پات ہے ساری

ٹھوکریں کھا رہا ہے ہر کوئی
زندگی بے ثبات ہے ساری

جو کہانی ہے اس سمندر کی
چند موجوں کی بات ہے ساری

مجھ کو لے چل یہاں سے دُور کہیں
اس جگہ ذات پات ہے ساری

راہیوں نے جہاں پہنچنا تھا
وہ جگہ چند ہات ہے ساری

بزمِ انجم میں ہے تمہارا ذکر
رقص میں کائنات ہے ساری

میری قسمت کی تیرگی باقیؔ
اک اماوس کی رات ہے ساری

○

غالب عرفان
(کراچی)

محسوس تو ہوتے ہیں مخاطب نہیں ہوتے
آئینے میں کچھ عکس مناسب نہیں ہوتے

تہذیب کو تاریخ بنا دیتے ہیں لیکن
ہم اپنی ہی تقدیر کے کاتب نہیں ہوتے

تحریر جہاں ہوتی ہے کچھ حسبِ موافق
الفاظ وہاں حسبِ مراتب نہیں ہوتے

راس آتے نہیں آنکھوں کو سارے ہی منظر
رنگوں میں سبھی رنگ تو جاذب نہیں ہوتے

خود دار ہیں اور دار ہے پہچان ہماری
ہم جو بھی ہیں جذبات کے غاصب نہیں ہوتے

لمحات کا عرفانؔ جنہیں ہوتا ہے وہ لوگ
کیوں وقت کی رفتار پہ غالب نہیں ہوتے

○

''چہارسُو''

یوگیندر بہل تشنہ
(دہلی، بھارت)

ایسے دورِ حیات سے گاہے آدمی گذرے
سنانے کو جب کوئی نہ ہو، تنہائی پہرا دے

مسلط ہو جسم و جاں پہ تنہائی اس طرح
اپنا سا یہ بھی جب خود کو ہمسایہ لگے

بیگانگی کی وبا پھیلی ہے چہارسُو
جی چاہے اب کوئی ہمدمِ دیرینہ ملے

بیکراں خلا میں معلق قفسِ عنصری
ادراک و فہم اک مبہم سراب سا لگے

رنج و الم، کیف و نشاط یکسر لا اثر
عیّال و احباب، ماضی وفردا نفی کرے

لمحۂ لا یزل یہ کہتا محسوس ہو مجھے
خوابِ غفلت سے جاگ، بصیرت سے کام لے

ہر ذرّہ خیال بھی جامد ہو جہاں
''کوئی ہے'' جواس عالم میں بھی الگ تھلگ لگے

اے تشنہؔ! وہ تُو تھا کہ جسمِ خاکی ترا
عالمِ ابتلا میں بھی جوروشن دیا کرے

○

عبدالرحمٰن عبد
(نیویارک)

رفتہ رفتہ بال و پَر کی عافیت جانے لگی
تاجِ شاہانہ ملا تو سلطنت جانے لگی

کام کرنے کی سکت جب تھی تو کچھ فرصت نہ تھی
اور جب فرصت ملی تو ہر سکت جانے لگی

زندگی ہونے لگی سود و زیاں سے بے نیاز
گفتگو سے احتیاطِ مصلحت جانے لگی

پیکرِ خاکی نے آخر پا لیا اپنا مقام
کارِ روز وشب سے فکرِ منفعت جانے لگی

انتظارِ موسمِ گل ہے نہ خوشبوؤں سے کام
سوچ دنیا سے بسوئے عاقبت جانے لگی

اب بھروسہ کیجیے تو کون سی تخلیق پہ
ابنِ آدم سے تو سب انسانیت جانے لگی

وقت کی شمشیر کے آگے نہیں تدبیر کچھ
عبدؔ اب تو ہوش بھی، بے معذرت جانے لگی

○

پروفیسر حسن عسکری کاظمی
(لاہور)

دل ونظر میں سمایا رہا جمالِ غزل
خیالِ یار کی صورت رہا خیالِ غزل

ہر ایک نکتے پہ دل جھوم جھوم اٹھتا ہے
یہی ہے حاصلِ تخلیق اور مآلِ غزل

نثار حسن تغزل پہ فکر انساں ہے
یہی غزل کا ہے ماضی یہی ہے حالِ غزل

بیاض دل میں یہ تحریر بھی رقم کیجیے
کہ انتساب کی صورت رہا یہ سالِ غزل

یہی وہ صنفِ سخن ہے جسے عروج ملا
مرا یقین ہے ممکن نہیں زوالِ غزل

شام جاں میں یہ جھونکا کہاں سے آیا ہے
کھلا کہ اور بھی صحرا میں ہیں غزالِ غزل

غزل میں بات ہو لہجہ بھی منفرد ہو اگر
مری نظر میں ہے ہر اک شعر ہے کمالِ غزل

○

حنیف ساحل
(گجرات، بھارت)

صدائے بحر و بر آئے نہ آئے
مجھے اِذنِ سفر آئے نہ آئے

ہوا کا ہاتھ تھامے جا رہا ہوں
کوئی بہرِ سفر آئے نہ آئے

سمیٹو اپنے آنچل میں یہ لمحے
یہ خوشبو پھر ادھر آئے نہ آئے

ہوائیں سرد ہوتی جا رہی ہیں
پرندہ لوٹ کر آئے نہ آئے

عذابوں کا سمندر بہہ رہا ہے
دعاؤں میں اثر آئے نہ آئے

کیا ہے اس نے پھر ملنے کا وعدہ
یقین تو ہے مگر آئے نہ آئے

ہزاروں سال سے ہیں منتظر سب
چمن میں دیدہ ور آئے نہ آئے

غزل گوئی رہے تابندہ ساحلؔ
کوئی دادِ ہنر آئے نہ آئے

○

صدیق شاہد
(شیخوپورہ)

کسی بھی خام جذبے کا اثر اچھا نہیں ہوتا
جو ٹوٹے وقت سے پہلے ثمر اچھا نہیں ہوتا

نظر پڑتے ہی دل پر ایک قیامت ٹوٹ پڑتی ہے
کسی مہ رو کے مارے کو قمر اچھا نہیں ہوتا

بشر عیب و صواب اکثر بہم آمیز رکھتا ہے
جو صرف عیبوں کو ہی دیکھے بشر اچھا نہیں ہوتا

ہزاروں قصّے ماضی کے لیے بیٹھا ہے دامن میں
کہیں کیوں کہ خرابہ ہے، کھنڈر اچھا نہیں ہوتا

امیدیں اس ستم جو سے بندھی ہیں جو یہ کہتا ہے
جو نکلے دل کی خواہش کا وہ پر اچھا نہیں ہوتا

وسیلہ ہے ظفر کا ہر سفر تسلیم ہے لیکن
نہ ہو دل کا اشارہ تو سفر اچھا نہیں ہوتا

بظاہر دیکھنے میں کیسا بھی ہو دل کشا شاؔہد
فسادی جس میں رہتے ہوں وہ گھر اچھا نہیں ہوتا

○

انوار فیروز
(راولپنڈی)

جو آنسوؤں کی جھڑی تھی اسے پرونا تھا
لگا تھا داغ جو دامن پہ وہ بھی دھونا تھا

جو عمر بھر میں کمایا اسے بھی کھونا تھا
لکھا تھا جو بھی ازل سے وہی تو ہونا تھا

خبر نہ تھی کہ جدائی کے تیر برسیں گے
کسی یاد میں یوں آنکھ کو بھگونا تھا

اسی لیے تو کشادہ رکھا ہے اس دل کو
زمانے بھر کے غموں کو یہیں سمونا تھا

زمیں سے پیار تھا ہم کو اسی سے الفت ہے
یہی بچھونا ہے اپنا یہی بچھونا تھا

کھلا تھا جو مرے دل میں گلاب کی صورت
خبر نہ تھی کہ اسے خار زار ہونا تھا

زمانہ یوں تو مری دسترس میں تھا فیرؔوز
وہ اپنا بن نہ سکا اک یہی تو رونا تھا

○

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی

(بہار، بھارت)

مری آنکھوں سے آنسو جو رواں ہیں
سلوکِ دوست کے وہ ترجماں ہیں

بڑی معصوم تھیں جب آرزوئیں
مرے بچپن کے دن وہ گم کہاں ہیں

مجھے رکھا گیا ہے حاشیے پر
ابھی تو آپ ہی زیرِ بیاں ہیں

تجارت جو رہے کانٹوں کی کرتے
بنے پھولوں کے اب وہ پاسباں ہیں

کروگے کیسے انکارِ حقیقت
کہ ہم و جہہ شکوہِ آستاں ہیں

جو غیروں کے محل اونچے بناتے
یہ کیسا ہے ستم وہ بے مکاں ہیں

زمیں سے بھی تعلق اپنا رکھیں
نظر میں جن کی ہر دم آسماں ہیں

بتاتی ہے یہ تاریخِ وطن خود
کہ ہم بھی نازشِ ہندوستاں ہیں

مناظرؔ کیا غزل ایسے میں ہوگی
بگڑتے حال کے ہم نوحہ خواں ہیں

رب نواز مائل

(کوئٹہ)

ہمیں تو ایسا ہی ہر اِک سفر ہو
جو اُس پر پہلے سے بھی کچھ نظر ہو

بغیرِ صد تدبّر خوب ہو کیا
سو کرنے کو تماشا بھی ہُنر ہو

جسے پھولوں بھرا کہنا تو ہو کم
ترے چلنے کو بھی وہ رہگزر ہو

یہ جیسی بارشیں بارود کی ہیں
یہ دھرتی جانے کب پھر بے خطر ہو

بجز پیکر تراشی ہم تو بولیں
یہ انساں اور کیسے پھر اَمر ہو

جئیں گے کیا کہ جب بے چینیاں ہوں
ہنسیں گے کیا کہ جب ہر گام ڈر ہو

○

جاوید زیدی
(یو۔ایس۔اے)

نہ راستی میں نہ بے راہ روی میں دیکھ مجھے
جو دوست ہے تو مری ابتری میں دیکھ مجھے

میں دشتِ وحشت جاوید کا مسافر ہوں
فرات زیست مری تشنگی میں دیکھ مجھے

بکھر نہ جائے کہیں تلخیٔ حیات سے تو
جو تیرے لب پہ ہے اُس چاشنی میں دیکھ مجھے

اُٹھا کے آنکھ بھی دیکھا نہیں زمانے کو
جو ہو سکے تو مری کاہلی میں دیکھ مجھے

جو دیکھنا ہو تو پھر آ کے مل کبھی شبِ غم
بہ نام زیست مری خودکشی میں دیکھ مجھے

بس اعتدال میں رکھ التفات باہم کو
زیادتی میں نہ اپنی کمی میں دیکھ مجھے

مجھے تلاش نہ کر جانماز پر ساقی
وہ رندِ مست ہوں بس بے خودی میں دیکھ مجھے

ازل سے قید ہوں قدرت کے کارخانے میں
رہِ حیات کی بے چارگی میں دیکھ مجھے

○

رومانہ رومی
(کراچی)

وقت سے پہلے ہوئی شام، گلہ کس سے کروں
رہ گئے کتنے مرے کام، گلہ کس سے کروں

اپنی ناکام تمنا کا سبب میں تو نہ تھی
آ گیا مجھ پہ ہی الزام، گلہ کس سے کروں

دل ہراساں ہے بہت دیکھ کے انجامِ وفا
اے مری حسرتِ ناکام، گلہ کس سے کروں

اب تو وہ مجھ سے ملاتا ہی نہیں اپنی نظر
اب چھلکتے ہی نہیں جام، گلہ کس سے کروں

میرے قدموں نے مرا ساتھ کہاں چھوڑ دیا
منزلِ شوق تھی دو گام، گلہ کس سے کروں

ہجر کا روگ بھی رسوائی بھی پائی رومیؔ
پوچھ مت عشق کا انجام، گلہ کس سے کروں

○

''انتہائی مطلوب''

شہناز خانم عابدی
(کینیڈا)

گداگری کی لعنت کو انوری نے تقدیر کا لکھا مان کر قبول کر لیا تھا۔شوہر کی موت میں اس کو رب کی مرضی نظر آئی۔لیکن جب اس نے اپنے بیٹے سلیم کو معذور بنائے جانے کا سنا تو وہ ہار گئی۔۔۔

رشید البیلا۔۔۔چھ فٹ کا قد، بھاری جسم، سیاہ فام چہرہ، سرخ بڑی بڑی آنکھیں، سفید شلوار قمیض پہنے، گردن پر لال رومال ڈالے، پاؤں میں کشمیری سینڈل پہنے، منہ میں پان دابے ایک آرام کرسی پر نیم دراز تھا سامنے میز پر روپے پیسوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔برابر میں رکھی ہوئی کرسی پر ایک رجسٹر لئے رحمت بیٹھا تھا جو سب کے لئے زحمت تھا۔بھکاری آتے جاتے اپنی دن بھر کی کمائی ہوئی پونجی میز پر رکھتے جاتے۔رحمت رجسٹر میں ہر ایک کے نام کے ساتھ ان کی دی ہوئی رقم بھی لکھتا جاتا اور ان پیسوں میں سے تھوڑے سے پیسے ان کے ہاتھ میں رکھ دیتا۔

''یہ کیا۔؟'' اپنی چھوٹی چھوٹی، گول گول آنکھیں نکال کر اس نے پیسوں والا ہاتھ انوری کی طرف کرتے ہوئے کہا۔جو سب سے آخر میں اپنی کمائی دینے آئی تھی۔

وہ خاموش کھڑی رہی۔

رحمت، رشید البیلا کو متوجہ کرتے ہوئے بولا ''صرف سو روپے''

''کیا کرتی رہی پورا دن۔؟'' رشید البیلا زوردار آواز میں گرجا۔

''صاب جی میں تو تمام دن ہاتھ پھیلائے اِدھر سے اُدھر بھاگتی رہی۔۔۔مگر۔۔۔میرے نصیب۔۔۔''

''یہ نصیب وصیب کچھ نہیں ہوتے۔۔۔آج اس کو کچھ مت دو کل سے سالی خود زیادہ کما کر لائے گی۔'' رشید البیلا نے پیک تھوکنے کے بعد اگالدان رکھتے ہوئے کہا۔

''صاب جی میرے پاس تو ایک پائی بھی نہیں ہے۔صبح سے میں بھوکی ہوں۔۔۔اور وہ میرا بیٹا بھی۔۔۔'' انوری کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

''ارے ہاں !اب تو تیرا بیٹا بھی بھیک مانگنے کے قابل ہو گیا ہو گا۔رشید البیلا نے اپنی کلائی پر بندھی قیمتی گھڑی میں وقت دیکھتے ہوئے کہا۔

''صاب جی میرے بیٹے کو معاف کر دو میں اسے پڑھانا چاہتی ہوں۔اسے اس دھندے سے دور رکھنا چاہتی ہوں۔'' انوری نے ہاتھ جوڑ کر گڑگڑاتے ہوئے رشید البیلا کی کشمیری جوتی پر اپنا سر رکھ دیا۔''

''کل سے اسے اڈے پر بٹھا دینا۔'' رشید البیلا نے رحمت کی طرف دیکھ کر کہا۔اور ہاں۔۔۔اس سے دور۔'' انوری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا اور دس روپے اس نے انوری کے ہاتھ پر رکھ دیئے۔

رحمت نے شرارتی نگاہیں انوری کے بدن پر ڈالتے ہوئے اپنی گردن رشید البیلا کی جانب موڑی اور بڑے بڑے پیلے دانت نکوس کر بولا ''بالکل دادا! آپ فکر ہی نہ کریں۔''

انوری پر تو جیسے بجلی گر پڑی۔اس کے سارے خواب چکنا چور ہو گئے۔وہ اپنے آنسو پونچھتے ہوئے جب جھونپڑی میں پہنچی تو سلیم سو چکا تھا۔وہ جانتی تھی رحمت نے یہ سب کچھ کیوں کیا ہے۔اس کے شوہر کی موت کے ساتھ ہی وہ انوری کے گرد منڈلانے لگا تھا۔جب زیادہ تنگ کرنے لگا تو انوری نے دھمکی دی کہ وہ رشید البیلا سے اس کی شکایت کر دے گی۔رشید البیلا کے نظامِ حکومت میں عورتوں سے جنسی بیگار لینے کی اجازت نہیں تھی۔عورتوں اور لڑکوں سے بھیک منگوانے کے علاوہ کوئی اور کام نہیں لیا جاتا۔عورتیں اور لڑکے بڑی حد تک محفوظ تھے۔بھکاری بھی نکاح پڑھوائے بغیر ایک دوسرے سے جنسی تعلقات نہیں رکھ سکتے تھے۔اگر کوئی ایسا کرتے ہوئے پکڑا جاتا تو سخت سزا کو پہنچتا۔رحمت شادی شدہ تھا انوری اس کے لئے شجرِ ممنوعہ تھی۔پھر بھی وہ اس کو گھیرنے کی کوشش کر رہا تھا۔شاید اس کو اس بات کا گھمنڈ تھا کہ وہ رشید البیلا کے کیمپ کا منشی، منتظم اور سب کچھ تھا۔اس کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔

دوسرے ہی دن صبح سویرے رحمت انوری کی جھونپڑی پر آ پہنچا اور دانت نکالتے ہوئے بولا ''سلیم کو باہر بھیج۔''

''ابھی تو اس نے روٹی بھی نہیں کھائی۔'' انوری بولی۔

''تو فکر نہ کر۔'' رحمت نے سلیم کا ہاتھ پکڑا اور اس کو لے کر چلتا بنا۔جاتے جاتے بولا ''رات دادا کے اڈے سے لے لینا اپنے بیٹے کو۔''

انوری کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔اس وقت وہ اپنے آپ کو کتنا بے بس محسوس کر رہی تھی۔اس نے کیا کیا سوچا تھا۔۔۔سلیم کو پڑھائے گی اور جب وہ نوکری کے قابل ہو جائیگا تو خود بھی بھیک مانگنا چھوڑ دے گی۔اور ماں بیٹے کسی ایسی جگہ جہاں نہ رحمت ہو اور نہ رشید البیلا، دونوں عزت سے رہیں گے۔

رات جب وہ اڈے پر پہنچی، سلیم وہاں موجود تھا۔انوری کو دیکھتے ہی وہ اس سے لپٹ گیا۔

''پہلے ہی دن تیرے بیٹے نے تین سو کمائے ہیں۔'' یہ کہہ کر رحمت نے بیڑی کا کش لیا۔

''اگر اس کے ہاتھ پیر توڑ دیئے جائیں تب تو یہ اور زیادہ کمائے گا۔'' رشید البیلا سلیم کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''نہیں نہیں! خدا کے لئے میرے بیٹے کے ساتھ ایسا کچھ نہ کرنا۔''

وہ روتی ہوئی ہاتھ جوڑ کر رشید البیلا کی کرسی کے سامنے بیٹھ گئی۔

''اچھا چھا۔۔۔جا۔۔۔اپنے بیٹے کو لے کر جا۔'' رشید البیلا بولا۔

انوری نے اپنے آنسو پونچھے اور سلیم کو ساتھ لے کر چلی گئی۔اس نے ان آنسوؤں کو بھی نہیں دیکھا جو ماں کی بے بسی پر بیٹے کے چہرے کو بھگو رہے تھے۔

گداگری کے خلاف حکومتی قوانین موجود تھے۔میڈیا اور اخباروں کے لئے بھی ''گداگری'' گرم موضوع تھا۔ان حالات میں گداگری کا اڈہ چلانا آسان نہیں تھا۔لیکن اس میں پیسہ بہت تھا۔اور پیسہ حاصل کرنے کے لئے رشید البیلا کو کئی چھوٹے بڑے منہ بند کرنے ہوتے۔

انوری کھلی اور بند آنکھوں سے اپنے بیٹے کو معذور ہوتا ہوا دیکھنے لگی تھی۔وہ دیکھتی سلیم لنگڑا، لولا، اپاہج بنا کسی گداگری کی گاڑی میں لیٹا یا کسی اڈے پر پڑا آتے جاتے لوگوں کے دلوں کے نرم گوشوں کو متاثر کر کے رشید البیلا کے لئے ''سونے کی چڑیا'' کا کام انجام دے رہا ہے۔اور اس سب کے پیچھے اسے رحمت کی شرارتی شخصیت ہی نظر آتی۔رحمت جو رشید البیلا کے سخت احکامات کے باوجود انوری کے پیچھے پڑا ہوا تھا۔انوری کے لاکھ دھتکارنے کے باوجود وہ کسی بھوکے کتے کی طرح اس پر جھپٹے مارتا رہتا۔۔۔انوری اسے دھتکارتی جاتی۔۔۔لیکن اب حالات نے انوری کو بے بس کر دیا تھا۔اور بالآخر اس نے وہ کچھ کیا جو وہ ہرگز نہیں کرنا چاہتی تھی۔۔۔اسی گناہ سے وہ زندگی گی بھر بچتی رہی تھی۔اس سے بچنے کے لئے اس نے بڑے پاپڑ بیلے تھے بہت کچھ سہا تھا اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ اتنے جتن سے محفوظ رکھا ہوا بدن اس طرح پامال ہوگا۔وہ بھی رحمت جیسے بھوکے بھیڑیئے کے ہاتھوں۔۔۔رحمت نے قسم کھا کر اس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ سلیم کو معذور نہیں بننے دے گا۔۔۔انوری ٹوٹ گئی۔۔۔لیکن یہ ٹوٹنا اس کے بدن پر بھی ٹوٹا۔۔۔وہ دن بدن گھلتی جا رہی تھی۔

سلیم معذور ہونے سے محفوظ رہا۔لیکن رشید البیلا نے رحمت کی ایک ٹانگ کٹوا کر اسے شہر کی جامع مسجد کے باہر پلانٹ کر دیا تھا۔رحمت نے اپنے غشی ہونے، اپنے کرتا دھرتا ہونے کے زعم میں رشید البیلا کے سخت ترین قانون کو نظر انداز کرنے کی غلطی کی تھی۔۔یہ غلطی کب تک چھپی رہتی چنانچہ وہ اپنی سزا کو پہنچ گیا۔رشید البیلا نے انوری کو بلا کر اس کے جرم کا اعتراف کروایا اور اس سے پوچھا کہ وہ خود بتائے کہ اس کو کیا سزا دی جائے۔انوری رشید البیلا کے قدموں پر گر کر رونے لگی اور کہنے لگی۔

''رب سائیں نے تو مجھے پہلے ہی اس گھناؤنے گناہ کی سزا دے دی ہے۔ڈاکٹروں نے جواب دے دیا ہے۔زندگی ختم ہونے کو ہے۔۔۔تھوڑے ہی دنوں کی باتی ہے۔''

رشید البیلا نے اسے ہلکی سی ایک ٹھوکر ماری اور بولا۔

''گناہگار تو میں بھی ہوں اور تو بھی ہے۔کیونکہ بھیک مانگنے کو پیشہ بنانا بھی اللہ سائیں کے نزدیک گناہِ کبیرہ ہے۔رب سائیں تجھے بھی معاف کرے اور مجھے بھی معاف کرے۔اس کی رحمت بہت بڑی ہے۔لیکن تو نے جو گناہ کیا ہے وہ نا قابلِ معافی گناہ ہے۔تجھے اللہ سائیں نے سزا بھی دے دی ہے۔اب تو جانے اور ربِّ کریم جانے۔میں تجھے اس کے سپرد کرتا ہوں۔اب دفع ہو جا۔میری نماز کا وقت ہو رہا ہے۔

انوری کا بہت علاج ہوا، بہت دوا دارو کی گئی مگر مرض کا پتہ نہ چل سکا۔۔۔اور پھر ایک دن سلیم اپنی محبت کرنے والی ماں سے محروم ہو گیا۔

اب سلیم بڑا ہو چکا تھا اور پکا بھکاری بن چکا تھا۔وہ دن بھر بھیک مانگتا، مارا مارا پھرتا۔واپسی میں کسی سستے سے ہوٹل میں کھانا کھاتا۔گھر آ کر اپنی ماں کو یاد کرتا ہوا سو جاتا۔

''کیا یہاں کوئی مزار ہے جہاں عرس ہو رہا ہے۔؟''

آواز پر اس نے چونک کر دیکھا۔

دبلی پتلی نازک سی لڑکی۔۔۔گورا رنگ، کاجل بھری بڑی بڑی روشن آنکھیں، گھاگرا اور چولی پہنے ہوئے، بڑا سا ڈوپٹہ لپیٹے۔۔۔کچھ پریشان پریشان سی اس کے برابر کھڑی تھی۔

دن ڈھلنے کو تھا، سورج اپنا سفر ختم کر رہا تھا، رات آئی آئی تھی۔ایسے سے کسی جوان لڑکی کا ویران جگہ آ پہنچنا سلیم کے لئے نا قابلِ یقین تھا۔اس نے اپنی آنکھیں ملیں اور لڑکی پر ایک اور نظر ڈالی۔یہ دوسری نظر تو قیامت ڈھا گئی۔سلیم کو ایسا محسوس ہوا جیسے اس کائنات کے آغاز سے ہی وہ لڑکی اس جگہ کھڑی ہے اور شاید سلیم کا انتظار کر رہی ہے۔

''ہاں! بابا زندہ ولی کا مزار ہے یہاں سے تھوڑی دور۔لیکن اتنی شام کو تجھے مزار پر جانے کیا ضرورت پڑ گئی جو رستے سے بھٹک کر ادھر اُدھر پھر رہی ہے۔''سلیم نے لڑکی سے استفسار کیا۔

لڑکی نے کوئی جواب نہیں دیا اور اپنے دائیں پاؤں کے انگوٹھے سے زمین کریدنے لگی۔

''کیا تو راستہ بھول گئی ہے۔''سلیم نے اس سے دوبارہ پوچھا

''ہاں۔ہم پنجاب سے آئے ہیں مزار کے پاس ہمارا ڈیرہ ہے۔''لڑکی نے جواب دیا۔

''چل میں تجھے چھوڑ دیتا ہوں۔اتنی رات تو اکیلے کیسے جائیگی۔''سلیم نے کہا۔

''لڑکی پیچھے ہٹی اور سر سے پیر تک اسے مشکوک نظروں سے دیکھنے لگی''

''ڈر مت! میں تجھے بحفاظت ڈیرے تک پہنچا دوں گا۔میرے پیچھے پیچھے چلی آ''سلیم نے ایک مرتبہ پھر سر سے پیر تک اس لڑکی پر نظر ڈالتے ہوئے کہا اور خود تیز تیز چلنے لگا۔

تھوڑی دور چل کر سلیم نے پیچھے مڑ کر دیکھا لڑکی کافی پیچھے تھی۔وہ رک گیا۔لڑکی اس کے قریب آ گئی۔شاید لڑکی نے سلیم کے قریب آنے کی ہمت

جتائی تھی یا پھر شاید اس کا اعتماد سلیم پر بڑھ گیا تھا۔

''تیرا نام کیا ہے۔؟''سلیم نے لڑکی سے پوچھا۔

''شبنم۔۔اور تیرا۔''لڑکی نے سلیم کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جواب دیا۔

سلیم نے دیکھا لڑکی کی آنکھیں بے انتہا خوبصورت اور بڑی بڑی تھیں۔اس کے کانوں میں لڑکی کی آواز آئی۔

''سلیم۔''وہ بولا اور پھر چلنے لگا۔

اس کے بعد تمام راستے دونوں بات کرتے رہے۔لڑکی زیادہ بول رہی تھی۔ایسا لگ رہا تھا جیسے لڑکی کا ڈر بالکل ختم ہو گیا تھا۔

''کہتے ہیں کہ عرس میں بہت لوگ آتے ہیں، بہت خیرات ملتی ہے۔لڑکی معصومیت سے پوچھنے لگی۔

''ہاں یہ بات تو صحیح ہے۔''سلیم نے جواب دیا۔کچھ دور دونوں اسی طرح ساتھ ساتھ چلتے رہے۔جیسے ہی ایک چھوٹی سی چٹان سے مڑ کر اونچی سی منڈیر پر چڑھے تو شام کے دھندلکوں میں ایک جانب دھوئیں کے مرغولے آسمان کی طرف جاتے نظر آئے۔ایسے مقامات پر دھواں ہی آبادی کی نشاندہی کرتا ہے۔لڑکی نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں پھاڑ کر خوشی سے کہا

''وہ رہا ہمارا ڈیرہ۔'' کچھ ہی دیر بعد دونوں ڈیرے کے قریب پہنچ گئے۔سلیم ایک جگہ کھڑا رہ گیا،شبنم تیز تیز ڈیرے کی طرف بڑھ گئی۔

واپسی پر سارے راستے سلیم شبنم کے متعلق سوچتا رہا۔

دوسرے دن سلیم کی زندگی کے معمولات میں وہ جہاں بھی رہا اور جو کچھ بھی کرتا رہا کل والی لڑکی کی پرچھائیں اس کے آس پاس موجود رہی۔اور خاص طور پر اس لڑکی کی بڑی بڑی روشن آنکھیں۔شام کے وقت جب وہ اپنی جھگی کی طرف لوٹ رہا تھا تو اسے شبنم نظر آئی شبنم کا نظر آنا اس کے لئے خلافِ توقع تھا اس کو ایسا لگا جیسے کوئی قیمتی چیز جو گم ہو گئی تھی مل گئی۔شبنم سلیم کو دیکھ کر خود اس کے پاس آئی اور ہنستے ہوئے بولی''آج میں راستہ نہیں بھولی ہوں۔۔۔تجھ سے ملنے آئی ہوں۔''

وہ دونوں اسی اکناف میں بھٹکتے پھرے،شبنم مسلسل بولتی رہی اور سلیم سنتا رہا۔ایسا لگتا تھا کہ شبنم اپنی پوری زندگی کی روداد سلیم کو سنا دینا چاہتی ہے۔شام تیزی سے رات کی طرف جانے لگی۔شبنم کو اس کا احساس بھی نہیں ہوا۔سلیم نے شبنم کو یہ احساس دلایا اور بولا۔

''اب تُو اپنے ڈیرے جا۔رات آپڑی ہے۔''

شبنم کو جیسے احساس ہو گیا وہ جانے کے لئے کھڑی ہو گئی۔جاتے جاتے اس نے سلیم کو مڑ کر دیکھا۔سلیم بت بنا اپنی جگہ کھڑا اس کو جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

''کل شام اسی وقت،اسی جگہ۔''شبنم کی آواز سلیم کے کانوں تک پہنچی۔

اب تو ان کا روز کا معمول ہو گیا تھا کہ دونوں مزار پر ملتے اور ایسی جگہ بیٹھتے جہاں لوگوں کی نظروں میں آنے کا کم سے کم امکان ہوتا۔دیر تک آپس میں باتیں کرتے۔۔۔کیا باتیں کرتے یہ ان سے پوچھا جاتا تو ان کے پاس کوئی جواب نہیں ہو سکتا تھا۔کبھی وہ کھانے کیلئے کچھ لیتا آتا اور دونوں ساتھ بیٹھ کر کھاتے۔واپسی میں سلیم اپنی جھونپڑی میں آکر لیٹ جاتا اور اس کا خیال کرتا ہوا سو جاتا۔سلیم ماں کے جانے کے بعد بالکل تنہا ہو گیا تھا۔شبنم کے آنے سے اس کی زندگی میں رونق آ گئی تھی۔

ایک دن شبنم اس سے ملنے آئی تو اس کے چہرے کا رنگ بدلا ہوا تھا۔سلیم نے دیکھتے ہی اس تبدیلی کو محسوس کر لیا اور پوچھا۔

''کیا بات ہے شبنم! آج ڈیرے میں ایسی بات ہو گئی جس کا خیال تو دل سے نکال نہیں پا رہی ہے۔

''چار دن بعد ہمارا یہاں سے کُوچ ہے۔''شبنم اداس لہجے میں بولی۔

''بابا نے یہ بھی تو بتایا ہو گا کہ ڈیرے کو یہاں سے بڑھا کر کہاں لے جائیں گے۔''سلیم نے پوچھا

''پنجاب ہی واپسی ہو سکتی ہے زیادہ امکان ملتان کا ہے۔''میں نے ٹھیک سے سنا نہیں۔

''سلیم میں تیرے بغیر نہیں رہ سکتی۔''شبنم روتے ہوئے بولی

''میں بھی تیرے بنا نہیں رہ سکتا۔تجھے پتہ ہے تیرے جانے کے بعد سے ہی میں تیرا انتظار شروع کر دیتا ہوں۔میں تجھے نہیں جانے دوں گا۔سلیم نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے بڑے اعتماد سے کہا۔

''وہ کیسے!''۔اس نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔

''وہ ایسے کہ میں کل ڈیرے پر آؤں گا اور تیرے بابا سے تجھے مانگ لوں گا۔''

''سچ''وہ خوشی سے اچھل پڑی۔پھر بولی''سچ کہہ رہا ہے تو ڈیرے پر آئے گا۔''

دوسرے دن سلیم رشید البیلا کے اڈے سے سیدھا شبنم کے ڈیرے پر پہنچا اس کے باپ سے اس کا ہاتھ مانگنے۔

شبنم مزار کے پاس کھڑی اس کی واپسی کا انتظار کر رہی تھی۔اس کو دیکھ کر اس کی طرف آئی اور بولی''کیا کہا بابا نے''

''ایک ہزار مانگے ہیں اور ایک مہینے کا وقت دیا ہے۔''سلیم بولا

''تو کیا بابا میرا سودا کر رہا ہے۔؟''شبنم غصے سے بولی

''نہیں!شاید وہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ میں تجھے خوش رکھ سکتا ہوں یا نہیں''۔

''مگر ڈیرہ تو چار دن کے بعد جا رہا ہے تجھے ایک مہینے کا وقت کیسے دیا ہے۔''

''تیرے بابا نے مجھے پتہ دیا ہے۔''اس نے کاغذ دکھاتے ہوئے کہا۔

''میں ایک ایک پل تیرا انتظار کروں گی۔'' اس کی خوبصورت آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

شبنم پہلی بار اپنے بابا کے سامنے جاتے ہوئے شرما رہی تھی۔ بابا ہی اس کا سب کچھ تھا۔ ماں کے مرنے کے بعد اس نے شادی نہیں کی تھی۔ بابا کو اکیلا دیکھ کر اس نے کچھ کہنا چاہا تو بابا اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر بولا ''تجھے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے وہ سلیم چھورے نے سب کچھ بتا دیا ہے۔ دیکھ بیٹا میری بات سن لڑکا مجھے اچھا معلوم ہوتا ہے لیکن وہ ہماری برادری کا نہیں ہے۔ ہم پہلے بنجارے ہیں بعد میں گداگر۔ سلیم اور اس کے لوگ شہر کے رہنے والے ہیں اور ایک ہی ٹھکانے والے ہیں ان کا ہمارا کیا جوڑ۔''

اتنا سنتے ہی شبنم نے رونا شروع کر دیا اور تھوڑے ہی دیر میں سسکیاں لینے لگی۔ بابا نے ٹھوڑی پکڑ کر اس کے چہرے کو اوپر اٹھایا اور بولا ''میں نے یہ کب کہا کہ میں تم دونوں کو ایک نہیں ہونے دوں گا۔ جا! اسے بتا دے جیسا میں نے کہا ہے ویسے ہی کرے۔ مگر یاد رکھ اپنی لاج کی حفاظت کرنا۔''

''دوسرے دن وہ سلیم سے ملنے گئی اور اس نے بابا کے ساتھ جو بھی بات ہوئی تھی وہ سب بتا دی۔ وہ بہت خوش تھی۔

''ایک مہینے میں ایک ہزار میں کیسے جمع کر پاؤں گا۔۔۔ اگر رشید البیلا کو کم دوں گا تو وہ مجھ پر شک کرنے لگے گا'' وہ فکر مند تھا اور سوچ رہا تھا کہ کیا کرے۔۔۔

سلیم دن میں بھیک مانگ کر پیسے رشید البیلا کو دیتا۔ جو پیسے رشید البیلا اسے دیتا اس میں سے زیادہ سے زیادہ بچانے کی کوشش کرتا اور رات کو بہت کم سوتا، رونق والے اڈوں پر اپنے آپ کو چھپا کر بھیک مانگتا۔۔۔ اسے یہ بھی ڈر تھا کہیں رشید البیلا کو اس کی خبر نہ ہو جائے۔

ایک مہینے میں ابھی چار دن باقی تھے۔ اس نے چٹائی کے نیچے زمین میں گاڑے ہوئے ڈبے کو کھود کر نکالا۔ اور پیسے گننے لگا۔

''ایک ہزار چھ۔'' وہ خوشی سے اچھل پڑا۔ پیسے ڈبے میں ڈال کر اس کو اچھی طرح بند کیا اور گڈھے میں دبا کر اوپر سے چٹائی بچھا دی۔ اس دن وہ رشید البیلا کو اپنی دن بھر کی کمائی دینے کے بعد بولا۔

''دادا! دو دن کی چھٹی چاہئے۔''

''دو دن کی کمائی کا کیا ہوگا۔'' رشید البیلا بولا

''میں پوری کر دوں گا۔'' سلیم بولا۔

رشید البیلا جانتا تھا سلیم کے لئے یہ مشکل کام نہیں ہے۔ اس نے چھٹی دے دی۔

دوسرے دن اس نے ٹرین پکڑی اور شبنم کے باپ کے دیئے ہوئے پتے پر روانہ ہو گیا۔ راستے بھر وہ شبنم کے ساتھ زندگی گزارنے کے خوبصورت سپنے دیکھتا رہا۔ اسٹیشن پر اتر کر وہ بتائے ہوئے پتے پر خانہ بدوشوں کے ڈیرے کی طرف چلا۔ وہاں تو میدان خالی تھا البتہ ڈیروں کے اکھاڑنے کے نشانات جگہ جگہ موجود تھے۔

''ابھی تو شبنم کے باپ کی دی ہوئی تاریخ کے مطابق دو دن باقی ہیں۔ شاید میں غلط جگہ آ گیا ہوں۔'' اس نے سوچا۔ سامنے اسے ایک دھابہ نظر آیا اور اس کے ساتھ پان کی دکان۔ وہاں جا کر معلوم کیا ''پتہ تو صحیح ہے۔ کل ہی ان لوگوں نے یہاں سے ڈیرے اٹھائے ہیں۔'' پان کی دکان کے مالک نے کہا۔

''کہاں گئے ہیں کچھ معلوم ہے۔'' سلیم نے پوچھا۔

''یہ تو آزاد پنچھی ہیں آج یہاں تو کل وہاں۔ دکان کا مالک ہنستے ہوئے بولا۔ کل ان کے ڈیرے پر ایک لڑکی کی شادی بھی ہوئی تھی صبح شادی ہوئی دوپہر تک سب چلے گئے۔

وہ اجڑے ہوئے میدان کی طرف چلا، اس کی دنیا اجڑ چکی تھی، اس کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ اس نے تھیلی میں رکھے ہوئے سارے پیسے ہوا میں اڑا دیئے۔ اور خود زمین پر بیٹھ کر زور زور سے رونے لگا۔

اچانک اپنے کاندھے پر کسی کا ہاتھ محسوس کر کے وہ پلٹا، دیکھا تو شبنم کھڑی تھی۔ وہ روتے ہوئے بولی ''ہمیں جلد از جلد ایسی جگہ چلنا چاہئے جہاں وہ ہمیں ڈھونڈ نہ سکیں۔۔۔ پھر بولی تجھ سے تو ایک ہزار کا معاملہ طے کیا تھا۔ باہر سے آ کر ایک آدمی نے بابا کو پانچ ہزار دیئے تو بابا نے فوراً میری شادی اس سے کر دی اور خود ڈیرے سمیت کہیں اور چلا گیا۔۔۔ مجھے بھی نہیں بتایا۔۔۔ میں اس آدمی کے پاس سے بھاگ کر آئی ہوں۔ مجھے یقین تھا تو ضرور آئے گا۔'' شبنم ایک ہی سانس میں جلدی جلدی بول گئی۔

''وہ آدمی جس سے تیرے بابا نے پیسے لئے وہ اور اس کے آدمی تجھے تلاش کر رہے ہوں گے۔'' سلیم نے کہا۔

''ہاں! اگر بابا کو پتہ چل گیا تو اس کے آدمی بھی مجھے ڈھونڈ رہے ہوں گے۔'' شبنم بولی۔

''اور اگر میں دو دن میں واپس نہیں پہنچا تو تو رشید البیلا کے لوگ میری تلاش شروع کر دینگے۔ اور شاید پولیس بھی۔۔۔ سلیم کو خود اپنی آواز دور سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔

اس نے جلدی جلدی بکھرے ہوئے پیسوں کو سمیٹا اور شبنم کو ساتھ لے کر ایک سمت چل پڑا۔ شبنم نے اپنے آپ کو ایک بڑی سی رلّی میں لپیٹا ہوا تھا۔ اور ہاتھ میں ایک لاٹھی سی تھی اور اس طرح چل رہی تھی جیسے بوڑھی ہو۔ سلیم بس کے اڈّے اور اسٹیشن کا رخ بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہاں ان دونوں کا پکڑا جانا یقینی تھا۔

رات بھر وہ دونوں چلتے رہے۔ صبح کی روشنی کی پہلی کرن کے ساتھ وہ ایک چٹان کے سہارے گھنی جھاڑیوں کے درمیان چھپ کر بیٹھ گئے۔ دن میں وہ چھپتے چھپاتے رہتے۔۔۔ اور رات بھر چلتے رہتے۔۔۔ شاید آج بھی چل رہے ہونگے۔

''خلیج سے واپسی''

تشنہ بریلوی
(کراچی)

تقریباً تیس سال پرانی یہ ہمارے ماموں جمیل کی کہانی ہے جنہیں جمّی یا جم بھی کہا جاتا تھا۔ ہماری امّی کے اکلوتے بھائی اور چھوٹے۔

ماموں جمیل ایک عجیب شخصیت رکھتے تھے۔ شکل وصورت میں دلکش اور دل آویز، تندرست اور اسمارٹ۔ بات چیت میں بھی اچھے، خوش مزاج اور ہنس مکھ۔ لیکن بیحد موڈی اور جلد باز۔ کوئی کام وہ جم کے نہیں کر سکتے تھے۔ ہمارے نانا، نانی نے اُن کی بڑے ناز ونعم سے پرورش کی تھی۔ اِس طرح وہ بچپن سے ہی لاڈلے بن گئے تھے اور اسی لیے صحیح تعلیم بھی حاصل نہ کر پائے۔ بس مزے کرتے رہے۔ نانی نانا کے انتقال کے بعد بڑی بہن نے بھی ان کا اُسی طرح خیال رکھا اور انہیں اپنے گھر کا فرد گردانا۔ انہوں نے ایک ''پیڈ'' کہیں کرایہ پر لے رکھا تھا لیکن وہ زیادہ وقت ہمارے یہاں ہی گذارتے تھے۔

ہماری امّی بھی اُن کی اکلوتی بہن تھیں اس لیے ماموں جمیل انہیں بہت اہمیت دیتے تھے۔ ظاہر ہے کہ امّی تو اپنے چھوٹے بھائی پر فدا تھیں۔ ماموں جمیل ہمیں یعنی اپنے بھانجوں بھانجیوں کو بھی بہت چاہتے تھے۔ ہم سب بھی ان سے بہت فری تھے۔ وہ ہمیں لطیفے اور کہانیاں سناتے۔ ہمارے ساتھ کھیلتے اور ٹافیوں اور کھلونوں سے ہمیں خوش رکھتے۔ مختصراً ماموں جمیل ایک بہت پیار کرنے والے ماموں کی بہترین مثال تھے۔

لیکن ہمارے والد (جنھیں ہم ڈیڈی یا ڈیڈ کہتے) ایک بالکل مختلف انداز رکھتے تھے۔ وہ سو فیصد عملی آدمی تھے اور اپنے سالے بہادر کے طور طریقوں سے ہرگز مطمئن نہیں تھے۔ ''یہ بندہ میری سمجھ میں نہیں آتا۔'' وہ اکثر کہا کرتے۔ اور واقعی ماموں جمیل کیونکر ان کی سمجھ میں آتے۔ ڈیڈ نے سخت محنت سے اپنا راستہ بنایا تھا۔ کامیابی یا ''آمدنی'' ان کا پیمانہ تھا جس سے وہ ہر ایک کو ناپتے تھے۔ ''تمہاری ساکھ یا مارکیٹ ویلو کیا ہے؟'' یہ سوال ان کی زبان پر تو نہیں لیکن ان کے دماغ میں ہر ایک کے بارے میں موجود رہتا تھا۔ ماموں جمیل اس معاملے میں بالکل کورے تھے۔ ان کی نہ تو کوئی ساکھ تھی اور نہ کوئی معقول ذریعہ آمدنی۔ کبھی یہ سروس کبھی وہ جاب کبھی یہاں کبھی وہاں۔ ڈیڈ جو ہر آدمی کو اس کی نیٹ ورتھ Net Worth کی بنیاد پر پرکھتے تھے ماموں جمیل سے خوش نہیں تھے۔ اگرچہ ڈیڈ نے کبھی اپنی ناراضگی کا اظہار نہیں کیا مگر ماموں جمیل ان کے خیالات سے واقف تھے۔ وہ اپنے بہنوئی کو راضی رکھنا چاہتے تھے اس لیے ان کی بہن اپنے شوہر سے بہت خوش تھیں، مگر کیسے کرتے؟ دونوں کے درمیان بہت فاصلے تھے۔ اکثر ایسا ہوا کہ ماموں جمیل اپنے بھانجوں بھانجیوں کے جھرمٹ میں بیٹھے ہمارے ساتھ کھیل رہے ہیں یا مزے مزے کی باتیں کر رہے ہیں کہ اچانک ڈیڈی بھی نمودار ہو جاتے ہیں۔ فضا ایک دم یخ بستہ ہو جاتی ہے۔ ہنسی مذاق، ہلّا گلّا ختم۔ سب مجرموں کی طرح خاموش۔ ماموں جمیل سر جھکائے دو انگلیاں اٹھا کر ہلکے سے پھنکارتے ''سلاں'' جواب میں ڈیڈ انہیں گھورتے ہوئے کہتے ''ساں'' یہ سالے بہنوئی کا مختصر ترین ''سلام علیکم'' ہوتا تھا اور فوراً ہی ماموں جمیل غائب ہو جاتے تھے۔ ہم بچے ایسے موقعوں پر بہت بدمزہ ہوا کرتے۔

بالآخر ہماری امی نے ''کچھ'' کرنے کا فیصلہ کر ہی لیا۔ وہ اپنے پیارے بھائی کی طرف سے خاصی فکرمند تھیں۔ ہر بہن کی طرح وہ بھی چاہتی تھیں کہ اُن کا بھائی وقت ضائع نہ کرے اور کامیاب اور خوشحال زندگی گزارے۔ امّی جان بہت خوش مزاج اور ہنس مکھ تھیں، سختی ان کی طبیعت میں بالکل نہیں تھی۔ انہوں نے ہمیں بھی کبھی ڈانٹا نہیں تھا، مارنا تو درکنار۔ لیکن اب انہوں نے محسوس کیا کہ 'رویّہ' تبدیل کرنا پڑے گا۔ لہٰذا ایک دن امّی نے ماموں جمیل کو گھیر لیا اور آڑے ہاتھوں لیا۔ ماموں جمیل گھبرا گئے۔ انہیں اپنی ''سویٹ سسٹر'' سے اس قسم کے رویّے کی قطعاً توقع نہیں تھی۔ مسکرا کر انہوں نے بات کو ہنسی مذاق میں ٹالنے کی کوشش کی اور کہا ''آپ خوامخواہ پریشان ہو رہی ہیں سب کچھ تو ٹھیک ہے شاید آپ بھائی جان (یعنی ان کے بہنوئی) کے ''نظریات'' سے کچھ زیادہ ہی متاثر ہو رہی ہیں۔''

لیکن ماموں جمیل کو جلد ہی معلوم ہو گیا کہ ان پر دل نچھاور کرنے والی پیاری بہن ایک نرم مزاج خاتون ہونے کے ساتھ ساتھ ایک سخت ''سارجنٹ'' بننے کی صلاحیت بھی رکھتی تھی۔ امّی کے کردار کا یہ بارعب پہلو جب ان کے سامنے آیا تو ماموں جمیل بوکھلا گئے۔ اپنے گھنگھریالے بالوں والے بھائی پر سو جان سے فدا ہونے والی بڑی بہن اب کوئی رعایت دینے کو تیار نہیں تھی۔

''تم نے بہت وقت ضائع کیا ہے جمّی'' امی جان نے کڑک دار لہجے میں کہا ''اب میں تمہیں کامیاب دیکھنا چاہتی ہوں۔ تمام فضولیات چھوڑ دو۔''

ماموں جمیل نے سر جھکا کر اپنی بڑی بہن سے وعدہ کیا کہ وہ خود کو مکمّل طور پر تبدیل کر لیں گے۔ اور سسّی کو خوش کر دیں گے۔

ماموں جمیل میں واقعی تبدیلی آ گئی۔ وہ سنجیدہ ہو گئے اور چند ہی دن میں ہمیں خوشخبری سنائی کہ انہیں ایک بہت اچھا مستقل جاب مل گیا ہے۔ وہ روزانہ اپنے نئے دفتر میں جانے لگے۔ ہم سب بہت خوش ہوئے اور امّی جان کی خوشی کی تو کوئی حد نہیں تھی۔

چند ماہ تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ ''اب جمّی بالکل بدل گیا ہے۔'' امّی جان نے کئی بار مسکراتے ہوئے کہا ''اور اب وہ ایک ذمہ دار شخص بن گیا ہے۔''

لفظ''ذمہ دار''میں بہت کچھ شامل تھا۔

پھر ایک دن وہ مزید خوش خبری لے کر آئے۔انہوں نے بتایا کہ اُن کے باس اُن کے کام سے اتنے خوش ہوئے ہیں کہ انہوں نے ماموں جمیل کو ابوظہبی میں اپنی برانچ میں بھیجنے کا فیصلہ کرلیا ہے زیادہ بڑے عہدے پر۔''سسی !یہ میرے لیے ایک زبردست 'بریک' ہے۔''ماموں جمیل نے خوشی سے کھلکھلاتے ہوئے کہا۔''اب میں یقیناً گولڈن گلف میں بہت پیسہ کما سکوں گا۔''

''اور بہت پیسہ بچا بھی سکوں گا۔یہ بھی کہو''مسرور مگر ہوشمند بہن نے قیمتی مشورہ دیا۔

''کیوں نہیں'' ماموں جمیل نے فوراً کہا''اچھی تنخواہ' رہائش فری ٹرانسپورٹ فری' میں یقیناً اپنا''پیکٹ''بہت جلد تیار کرلوں گا۔کم از کم ایک لاکھ بلکہ شاید ڈیڑھ لاکھ روپے ماہانہ بچا بھی سکوں گا۔''

یہ سنتے ہی محبت کا فوّارہ بڑی بہن کے دل میں پھوٹا اپنے ملینز پیارے بھائی کے لیے''لیکن جمی ڈیر انہوں نے واری صدقے ہوتے ہوئے کہا ''تو اتنی دور چلا جائے گا میں ہر لحہ تیری یاد میں تڑپوں گی۔''

اور جمی نے سسی کو تسلی دیتے ہوئے فوراً ہی کہا''آپ فکر نہ کریں سِسس۔گلف کوئی زیادہ دور تو نہیں ہے میں ہر دوسرے مہینہ پاکستان آسکتا ہوں۔''

جذبات پر قابو پاتے ہوئے سمجھدار بہن نے تقریباً ڈپٹتے ہوئے کہا ''جمی تم ایسا ہرگز نہیں کروگے اور ایک ایک پائی بچاؤ گے۔دوسال سے پہلے اپنی جگہ سے ہلنے کی کوشش بھی نہ کرنا۔سمجھے!''

دو ہفتہ کے اندر ماموں جمیل گولڈن گلف کی طرف پرواز کر گئے۔ ہم بچے سب اداس تھے لیکن امی جان بہت خوش اور پر امید تھیں۔

''میری دعائیں آخر قبول ہوئیں۔''انہوں نے ڈیڈ سے کہا''کیا سنہری موقع جمی کو ملا ہے۔ذرا سوچو UAE میں اچھا جاب تو یورپ اور امریکہ سے بھی بہتر ہے۔واہ رے میرے بھائی کی قسمت۔''

ڈیڈ ابھی ہار ماننے کو تیار نہیں تھے مگر وہ بھی اندر اندر مرعوب تھے۔ انہوں نے صرف اتنا کہا''ٹھیک ہے امید رکھو مگر ابھی تو آغاز ہے۔''

پھر ماموں جمیل کے خط اور خوبصورت رنگین پوسٹ کارڈ آنا شروع ہوگئے۔معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے جاب سے بہت خوش ہیں اور خلیج میں مزے کررہے ہیں۔چند ماہ تک یہ سلسلہ جاری رہا۔پھر یہ مراسلے آنا کم ہوگئے اور ایک آدھ ایروگرام تک محدود ہوگئے۔یہ صورت بھی پانچ چھ ماہ جاری رہی اس کے بعد سناٹا۔نہ کوئی خط نہ ایروگرام نہ کوئی فون۔ڈیڈ بھی پریشان ہوگئے انہوں نے اپنے دوستوں کے ذریعے ماموں کا کھوج لگانے کی کوشش کی مگر ناکام رہے۔

''ایسا تو ہوتا رہتا ہے۔''امی جان نے دانشمندی کا سہارا لے کر ''وضاحت'' کرنا چاہی۔''وہاں غیر سرزمین میں جاب کے سلسلے میں لوگوں کو بہت دور ریگستانوں میں بھی'اسائن' کردیا جاتا ہے۔ان کا ساری دنیا سے رابطہ کٹ جاتا ہے اور وہ سب مشین بن جاتے ہیں کمانے کی مشین۔انتظار کرو کسی بھی وقت میرے بھائی کا خط آسکتا ہے۔''امی اپنی اس وضاحت کے ذریعہ ہم سب سے زیادہ خود اپنے آپ کو تسلی دے رہی تھیں۔

لیکن امّی کی امیدیں پوری نہیں ہوئیں۔مہینے سالوں میں بدل گئے۔کوئی خط نہیں کوئی فون نہیں۔رفتہ رفتہ ہم بچے ماموں جمیل کو تقریباً بھول گئے۔ایک بہت پرانی کہانی بن کر وہ الف لیلیٰ اور چہار درویش کی داستانوں کا حصہ بن گئے۔البتہ امّی کی آنکھیں اپنے چہیتے بھائی کی یاد میں اکثر ڈبڈبا جاتیں۔''جمی وہاں کیا کر رہا ہے۔''وہ آہ سرد بھر کر کہتیں''وہ خط کیوں نہیں لکھتا۔اسے کیا ہوگیا ہے۔وہ زندہ بھی ہے یا نہیں؟''

پھر ایک دن سورج مغرب سے نکل آیا۔ماموں جمیل کا ایک خط موصول ہوا۔امّی خوشی سے پھولی نہیں سمارہی تھیں اور ڈیڈ بھی مسکرا رہے تھے۔ ''اچھا تو انکل جمی زندہ ہیں۔''ہم سب نے اطمینان کا سانس لیا۔اتنے عرصے کے بعد آنے کے باوجود ان کا ایروگرام ایک ٹیلی گرام ہی تھا۔انہوں نے فلائٹ نمبر اور دن کے ساتھ صرف یہ لکھا تھا کہ''میں پاکستان واپس آرہا ہوں مستقلاً۔''

''میرا پیارا جمی واپس آرہا ہے۔چار سال بعد۔''امّی کھلکھلا رہی تھیں بچوں کی طرح۔''اس نے وہاں سخت محنت کی ہوگی۔رات دن ایک کردیا ہوگا۔اب بالآخر وہ کامیاب واپس آرہا ہے۔اپنے''پیکیٹ''کے ساتھ جسے وہ کسی شاندار منصوبے میں لگا کر عیش کی زندگی گزارے گا۔''

ڈیڈی نہیں چاہتے تھے کہ بچے بھی ایئر پورٹ جائیں لیکن امّی نے زور دے کر کہا''جمی کا بہترین استقبال ہونا چاہیے ہم سب کا ایئر پورٹ جانا ضروری ہے تاکہ وہ خوش ہوجائے اور محسوس کرے کہ یہاں سب نے اسے کس طرح مِس کیا ہے اور اب اس کی واپسی پر کس قدر خوش ہیں۔''ظاہر ہے کہ ہم بچے' جواب کچھ بڑے ہوگئے تھے ایئر پورٹ جانے کے لیے بے قرار تھے ہی۔

ہر بڑے شہر کا ایئر پورٹ ایک تماشا' ایک میلہ ہوتا ہے۔انٹرنیشنل اراویل لاؤنج میں بہت بھیڑ تھی۔جیٹ ایج کی بھیڑ میدانِ حشر کا سا نقشہ انسانوں کی ریل پیل تیز قدم لوگ' رنگ برنگ لباس۔ہر انداز کے چہرے۔ بیشتر لوگ اپنے عزیزوں' دوستوں اور پیاروں کو'رسیو' کرنے آئے تھے جو غیر ممالک سے پلٹ رہے تھے امیر اور خوش حال مغربی ممالک سے یا دولت منداور فیاض خلیجی ریاستوں سے۔ایک فیملی کے سب لوگ ملے جلے کھڑے تھے' ماں باپ' بھائی بہن' اس سنہری امید کے ساتھ کہ خاندان کی دولت میں جلد ہی مزید چمک دمک آجائے گی۔لمبی لمبی ٹانگوں والے ٹین ایج لڑکوں کے گال خوشی سے تمتمارہے تھے۔وہیل چیئر پر بیٹھی نانیاں' دادیاں بھی موجود تھیں جنہیں صحت مند اور فرماں بردار پوتیاں نواسیاں بڑی محبت اور مستعدی کے ساتھ سنبھالے ہوئے

تھیں۔ ہرایک کی آنکھ آنے والے مسافروں پر لگی تھی۔ برسوں بعد بیٹے' بھائی' چچاماموں کو پہچان لینے پر فاتحانہ نعرہ بلند ہوتا۔

ہم بچوں کو ماموں کی شکل بھی ٹھیک سے یاد نہیں رہی تھی اور چار سال میں تو بہت کچھ بدل جاتا ہے۔لہذا ہمارے لیے مشکل تھا کہ اس انبوہ میں ان کا چہرہ پہچان سکیں لیکن پھر بھی بڑی بے تابی سے ہم آنکھیں پھاڑ کر ہرایک کو تک رہے تھے اور ایک آدھ بار تو ہمیں کسی پر ماموں جمیل کا دھوکہ ہو بھی گیا۔امّی جان اپنی گردن پر ہاتھ رکھے پوری توجہ سے چہرہ شناسی کررہی تھیں۔ پھراچانک ان کی آنکھیں باریک ہوگئیں اور سانس رک گئی۔

ان کی نظر ایک مسافر پر جمی ہوئی تھی۔ یہ ایک بہت خوش پوش سوٹڈ بوٹڈ اور باوقار شخص نظر آرہا جس کی گردن میں دو ٹریول بیگ جھول رہے تھے اور وہ ایک ٹرالی میں تین بڑے قیمتی سوٹ کیس رکھے اور ایک ہولڈال لیے آگے بڑھ رہا تھا۔

''یہ تو جمّی ہے۔'' امّی خوشی سے چیخ پڑیں ''جمّی جمّی۔''

''جمیل ماموں۔انکل جمیل'' ہم سب ہاتھ ہلاتے ہوئے ''کورس'' میں چلاّئے۔

مسافر نے ہماری طرف دیکھا اور ''سِسّی'' کا نعرہ مارتا ہوا ہماری طرف لپکا۔

بوسوں اور معانقوں کا تبادلہ ہوا اور دیارِ غیر سے واپس آنے والے عزیز کا نہایت گرمجوشی سے استقبال کیا گیا۔

جمیل ماموں نے دو منٹ کی مہلت چاہی اور اپنے ساتھ ہی آنے والے ایک مسافر کے پاس گئے۔ یہ ایک صحت مند شخص تھا' جمیل ماموں کا ہم عمر۔اس کے جسم پر ایک معمولی سا سوٹ تھا۔ہاتھ میں ایک پرانا بریف کیس اور ایک عام سا ہینڈ بیگ۔ دونوں نے سر جھکائے ہوئے سرگوشی میں جلدی جلدی کچھ بات کی۔مسکرائے بغیر ہاتھ ملایا اور ماموں واپس ہماری طرف آگئے۔

ائیرپورٹ سے روانگی پر ہم نے ماموں جمیل پر سوالات کی بوچھار کردی کہ وہاں کیسا وقت گذرا کہاں کہاں رہے کیا کیا کرتے رہے۔ان کے جاب وغیرہ کے بارے میں آڑے ترچھے سوالات۔امّی جان مالکانہ اور قابضانہ انداز سے اپنے دُلارے بھائی کو فخر وانبساط کے ساتھ دیکھ رہی تھیں اور ایک آدھ سوال خود بھی پوچھ لیتیں لیکن ساتھ ہی ساتھ ہم سب کو ڈانٹ بھی رہی تھیں کہ ماموں کے پیچھے نہ پڑو۔ ''بیچارہ سخت محنت کے بعد تھکا ہوا واپس آیا ہے۔گلف کی نوکری کوئی مذاق نہیں ہوتی۔ جب وہ پیسے بہت دیتے ہیں تو کام بھی بہت لیتے ہیں۔'' صرف ڈیڈی جو وین چلا رہے تھے خاموش رہے اور ایک آدھ مسکراہٹ سے آگے نہیں بڑھے۔

گھر پہونچتے ہی ہم سب ڈرائنگ روم میں براجمان ہوگئے۔جمیل ماموں کا سامان یعنی بڑے بڑے بارعب سوٹ کیس' موٹا ہولڈال اور رنگ برنگے ٹریول بیگ فرش پر یہاں سے وہاں تک پھیلے ہوئے ''دعوتِ نظر'' دے رہے تھے اور گلف کی چمک دمک اور طلسماتی لگژری کی نمائندگی کررہے تھے ''کیا کچھ نہیں بھرا ہوگا ان میں'' ہم سب سوچ رہے تھے ''سونے اور چاندی کی اشیا' ریشمی ساریاں' قیمتی گھڑیاں' ٹائیاں' اسکارف' رومال' کھلونے' پرس' ٹافیاں' گاگلز' فونٹن پین' قمیصیں' جینز' سینڈل' چپّل' کاسمیٹکس' فرنچ پرفیوم' کیمرے' الیکٹرونک سامان' لیپ ٹاپ بھی اور کچھ بہت ہی بڑھیا نئی نئی چیزیں یعنی گلف میں الہٰ دین کے غار سے آنے والے ہیرے جواہرات۔''

گفتگو ہوتی رہی لیکن ہم بچّے بے تابی کے ساتھ اس انتظار میں تھے کہ ماموں جمیل باتیں چھوڑ کر ہماری طرف متوجہ ہوں۔ اپنی نظریں ہم سب پر جمادیں اور مسکراتے ہوئے کہیں ''اچھّا تو بچّو۔اب تم اپنا دوبارہ تعارف کراؤ۔ میں تم سب کے لیے کچھ نہ کچھ لایا ہوں۔'' لیکن ماموں جان تو بت بنے ہوئے تھے۔بے چینی سے ادھر اُدھر نظر ڈال رہے تھے' آنکھیں ملانے سے گریز کررہے تھے اور امّی اور ڈیڈی سے بھی بے دلی کے ساتھ بات کررہے تھے۔

بالآخر امّی نے اپنے بھائی کی اس کیفیت کو سفر کی تھکن گردانتے ہوئے کہا ''جمّی ڈیئر تم بہت تھکے ہوئے معلوم ہوتے ہو۔تھوڑا آرام کرلو۔سوٹ اتار کر کرتا پاجامہ پہن لو اور برابر والے کمرے میں بستر پر لیٹ جاؤ۔اور ہم تمہارا یہ سامان بیڈروم میں شفٹ کردیتے ہیں۔'' آدھے گھنٹے بعد ڈنر تیار ہوگا۔''

''اوہ نو نو سسی'' ماموں جمیل نے فوراً کہا ''میں بالکل ٹھیک ہوں۔ میں کچھ دیر یہاں بیٹھوں گا اور کوئی چیز یہاں سے نہیں ہٹے گی۔ اگر ایک کپ چائے مل جائے تو اچھا ہے'' اور واقعی ماموں جمیل اسی طرح ڈرائنگ روم میں بیٹھے رہے کسی اجنبی مہمان کی طرح۔ہم سب حیران پریشان تھے کہ یہ کیا ہورہا ہے۔پھر فوراً ہی ایک ''خیال'' ایک چونکا دینے والے ''خیال'' شاید ہم سب کے دماغ میں ایک ساتھ طلوع ہوا۔''ایسا لگتا ہے کہ ماموں جمیل ہمارے ساتھ رہنا نہیں چاہتے۔ چندروز کے لیے بھی نہیں۔ وہ شاید ''اپنے'' گھر میں جانا چاہتے ہیں اپنے ''شاندار وِلا'' میں جو انہوں نے یقیناً اس شہر میں خرید لیا ہے اور چونکہ اب وہ ایک ''خلیجی سیٹھ'' بن چکے ہیں اور کروڑوں میں کھیل رہے ہیں اس لیے وہ ہمیں یعنی اپنے ''غریب'' رشتے داروں کو کمتر سمجھتے ہوں گے۔''

ایک گھنٹہ اسی کشمکش میں گذر گیا۔ کچھ چائے پانی ہوا پھر ماموں جمیل واش روم گئے اور واپس آکر اسی طرح صوفے پر تنے ہوئے بیٹھے رہے۔ چپ چاپ' اِدھر اُدھر نظریں گھماتے ہوئے۔

دروازے کی گھنٹی بجی۔ایک دم زور سے ماموں اچھل پڑے جیسے انہیں کرنٹ لگ گیا ہو۔معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے سوٹ سے باہر نکل جائیں گے۔ انہوں نے دروازے کی طرف گھور کر دیکھا پھر اپنی رسٹ واچ پر نظر ڈالی۔

میں خود دروازہ کھولنے گیا اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہاں وہی شخص موجود تھا جسے ہم نے ائیرپورٹ پر ماموں جمیل سے بات کرتے دیکھا تھا۔ یعنی ان کا ہم سفر۔اُس کے ساتھ تین لڑکے بھی تھے جو نظریں نیچی کیے تھرکتے

جسموں کے ساتھ اپنی ہنسی ضبط کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ قبل اس کے کہ میں کچھ بولتا ماموں جمیل فوراً میرے پیچھے آ گئے۔

''بشیر اندر آ جاؤ۔'' انہوں نے کہا ''میں تمہارا انتظار کر رہا تھا۔''

بشیر صاحب اور ان کے تینوں آنکھیں جھپکاتے ہوئے نوعمر ساتھی ڈرائنگ روم میں آ گئے۔ ماموں جمیل نے ہم سے کہا کہ انہیں مہمانوں کے ساتھ اکیلا چھوڑ دیا جائے اور ''چائے وائے'' بالکل نہ بھیجی جائے۔

ہم سب حیران و ششدر باہر آ گئے۔ دو منٹ تک خاموشی رہی اس کے بعد کچھ آوازیں بلند ہوئیں جیسے کسی چیز کو کھینچا جا رہا ہے یا دھکا دیا جا رہا ہے' واش روم کا دروازہ ایک بار کھولا اور بند کیا گیا۔ جوتے زور زور سے فرش پر مارے گئے کچھ دبے ہوئے قہقہے بلند ہوئے' باہر کا دروازہ زور سے کھولا اور بند کیا گیا اور اس کے بعد خاموشی' مکمّل سکوت۔

امّی کی حیرت غصے کی سرحد میں داخل ہو رہی تھی۔ انہوں نے زور سے آواز دی ''بھئی کیا تمہارے ''مہمان'' جا چکے ہیں!'' 'مہمان' پر زور تھا۔

''جی ہاں'' ماموں کی آواز آئی مدھم سی جیسے کوئی کنویں کے اندر سے بول رہا ہو۔

آگے آگے امّی اور پیچھے پیچھے ہم سب جلوس کی شکل میں ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے اور سناٹے میں آ گئے۔ ایسا لگتا تھا کہ جیسے طلسم ہوشربا کا کوئی سین ہو۔

'مہمان'' سب جا چکے تھے اور ساتھ ہی وہ ''سامان'' بھی جا چکا تھا۔ چمکتے ہوئے تین سوٹ کیس۔ بھاری بھرکم ہولڈال اور رنگین ٹرول بیگس۔ مزید براں ایک پرانا بریف کیس اور معمولی سا ہینڈ بیگ صوفے پر پڑے تھے۔

جب ماموں جمیل پر نظر ڈالی تو ہم سب واقعی پتھر کے مجسّمے بن گئے۔ وہ آنکھیں نیچی کیے مجرم کی طرح صوفے پر بیٹھے تھے۔ ان کے جسم پر وہ شاندار سوٹ نہیں تھا بلکہ وہی معمولی سا کوٹ پتلون جو ہم ائیر پورٹ پر اس بریف کیس اور تھیلے کے ساتھ ان کے دوست کے جسم پر دیکھ چکے تھے۔ عجب کایا پلٹ تھی ایک الف لیلوی منظر۔

وحشت انگیز خاموشی کو توڑتے ہوئے امّی گرج کر بولیں ''یہ کیا ہو رہا ہے۔ یہ سب کیا تماشہ ہے؟''

''کوئی تماشہ نہیں ہے۔'' ماموں جمیل بدستور سر جھکائے آہستہ سے بولے ''بات دراصل یہ ہے سسّی کہ یہ شخص بشیر میرا اچھا دوست ہے۔ وہ اپنے سگے رشتے داروں سے خوش نہیں ہے۔ وہ اپنے بھائیوں سے ڈرتا ہے کیونکہ وہ سب بہت سخت مزاج ہیں۔ بشیر اپنے سسرالی رشتے داروں کو زیادہ پسند کرتا ہے لہذا اس نے یہ ڈرامہ رچایا جو بہت کامیاب رہا۔ اس کے بھائی ائیر پورٹ پر کسی ''ورسٹائل اوناسیس'' جیسے ارب پتی کا استقبال کرنے کے لیے بڑی ''امیدوں'' کے ساتھ جمع ہوئے تھے لیکن جب انہوں نے بشیر کو دیکھا تو ان کی مایوسی اور غصے کی انتہا نہیں رہی۔ وہ سب بڑبڑاتے ہوئے اسے اپنے ساتھ لیے بغیر واپس چلے گئے اور میرا دوست بشیر یہی چاہتا تھا کہ وہ اس کی زندگی سے نکل جائیں۔

''اچھا تو یہ بات ہے۔'' امّی بڑے گمبھیر لہجے میں بولیں۔ ''تو وہ سامان وہ سوٹ کیس ہولڈال اور رنگین بریف کیس اور بڑھیا سوٹ تمہارے اس دوست بشیر ہی کے تھے۔ اور تم میرے پیارے بیرن پہلے سے زیادہ پتلی حالت میں وطن واپس آئے ہو۔ ہے نا؟''

''اب میں کیا کہوں'' انکل جمیل نے قدرے بھرّائی ہوئی آواز میں کہا ''میرے چار ساڑھے چار سال تو ضائع ہو گئے ہیں۔ ایک مہربان دوست کے ذریعے میں گلف گیا تھا لیکن چند ماہ بعد میرے پہلے امپلائر کا بزنس اچانک بیٹھ گیا اور اس کے بعد میں حیران پریشان ادھر اُدھر جاب کرتا رہا۔ وہاں مقابلہ بہت سخت ہے۔ دنیا بھر کے لوگ وہاں آ کر دولت کمانے کے لیے بے تاب ہیں۔ مجھ سے زیادہ ماہر اور مستعد۔ لہذا میں نوکریوں سے نکالا بھی جاتا رہا۔ میں نے یہ وقت بڑی مشکل سے گزارا ہے۔ اگر میں گلف میں نہ ہی جاتا تو بہتر تھا۔ بہرحال اب میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا کروں۔ تھوڑا سا پیسہ ہے میرے پاس۔ سوچتا ہوں کہ کوئی جاب کرنے کے بجائے فوٹو اسٹیٹ مشین لے کر بازار میں کھڑا ہو جاؤں۔ کوئی چھوٹی سی دوکان کر لوں یا پھر ایک صورت اور بھی ہو سکتی ہے سسّی۔''

ماموں جمیل نے پہلی بار سر اٹھا کر اپنی بہن کی طرف دیکھا۔

''وہ کیا صورت ہو سکتی ہے۔'' امّی جان نے تیز نظریں اپنے چھوٹے بھائی پر جما کر بہت سپاٹ لہجے میں پوچھا۔

سر جھکا کر ماموں جمیل کچھ دیر خاموش رہے پھر دھیرے سے بولے ''آپ خود سمجھ جائیں' اب شاید میرے لیے یہی صورت بہتر ہے کہ نیا ورق پلٹا جائے اور کوشش کی جائے کہ کوئی ''مناسب'' کوئی ''مہربان'' خاتون شاید کوئی آپ کی جاننے والی مجھے.....''

۔ انسانی فلاح ۔

کان کنی کے شعبہ سے دو ارب پینسٹھ کروڑ ڈالر کمانے والے جنوبی افریقہ کے چوتھے بڑے مالدار ترین شخص پیٹرائٹ موٹ سیپی نے کہا کہ کامیابی کے لیے غریبوں کی مدد کرنا بہت ضروری ہے۔ اس موقع پر پیٹرائٹ موٹ سیپی نے اپنی دولت کا نصف فلاحی منصوبوں کو دینے کا اعلان کر کے ایک صحت مند روایت کا آغاز کیا ہے۔ اگر دنیا کے دیگر مالدار لوگ بھی پیٹرائٹ موٹ سیپی کی پیروی میں اپنی دولت کا معقول حصہ انسانی فلاح کے لیے وقف کر دیں تو دنیا سے غربت، جہالت، بیماری اور بیروزگاری بہت حد تک کم ہو سکتی ہے۔

''آہ میرا بھائی''

شاہد جمیل
(گوجرانوالہ)

بڑا بھائی بس یونہی تھا، گھر والوں نے اُس کا عجیب ہی امیج بنایا ہوا تھا- گھر والے بھی کیا کرتے کہ اُسے اُن کی ذرّہ بھر پرواہ نہیں تھی- نہ روٹی کی فکر ، نہ کپڑوں تّوں کی سوچ اور نہ گھر بُو ہے کا خیال- اُس نے اپنی زبان سے تو نہیں کہا تھا البتہ اپنے افعال سے پوری طرح ثابت کر دیا تھا کہ وہ اِن چھوٹے چھوٹے کاموں کیلئے نہیں بنا- اُس کا تو ایک ہی نعرۂ مستانہ تھا کہ دانش وبینش کیلئے کام کرو اور اگر شعور آ گیا تو دنیا کی تمام مادی، روحانی اور نفسیاتی آسائشیں اِس کے پیچھے دست بستہ خود چلی آئیں گی- مگر اُس کی بستی، اُس کے شہر کے لوگ اُس کی بات سننے سمجھنے کی بجائے خود اُسے ہی حیرت سے تکتے رہ جاتے- میں نے اپنے بھائی پر عمومیہ کے سرِعام طنزیہ نشتر چلتے تو دیکھے تھے مگر گھر یا باہر کے لوگوں میں سے کبھی کسی نے اُسے نہیں سراہا سوائے مشتاق کے- مشتاق نے ایک بار گرمجوشی سے مجھے گلے لگاتے ہوئے اور میرے کاندھے تھپتھپاتے ہوئے مجھ سے کہا تھا کہ تمہیں مبارک ہو تمہارا بھائی کھِسکا ہوا ہے- مگر مجھے اس کی بات پر کیا یقین آتا کہ وہ تو خود ہی کھِسکا ہوا تھا- بھائی کو لیکن کسی چیز کی کوئی پرواہ نہیں تھی- وہ شہر کی سڑکوں، بازاروں اور چوراہوں میں شانِ بے نیازی سے یوں گھومتا جیسے ایتھنز میں ایلکی بیادیز، انٹی ستھینز، اریسٹیپوس، کرائٹو اور افلاطون کے جلو میں ہو- وہ اپنی بے ترتیب بڑھی ہوئی داڑھی کے بالوں کو کھجلاتا، اٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے غور وفکر کرتا اور اپنے جیسے کھِسکے ہوئے لوگوں کو سوالات اٹھانے کی ضرورت واہمیت اور جرات پر اکساتا زندگی بسر کر رہا تھا، ایک بار کسی نے اس سے کہا کہ تم فقط غور وفکر اور دانش کا ڈھونک کرتے ہو تا کہ تمہیں اپنے بیوی بچوں کے نان ونفقے کیلئے محنت مزدوری کی مشقت نہ اٹھانی پڑے- بھائی نے ہنس کر جواب دیا! دیکھو ہماری دنیا میں ہمارے ہی اردگرد اور بھی جاندار مثلاً چرند، پرند اور حیوانات موجود ہیں لیکن انہوں نے کبھی اپنے بچوں کیلئے اسطرح سعی نہیں کی جس طرح ہم کرتے ہیں تو کیا وہ زندہ نہیں ہیں- وہ یعنی جانور صرف زندہ ہیں جبکہ ہم صرف زندہ نہیں ہیں بلکہ وہ ابھی اپنی بات مکمل بھی نہیں کر پایا تھا کہ چھوٹے سے مجمع میں سے ایک شخص نے اپنی قمیض کا پچھلا گھیرا اُوپر کیا اور سرین اُس کی طرف کر کے ایک دو تین فطری پٹاسیں چلاتا، لوگوں کو ہنساتا دوڑا تا انہیں اُس سے کہیں دور لے گیا-

بھائی صاحب کو لوگ اگر کھِسکا ہوا کہتے تھے تو ٹھیک ہی کہتے تھے کہ میں خود بھی انہیں کھِسکا ہوا محسوس کرتا تھا مگر لوگوں کے برعکس میں اُنہیں اپنی جان جگر کا ٹکڑا بھی تو جانتا تھا اور مجھ میں اور لوگوں میں یہی فرق تھا اور میری دانست میں یہ بہت بڑا فرق ہے- بھائی واقعی کھِسکے ہوئے تھے، وہ پتہ نہیں کیوں مگر ملکوں کو شہر، شہروں کو گاؤں اور گاؤں کو گھر کہتے تھے- بھائی کو پچھلے کچھ دنوں سے جمہوریہ کی پریشانی لاحق تھی اور بھائی کو یہ بیماری وہی چار سو سال قبل مسیح کی یاد پڑتی تھی- بھائی کو پتہ نہیں کیوں شک گذرتا تھا کہ اس بیماری کا نام جمہوریہ سے بگڑ کر جمہوریہ نہ ہو گیا ہو حالانکہ دونوں میں زمین آسمان کا فرق تھا- ایک جانب حکومت، اقتدار، اختیار اور ایک جانب بیچارے مداری گر بندر والے کی تین فٹ اونچی، پونا فٹ چوڑی گندے ناخنوں اور الجھے ہوئے بالوں والی جمہوریہ- مگر! مگر! اس ننھی منّی جمہوریہ پر نہ جانا، یہ جسے چمٹ جاتی ہے اُس سے کچھ نہ کچھ لے کر ہی اُس کی جان چھوڑتی- لوگ اِسے ٹھڈے مارتے، تھپڑ مارتے مگر وہ اُن کے کپڑوں سے لٹک جاتی- اگر کسی کی شلوار بیچ بازار اُترے تو اُتر جائے مگر رُوپلّی کے بغیر اُس کا ہاتھ چھڑانا مشکل ہی نہیں ناممکن ہو گیا تھا- اب تو اُس ننھی کو بھی اپنی حرکتوں پر ہنسی کے ساتھ ساتھ مزا آنے لگا تھا- لوگ پھانسی کے پھندے کے ڈر سے اُسے جان سے مارنے سے تو باز رہے اور اِس سے پیچھے جتنی بھی مار تھی اُسے وہ پہلے ہی اس قدر سہہ چکی تھی کہ اب اُسے اس مار کے ایک ایک انگ پر ہنسی کے ساتھ مزا آنے لگا تھا- بندر والے کو آخر اِس مختصر سی بچی سے اس قدر مشقت لینے کی کیا ضرورت تھی جبکہ وہ اُس کی سگی بیٹی تھی- جب بھی کوئی اس کی بابت پوچھتا تو مداری کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے اور وہ اپنے نوجوان بیٹے کو یاد کر کے بعض اوقات دھاڑیں مار کر رونے لگتا جسے جنگ عظیم دوئم میں بم کا گولہ لگا تھا- مزے کی بات ہے کہ بھائی نے کبھی حکومت کی بات نہیں کی، بھائی تو فقط دانش کی بات کرتا تھا- وہ تعداد کے خلاف تھا اور وہ یہ سمجھتا تھا کہ ایسی تعداد جو بدکردار اور بدعمل لوگوں کا انتخاب کرے وہ بے معنی ہے چاہے وہ کتنی زیادہ ہی کیوں نہ ہو- بھائی نہیں ہے مگر آج بھی ہم دیکھتے ہیں کہ جمہوریہ بندر کے بچے کی طرح ہماری ٹانگوں سے چمٹی ہوئی ہے- اِس کے خوف سے لوگوں نے بازاروں میں چلنا پھرنا ترک کر دیا ہے، اِس کے ڈر سے لوگ صبح کی سیر بُھول گئے ہیں- سیانے صحیح کہتے ہیں کہ بندر کے ہاتھ میں دیا سلائی پے کا گھر کھوئے- اب جو جمہوریہ کے ہاتھ میں دیا سلائی ہے تو وہ لوگوں کی ٹانگوں سے چمٹ کر ان کی دھوتیوں میں شُرلیاں چلا دیتی ہے- اِس نگوڑی جمہوریہ کا پہلے پہل تو بھائی ہی شکار ہوا تھا- اِس کو خلق کرنے کیلے چار ہزار موٹی عقل والے لوگوں کا جتھا اُن کے ناموں کے حُروف تہجی کے اعتبار سے اکٹھا کیا گیا اور پھر اِن سب کا مشترک نام جمہوریہ رکھ دیا گیا- میرا دل کہتا ہے کہ یہی نام بگڑ کر مداری کی جمہوریہ کا نام بن گیا ہوگا- بھائی کی سوچ کا کینوس بڑا وسیع تھا- ظاہر ہے کہ جو شخص ملک کو شہر سے تعبیر کرتا تھا تو وہ ساری دنیا کو اپنی ہتھیلی پر دیکھنے کا خواہاں ہوگا- ہم بات کر رہے تھے جمہوریہ کے مظاہر کی، اس کا پہلا مظہر تو بھائی کا واقعہ ہی تھا- لوگ بے تابی سے جمہوریہ کے فیصلے کا انتظار

کررہے تھے-لوگوں کو نہ تو بھائی سے کوئی ہمدردی تھی اور نہ جمہوریہ کے فیصلوں پر اعتراض، وہ تو صرف اور صرف اپنے شغل اور تفریح طبع کیلئے فیصلے کا انتظار کر رہے تھے-اِس انتظار اور فیصلے کی نوعیت ایسی ہی تھی جیسے کسی یونیورسٹی طالبعلم کے بس سے گرا کر قتل کئے جانے کے بعد دیگر بھائی بند ویعنی طالبعلم وائس چانسلر کے دفتر کے باہر احتجاج کیلئے جمع ہوئے، وائس چانسلر نے اجتماع کو منتشر کرنے کیلئے اگلے روز یونیورسٹی میں چھٹی کا اعلان کر دیا تو سارے طالبعلم چھٹی کی خوشی میں تالیاں پیٹتے اپنے ہاسٹلز کو چلے گئے-ہاں تو بات ہو رہی تھی فیصلے کے انتظار کی -انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں اور فیصلہ آ گیا-فیصلہ وہی آیا جو اِس قسم کے لوگوں کی طرف سے آیا کرتا ہے-بھائی نے تو پہلے ہی اپنے قریبی دوستوں کو فیصلے کی نوعیت سے آگاہ کر دیا تھا - فیصلے کے نتیجے میں بھائی کو شوکران پینا پڑا اور پھر ابدی اندھیروں سے آشنا ہوتی اُس کی آنکھوں نے تمام انسانوں کیلئے ایک خواب دیکھا اور اس خواب کی تعبیر کا سوچ کر اُس کے نیلے ہونٹوں پر مسکراہٹ عود کر آئی-

بلا سے ہم نے نہ دیکھا تو اور دیکھیں گے
فروغِ گلشن و صوتِ ہزار کا موسم

جیسا کہ میں نے بتایا بھائی کیلئے تو وقت، دنیا اور فاصلوں کی کوئی اہمیت نہ تھی، وہ تو جب چاہتا اِن تینوں کی اپنی ہتھیلی پر گولی بناتا اور بغیر پانی کے پھانک جاتا-بھائی کیلئے نہیں تو چلو اپنے لئے ہی سہی، پر میں وقت کا تعین ضرور کر دیتا ہوں-وہ قبل مسیح کی بات تھی تو یہ بعد مسیح کی بات ہے، میرا خیال ہے کہ اتنا کافی ہے-بیت المقدس کی گلیوں اور چوراہوں پر ٹیکس اکٹھا کرنے والوں کا راج تھا-جب بپتسمہ دینے والے نے لاکھوں انسانوں کے دِلوں کی بنجر زمینوں پر ہریالی کی فصلیں لہلہادیں-ٹیکس اکٹھا کرنے والے تو ازل سے انسانی آزادی کے دشمن رہے ہیں مگر بدقسمتی سے فیصلے کا اختیار بھی ان ہی کے ہاتھ رہا ہے-فیصلہ در فیصلہ کی تاریخ نہیں بدلی اور نہ ہی فیصلوں کی نوعیت، بھائی کو شوکران پینا پڑا تھا تو منجی کے کاندھوں پر بھاری صلیب کا بوجھ آن پڑا-شاعر نے کیا خوب کہا ہے کہ چلتے ہو تو چمن کو چلیے تو میں آپ سے کہتا ہوں کہ چلتے ہو تو صحرائے سُوس کو چلیے جہاں تمہارے ایک نہتے انسان کی سر بیدیدہ لاش بے گور و کفن پڑی ہے-یہاں بھی ٹیکس اکٹھا کرنے والوں نے اپنا آپ خوب دکھایا-دنیا والوں نے بعد ازاں اُس کے پتہ نہیں کیا کیا نام رکھ لئے مگر وہ سیدھا سادہ انقلابی آدمی تھا-جو مراعت یافتہ طبقات کے ذریعے غریبوں اور لاچاروں کے استحصال کے خلاف تھا-میرے خیال میں تو اُس سے منسوب روحانی اور ماورائی باتیں فقط افسانہ ہیں یا صرف زیب داستاں کی خاطر-یہاں بھی فیصلے کی گھڑی مقرر کی گئی-وہی عوامی جوش و انتظار، اکثریت رائے سے فیصلہ ہو جانے کی خبریں، فیصلے کی تحریر ہونے کی خبریں، فیصلے کی تحریر پر مہر تصدیق ثابت ہونے کے قصّے-پھر انسان کی تمام تر معلوم تاریخ کے موافق فیصلے کے مندرجات-یہاں پھر انسان بلکہ انسانوں نے اپنی عقل و فہم کو پچھتاوے کیلئے بچا رکھا-

اچھا تو اب آج کی بات ہے-ہیں! آج کی بات کہاں ہے، بھئی کئی سو سال کی بات ہے-میرا مطلب ہے کہ اگر بھائی کے وقت اور فاصلے کے پیمانوں کے مطابق بات کی جائے تو آج ہی کی بات ہوئی ناں-واقعہ ہے کہ ایک بار پھر جمہوریہ لوگوں کی ٹانگوں اور اِن کے سروں کو چمٹ گئی-چند نفوس کے مقابلے میں ہزاروں کے لشکر تشکیل دیے گئے-دیکھتے ہی دیکھتے ٹیکس اکٹھا کرنے والے پھر زبردست اکثریت میں تبدیل ہو گئے-اِک ذرا سی بات پر برسوں کے یارانے گئے والی بات ہوئی اور بہت عجیب بات ہوئی-کاش ہم انسانوں کی تواریخ میں ایسی عجیب باتیں نہ ہوئی ہوتیں-مگر افسوس کہ یہ ساری عجیب باتیں ہو کر رہیں -آپ کہیں گے کہ میں نے آخری معرکے کے فیصلے بارے بات نہیں کی تو عرض ہے کہ مجھ میں بات کرنے کی سکت ہی نہیں-آپ خود بات کر لیجیے، آپ خود پوچھ لیجیے، اِس جمہوریہ سے ہی پوچھ لیجیے-آپ پوچھ سکتے ہیں کیونکہ آپ تو ہمیشہ سے اکثریت میں ہیں-اگر پوچھنا ہے تو ایک بات کا دھیان رہے اور یہ فیصلہ کر کے پوچھنا کہ یا ہم نہیں یا پھر میلے ناخنوں والی گندی جمہوریہ نہیں-اے میرے لوگو! میرے لئے نہیں تو میرے بھائی کیلئے فقط ایک بار تو کوئی اچھا فیصلہ کر سکو تا کہ میں اپنے بھائی کو بتا سکوں کہ دنیا میں اُس کا خیال شرمندہ تعبیر ہوا تھا-آہ! میرا بھائی-

..... پیغامِ صحت .....

سوئٹزرلینڈ کے شہر زیورخ کے ۹۳ سالہ دندان ساز نے ۸۷ برس کی عمر میں ریٹائرمنٹ کے بعد خود کو بڑھاپے کے سپرد کرنے سے انکار کرتے ہوئے باڈی بلڈنگ شروع کر دی۔ وہ نہ صرف ہفتہ میں تین سے چار بار جم جاتے ہیں جہاں وہ باڈی بلڈنگ، ویٹ لفٹنگ اور دیگر کئی طرح کی ورزش کے علاوہ بقیہ دنوں میں کشتی رانی بھی کرتے ہیں۔ Charles Eugster کا عزم، حوصلہ اور صحت مند و توانا جسم نوجوانوں کے لیے ایک طرح کا پیغام ہے جسے ''پیغامِ صحت'' سے منسوب کیا جانا چاہیے۔

○

''جانِ آرزو''

گلزار جاوید
(راولپنڈی)

یکم جنوری ۲۰۱۳ء
اسلام آباد
پاکستان

جانِ آرزو، جانِ جہاں،
بروئے زمیں جنت نشاں!
عزیزہ محترمہ آئی۔ایم۔ایف دامِ اقبالہٗ۔

تیسری دنیا کی غریب اور مفلوکحال ریاست اسلامی جمہوریہ پاکستان کے ایک کم نصیب اہلِ قلم کا سلامِ شوق قبول کیجیے!

قبل اس کے آپ پر تعجب واضطرار کی کیفیت طاری ہو، یہ بتلانا بلکہ جتلانا ازحد ضروری ہے کہ درج بالا آداب والقاب سے کسی بھی طرح کے جذباتِ عشقی یا سفلی کا تاثر ہرگز نہ لیا جائے۔ قصّہ اصل میں یوں ہے کہ ہماری قومی زبان اردو اوّل اوّل زبانِ میرؔ و غالبؔ ہوا کرتی تھی۔ بلاشبہ ان بزرگانِ شعروسخن کی وضع قطع مومنانہ اور صوفیانہ سہی دل ان کے شوق سے ہمیشہ پُر رہے۔ اب یہاں خواہش کے باوجود اقسامِ شوق گنوانا ہمیں قطعاً مقصود نہیں وگرنہ آپ تو جانتی ہیں:

ذکر اُس پری وَش کا اور پھر بیاں اپنا
بن گیا رقیب آخر، تھا جو راز داں اپنا

والی کیفیت پیدا ہوسکتی ہے۔

قصّہ مختصر ذکر جب بھی پری وَش کا ہوتا ہے اپنا اور اپنے بزرگوں کا بیان دیکھنے بلکہ دکھانے کے لائق ہوا کرتا ہے۔ بات بزرگوں کی چل نکلی ہے تو یہاں یہ درج کرنا ضروری ہے کہ ہمارے بزرگانِ شعروسخن روزمرّہ کے معاملات سے جس قدر بے گانہ دکھائی دیتے ہیں شعروسخن میں اُس سے کہیں زیادہ حسّاس اور سخت دل واقع ہوئے ہیں۔ یعنی مذکورہ شعر میں اگر ''وَش'' کے زبر سے سرفِ نظر کیا گیا تو معنٰی ومفہوم کچھ اور بھی نکل سکتے ہیں جس کے ہم قطعی ذمہ دار نہ ہوں گے۔ ویسے بھی یہ عامی اور درباری قسم کے بزرگ تھے بڑے کائیاں! عشق ومحبت کی تہہ داریوں میں بڑے بڑے کام کی باتیں کہہ گئے ہیں۔ مثلاً پہلے والے بزرگ آج کی صورت حال کی نسبت اپنے وقت میں یوں تنبیہہ فرما گئے ہیں:

بیٹھے ہو میرؔ ہو کے درِ کعبہ پر فقیر
اس روسیہ کے باب میں بھی کچھ دعا کرو

جبکہ بعد والے بڑے میاں کچھ اس طرح پیش بندی کر گئے ہیں:

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

اب یہ ہم آپ کے ذوقِ سلیم پر چھوڑتے ہیں کہ آپ ان استادانِ سخن کی نصیحت پر کان دھرتے ہوئے ان کے اشعار کے بین السطور مفہوم کو اہمیت کا حقدار ٹھہراتی ہیں یا سطحی معنی پر توجہ دیتے ہوئے ان کی روح کو اُسی طرح غتربود کرتی ہیں جس طرح آپ نے ہماری حکومت اور وزارتِ مالیات جو کہ ہر چند کہیں ہے کہ نہیں کا کیا ہوا ہے۔

بہت ڈھونڈنے، تلاش کرنے کے بعد بھی یہ دونوں اکٹھے نظر آتے ہیں نہ جدا جدا دکھائی دیتے ہیں۔ وطن عزیز کے کئی روزناموں اور ہفت روزوں میں ہم نے ان کی گمشدگی کے اشتہار چھپوانے کی کوشش کی۔ ہر بار اشتہار کی ترسیل کے جواب میں ایک ہی نامعقول ہٹ ''پہلے سابقہ ادائیگی کرو بعد میں اشتہار چھپواؤ'' ہم نے ایک نہیں، دو نہیں کئی بار ہرکارے کو آپ کی ری شیڈولنگ والا فارمولا سمجھا اور ذہن نشین کرا کر روانہ کیا، ہر بار واپسی پر ہرکارے کو پہچاننے میں ہمیں پہلے سے زیادہ دشواری کا سامنا کرنا پڑا۔

سامنا کرتے ہوئے آج کل ہم اور بھی بہت سی چیزوں کا کتراتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک چیز جسے عرفِ عام میں آئینہ کہتے ہیں دیکھے ہوئے زمانہ بیت گیا۔ ہمیں تو رہ، رہ کے یہ ہی خوف دامن گیر رہتا ہے کہ کل کلاں کو سرِ راہے خود سے ملاقات ہوگئی تو ہم اپنی شناخت کس طور کر پائیں گے۔

پانچ، سات یا دس برس گزرے ہوں گے ہم نے آئینہ دیکھنے کی غلطی کا ارتکاب کیا تھا۔ آئینہ میں اپنی جگہ مجنوں کی شبیہہ دیکھ کر بے اختیار ہماری زبان سے یہ شعر ادا ہوگیا:

کبھی خود پہ، کبھی حالات پہ رونا آیا
بات نکلی تو ہر ایک بات پہ رونا آیا

شعر سے قطع نظر ہم حلفاً اور قسماً آپ کو یہ یقین دلانا ضروری سمجھتے ہیں کہ ہماری یا ہمارے خاندان کے کسی فرد کی میاں مجنوں سے کسی بھی طرح کی کوئی نسبت سوائے فاقوں کے ہرگز نہ ہے۔ لفظ فاقہ اتفاقی طور پر قلم کی نوک پر در آیا ہے وگرنہ جناب کی من پسند اور چہیتی سرکار نے جس طور ہمیں مصروفِ کار رکھا ہوا ہے اُس کی روشنی میں کوئی کم اصل یا کم نصیب ہی ہوگا جس کا دھیان روٹی جیسی فضول چیز کی جانب جاتا ہو۔

معافی چاہتا ہوں لفظ فضول آپ کی سماعت پر گراں گزرے گا مگر مجبوری یہ ہے کہ سرِ دست اس لفظ کا متبادل گرفت میں آ نہیں رہا۔ آپ تو اس امر سے بخوبی آشنا ہیں کہ آج کل بہت سی چیزیں ہماری گرفت بلکہ دست وبُرد سے

خاصی دُور ہوتی جارہی ہیں۔کبھی آٹا ہاتھ میں آکر پھسل جاتا ہے تو کبھی گھی کی تلاش میں ہم مارے مارے پھرتے ہیں۔چینی کی آنکھ مچولی روزمرّہ کا معمول بن چکا ہے۔بجلی کی غیر حاضری کے ایک زمانے سے ہمارا مقدر بنی ہوئی ہے اب تو پٹرول بھی نایاب چیزوں میں شمار ہوتا ہے۔گیس کب کی ہوا بن کر تحلیل ہوچکی ہے۔

حوصلہ افزا بات یہ ہے کہ ان سب چیزوں کا پتہ ہر ماہ باقاعدگی سے آنے والے صحت مند بل دے رہے ہیں۔ ہر چند وقت کے ساتھ (میرے خیال میں لفظ وقت سے پہلے مناسب رہے گا) بجلی، گیس، پٹرول غائب ہورہے ہیں، آنے والے بلوں میں نمایاں طور پر شائع شدہ موٹے تازہ ہندسوں کی تعداد میں ہر آنے والے دن کے ساتھ اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ ہمارے لیے تو یہ امر ہی خوشی سے پھول جانے کا ہے کہ آپ جناب کو ہر وقت ہماری فکر ستائے رکھتی ہے۔یعنی جو چیزیں سرے سے ندارد ہیں آپ جناب اُن کے نرخ بڑھانے کی بات کرکے ایک طرح سے ہمارے حق میں آواز اُٹھانے کا کارِ خیر انجام دے رہی ہیں۔

جس تیز رفتاری سے مذاکرات کا موسم سر پہ آیا چاہتا ہے اُسی برق رفتاری سے دل مارے خوشی کے بلّیوں اُچھلنے لگا ہے۔آپ جناب کی دریا دلی کے طفیل ہماری گم شدہ حکومت اور وزارتِ مالیات اس بار بھی آپ کو اعداد و شمار کی بھُول بھُلیوں کی سیر کرانے کے خواہش مند دکھلائی دے رہے ہیں۔اُمید ہے، اس بار بھی آپ نہایت سادگی اور پُرکاری سے ان بھُول بھُلیّوں کی سیر کے بعد اٹھارہ کروڑ عوام کو ری شیلڈونگ کی شکل میں نئے قرض کی فیوض و برکات سے بہرہ مند فرماتے ہوئے آبادی میں اضافہ روکنے بلکہ مناسب حد تک کم کرنے کی تجاویز وتراکیب بھی اضافی طور پر تجویز فرمائیں گی۔

تاریخ شاہد ہے، ہم اٹھارہ کروڑ سعادت مند گونگے، بہرے ہر بار کی طرح اس بار بھی پورے جوش و جذبے کے ساتھ آپ کے فرمان کی تائید کرتے ہوئے بادشاہ سلامت زندہ باد کے نعرے ضرور لگائیں گے۔

اگر نقاہت یا کمزوری کے باعث ہمارے گلوں سے نکلے والی آواز کسی طور آپ کو سنائی نہ دے تو اسے ہماری سرد مہری یا احسان نافراموشی پر محمول ہرگز مت کیجیے گا۔ہم اٹھارہ کروڑ عوام بے زبان جانوروں کے ریوڑ کا درجہ کیوں نہ رکھتے ہوں مگر اتنے احسان فراموش ہرگز نہیں کہ ہاتھوں کے اشاروں اور جسم کی حرکات سے آپ کے احسانات پر اظہارِ تشکر بھی نہ کرسکیں۔

ہم ہر شکل اور ہر حال میں آپ کے فیصلوں کی تائید کے پہلے بھی پابند تھے اور آئندہ بھی رہیں گے۔ ہماری جانب سے کسی بھی صورت بھوک، بیماری، بے روزگاری، جہالت یا امن و امان جیسی بے کار چیزوں پر ہرگز ہرگز وقت ضائع نہیں کیا جائے گا۔آپ تو بخوبی جانتی ہیں:

رگوں میں دوڑنے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جو آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے

خوشی کی بات یہ ہے کہ ہمارے سیاستدانوں اور بیوروکریٹس کی پیروی میں بہت سے قلمکاروں نے بھی آپ کی آواز میں آواز ملانے کی غرض سے نئے نئے گیت اور قصیدے تحریر وایجاد کرنا شروع کردیے ہیں۔

آپ جناب کی شان و شوکت اور جاہ و جلال کو فزوں تر کرنے کی خواہش میں اس حقیر، فقیر، پُرتقصیر نے بھی ایک نعرہ مستانہ ایجاد کرنے کی جسارت کی ہے جو بصد عاجزی وانکسار آپ کی نذر ہے:

ہر گھر سے بھوکا نکلے گا۔۔۔۔۔۔تم کتنے بھوکے مارو گے

☆

..... عالمی اردو ادب .....

(دھارمک نمبر)

نند کشور وکرم صاحب کو ایک بات کا شدت سے احساس تھا کہ اردو زبان وادب سے غیر مسلموں کا ناطہ بوجوہ منقطع ہو رہا ہے۔ یہ صورت حال زیادہ دیر برقرار رہی تو اردو صرف مسلمانوں کی زبان ہو کر رہ جائے گی۔ آنے والے وقتوں میں بودھ، جینی، سکھ، عیسائی اور ہندومت سے متعلق لٹریچر اردو زبان میں نایاب ہو کر رہ جائے گا۔ عالمی اردو ادب کا زیرِ نظر دھارمک نمبر پیش کرنے کی وجہ یونیورسٹی کی سطح پر غیر اسلامی ادب سے متعلق کام نہ ہونے کا سبب بھی ہے۔ ایک زمانہ تھا جب روزنامہ ملاپ، پرتاپ، اجیت، تیج، ہند سماچار، ہفت روزہ شیرِ پنجاب، ماہنامہ چندن اور راہی وغیرہ باقاعدگی سے شائع ہوتے تھے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ان تمام اخبارات و جرائد کے مالکان غیر مسلم ہوا کرتے تھے۔ آزادی کے وقت غیر مسلم اہلِ قلم کی تعداد ہزاروں میں تھی جو محدود ہو کر چند درجن رہ گئی ہے۔ آنے والے وقتوں میں اردو زبان وادب کی تنگ دامنی کے خوف کے باعث یہ دھارمک نمبر ترتیب دیا گیا ہے تاکہ جب بھی غیر مسلم ادیب و شاعر کے حوالے سے تحقیق کی ضرورت ہو تو یہ مفید دستاویز رہنمائی کے لیے دستیاب رہے۔

قیمت: چار صد روپے ہندوستانی

پتہ: ایف/۱۴/۲۱، ڈی، کرشن نگر، دہلی، بھارت۔

''پندارِ نگیں''

پروفیسر زہیر کنجاہی (راولپنڈی)

جھومر میں منقّش ہوں نہ لاکٹ میں جڑا ہوں
پندارِ نگیں ہوں کہیں رستے میں پڑا ہوں

لمحاتِ گریزاں بھی مِرے صیدِ زبوں ہیں
نیزے کی طرح وقت کے سینے میں گڑا ہوں

تُم ساتھ مِرے آ کے جہاں چھوڑ گئے تھے
میں آج بھی تنہا اُسی سنگم پہ کھڑا ہوں

یہ عہد رسائی کا ہے، ابلاغ کہاں ہے
ضدّی ہوں میں اِک لفظ کی حُرمت پر اڑا ہوں

تاریخ مِری آنکھ ہے، رفتار مِری گرد
میں اپنے زمانے کی قدامت سے بڑا ہوں

ہر اینٹ میں درزیں ہیں، لکیریں بھی ہیں لیکن
میں سنگِ تناظر ہوں، مقدّر سے کڑا ہوں

برسائیں زہیؔر اہلِ جہاں سنگ تو کیا غم
میں کانچ کا پیالہ ہوں، نہ مٹّی کا گھڑا ہوں

نعیم الدین نظؔر (میر پور خاص)

عالمِ خوف میں گلی خاموش
چھپ کے بیٹھے تھے آدمی خاموش

چونکتی ہے ہوا کی آہٹ سے
گھر کی چوکھٹ پہ اک پری خاموش

اُس سے اظہار مدّعا نہ ہوا
ہاتھ پکڑے کھڑی رہی خاموش

آج پھر اک لکیر کاجل کی
اُس کی آنکھوں سے بہہ گئی خاموش

ہم زباں ہے نہ رازداں کوئی
لوٹ جاتا ہے اجنبی خاموش

شہر کی رونقوں سے گھبرا کر
تیز چلتا رہا کوئی خاموش

کسی میں ہمت تھی کب ہلانے کی
اُس کی محفل میں تھے سبھی خاموش

آدمیت ہے آج بھی رُسوا
اب رہے گی نہ شاعری خاموش

جس کی فطرت میں شوخیاں ہوں نظؔر
وہ نہیں رہ سکا کبھی خاموش

مظہر بخاری (میاں چنوں)

چوکھٹ پہ رات بیٹھی تھی البم نکال کے
یادیں شریکِ حال ہوئیں غم نکال کے

میں تم سے عشق کر کے مصیبت میں آ گیا
تم نے تو دکھ دیا ہے مرا دم نکال کے

میں دُھول ہو رہا ہوں کھڑا انتظار میں
آئے نہ وہ بہار کا موسم نکال کے

جس کو ہے تاب آئے مرے ساتھ چل پڑے
سورج چلا ہے صبح کا پرچم نکال کے

کارِ ہنر یہی ہے کہ بجز زمیں سے
مظؔہر دکھاؤ چشمۂ زم زم نکال کے

○

نورزمان ناوک (تلہ گنگ)

یوں تعلق شجر بہاری ہے — فون سے اس کی آبیاری ہے
خوب ایجاد ہے ''پیامہ'' بھی — اب یہاں کب نجم شماری ہے
دُکھ پری سے ہم ایسے لوگوں کا — اِک زمانے سے عشقِ جاری ہے
پھر کوئی قافلہ بہتّر کا — جبر کی پھر سے ذیلداری ہے
کرچیوں کی صدائیں سُن کر بھی — شہر میں جشنِ تاجداری ہے
لاڈلا چاند کا تقاضا کرے — معذرت، محوِ آہ و زاری ہے
آئینے میں تو عکس تھا اپنا — خوف کیسا یہ ہم پہ طاری ہے
ہم تو اکثر یہ بھول جاتے ہیں — خاک کا رنگ انکساری ہے
معجزے کی اُمید ہے ناوک — جُستجو کا فسُون بھاری ہے

کرشن گوتم (چندی گڑھ، بھارت)

بات سُنیے گا میری ذرا غور سے — پیار مجھ سا نہ پایئے گا اور سے
اُنکو دیکھو تو چلتے ہیں کس ٹوہر سے — کیوں نہ ہو، ہو کے آئے ہیں لاہور سے
حکمراں تم ہو، فرمان کیوں اور سے — تم ہی بتلاؤ گزرے گی کس طور سے
اُن کا لفظ ''نہیں'' سخت و مختصر — کوئی مرتا مرے حکم فی الفور سے
گردشوں میں خود اپنا زمانہ رہا — خوب گزرے ہیں ہم اسکے ہر دور سے
پستیوں میں ہے مُضمر بُلند اختری — زندگی ہے یہ، دیکھو ذرا غور سے
کیا سکھائیگی دُنیا کے واقف ہیں ہم — اسکے ہر ظلم سے اسکے ہر جور سے
اُنکی مردم شماری میں گوتم بھی ہے — کچھ تعلق ہے اسکا بھی لاہور سے

شگفتہ نازلی (لاہور)

زلف کچھ ایسی پریشان کہ زنجیر ہوئی جاتی ہے — دل کی تاثیر بھی دل گیر ہوئی جاتی ہے،
بول تعریف کے دو چار تھے کیا کہہ ڈالے — جانے اُنجانے میں ہی ہیر ہوئی جاتی ہے،
صرف البم ہی تو مانگا تھا مگر کیا کہیے — وہ مرے سامنے تصویر ہوئی جاتی ہے،
جانے کیا چوٹ پڑی دل پہ کہ رُکتی ہی نہیں — بہتے دریا کی روانی لئے تقریر ہوئی جاتی ہے،
کیا کریں کوئی ہرا باغ دکھایا نہ گیا — اور وہ الٹی سی تدبیر ہوئی جاتی ہے،
بولنے پر جو ہے آجائے تو ٹھہرے کیونکر — پھر تو دو دھاری سی شمشیر ہوئی جاتی ہے،
صورتیں ملتی ہیں ایسی کہ گماں مشکل ہے — کیا وہی ہے یا کہ ہمشیر ہوئی جاتی ہے،
سوز میں ڈوبے ہوئے، حزن و اَلم سے لپٹے — کیا کہے شعر کہ بس میر ہوئی جاتی ہے!

صابر عظیم آبادی
(کراچی)

کرتا ہوں یہ دعا خدائے جہان سے
دکھ دینے والی بات نہ نکلے زبان سے

تانے ہوئے ہے لمس کی چادر ترا بدن
لپٹا ہوا ہے رنگ جوانی اٹھان سے

غرقاب ہو نہ جائے سفینہ حیات کا
میں لڑ رہا ہوں سانس کی بھاری چٹان سے

اڑنے کا جس میں حوصلہ رہتا ہے ہر گھڑی
گرتا نہیں پرندہ وہ اونچی اڑان سے

رکھتا ہو اپنے دل میں تڑپ وہ مرے لیے
یہ بات بھی بعید نہیں ہے گمان سے

لوگو اسی لیے ہے معطر فضائے شہر
لے کر گیا ہے آج وہ خوشبو دکان سے

مجھ کو تباہیوں سے ڈراتا ہے کیا فلک
گزرا ہوں زندگی میں کئی امتحان سے

دیوانگی کا میری وہ رکھتا خیال کیا
اترا ہوا تھا جو زمانے کے دھیان سے

صابرؔ غم حیات کو کم تر نہ جانیئے
مجھ کو عزیز تر یہ زیادہ ہے جان سے

ندیم ہاشمی
(کراچی)

رات اشکوں میں ڈھل گئی کیسے
درد کی لے مچل گئی کیسے

اے قرارِ نظر بتا تو سہی
پھر طبیعت سنبھل گئی کیسے

اُس کے خوابوں سے میں نہیں نکلا
پھر وہ آنکھوں کو مَل گئی کیسے

اُس نے ایسا کیا ستم ڈھایا
آگ، پانی سے جَل گئی کیسے

خدا جانے کیا معجزہ ہے ندیمؔ
آئی تھی جو بَلا، ٹل گئی کیسے

عرش صہبائی
(جموں، کشمیر)

ہم بھی چُپ چُپ ہیں آپ بھی خاموش
ہو گئی جیسے زندگی خاموش

دلِ محزوں کا اب یہ عالم ہے
جیسے اک شمع جل بجھی خاموش

برق و باراں کے دیکھ کر انداز
گلستاں کی ہے ہر کلی خاموش

وہ بھی آئے مزاج پُرسی کو
جب زباں اپنی ہو گئی خاموش

غیب سے کس کی یہ صدا آئی
زندگی ساتھ چل پڑی خاموش

ایسا لگتا تھا محوِ ماتم ہے
جب بھی بادِ صبا چلی خاموش

شور سے کچھ خلل پڑے نہ کہیں
ناؤ طوفاں میں بہہ گئی خاموش

زندگی مجھ سے جب ہوئی رخصت
دیر تک دیکھتی رہی خاموش

عرشؔ دُنیا میں کیا نہیں ہوتا
پھر بھی رہتا ہے ہر کوئی خاموش

تصور اقبال

(اٹک)

ہوا کے ہاتھ پر دیپک جلا کر چھوڑ دیتا ہوں
ہُنر مند ہوں سو ٹوٹے دل بھی فوراً جوڑ دیتا ہوں

اُنہیں معلوم ہے رب نے مجھے طاقت جو بخشی ہے
میں رُخ دریاؤں کے جب چاہتا ہوں موڑ دیتا ہوں

نہیں منظور مجھ کو یہ کہ بدظن کوئی مجھ سے ہو
نہ جس رستے سے جانا ہو وہ رستہ چھوڑ دیتا ہوں

مجھے مُردہ ضمیروں کو جگانا بھی تو آتا ہے
یہ مرجاتے ہیں جب تو میں انہیں جھنجھوڑ دیتا ہوں

کبھی حرفِ وفا لکھ کر کبھی کوئی گلہ لکھ کر
میں اُس نازش کی خاموشی کو یکسر توڑ دیتا ہوں

نہیں ایسا نہیں ہے کہ میں اپنے در سے سائل کو
بھکاری جان کر ہاتھوں سے خالی موڑ دیتا ہوں

جسے خلقِ خدا سے کوئی نسبت ہی نہیں ہوتی
تصوؔر میں بھی اُس سے اپنا ناطہ توڑ دیتا ہوں

کرشن پرویز

(موہالی، بھارت)

اب کسی بشر میں بھی حوصلے نہیں ملتے
جاں لٹانے والوں کے کچھ پتے نہیں ملتے

کاش ہم دکھا پاتے سب کے اصلی چہرے کو
آجکل مگر ایسے آئینے نہیں ملتے

ایک اک اکائی میں سب ہی بٹتے جاتے ہیں
اب گھروں میں نسلوں کے سلسلے نہیں ملتے

فاصلے دلوں میں بھی اب تو بڑھتے جاتے ہیں
بائے بائے کرتے ہیں اب گلے نہیں ملتے

یوں سمٹتے جاتے ہیں لوگ اپنے اپنے میں
دل تو دل گھروں کے بھی در کھلے نہیں ملتے

ایک سب کی منزل ہے ایک سب کا مقصد ہے
پھر بھی کیوں کسی کے بھی راستے نہیں ملتے

ہر طرف جفاؤں کا بول بالا ہے پرویزؔ
پیار میں وفاؤں کے اب صلے نہیں ملتے

نوید سروش

(میرپور خاص)

دعائیں مانگ کے ماؤں نے جو بسائی ہے
وہ بستی ہم نے بڑے پیار سے سجائی ہے

بہت سا پیار بہت سے خیال اور یادیں
تمام عمر کی یارو! یہی کمائی ہے

جب اُس نے سوچ کے سب زاویے بدل ڈالے
پھر اُس نے بزم میں آواز کیوں اُٹھائی ہے

زمیں پہ رہنے کا حق جس نے مجھ سے چھین لیا
وہ کوئی غیر نہیں ہے وہ میرا بھائی ہے

محبتیں تھیں مگر میں اُتر گیا بس سے
مری انا ہی یہاں میرے آڑے آئی ہے

شجر اُداس کھڑا کس کا منتظر ہے بھلا
شجر کی اپنے پرندوں سے کیا لڑائی ہے

غریبِ شہر مسلسل بھٹک رہا ہے یہاں
امیرِ شہر کی برسوں سے رہ نمائی ہے

رکھے ہیں گھر کے دریچے بھی بند اس نے سروشؔ
اور اپنے صحن میں دیوار بھی اٹھائی ہے

○

سلیم ناز
(کراچی)

گر اِک صدی کا اک صفحہ ہو کائنات کا — یہ کونسا صفحہ ہے کتابِ حیات کا
میرا بھی اس صفحے پہ کہیں نام رہے گا — میں بھی سخن طراز ہوں کچھ معجزات کا
تنہا و بے ثمر ہی گذاری ہے زندگی — حاضر کا غم رہا نہ رہا باقیات کا
زندہ تو آج بھی ہے سکندر جہان میں — پھر کیا گلہ ہے خضر سے آبِ حیات کا
یارب مجھے وہ علم عطا کر کہ جان لُوں — میں کونسا بشر ہوں تری کائنات کا
جنت کیساتھ اُسنے جہنم بنا کے نازؔ — نقشہ بتا دیا ہے نظامِ حیات کا

شبیر حسین شبیر
(جموں، کشمیر)

سفر میں ہیں مسافت ہی کو ہم منزل سمجھتے ہیں — سفر سے ہو جو عاری اُس کو ہم کاہل سمجھتے ہیں
میرا یکسر چمن کے رنگ و بو کو درگزر کرنا — بہاریں تھام ہی کب لیں جو وہ ساحل سمجھتے ہیں
ملی تھی آنکھ اُن سے جب تو اک سرسراہٹ تھی — جلوں جب شمع بنکر میں وہ کب مشکل سمجھتے ہیں
کروں نمناک آنکھوں کو میں اُن کے ہجر میں بیشک — ملے راحت جو اشکوں سے تو وہ بزدل سمجھتے ہیں
لبِ جو آج جو اُنکا رواں تھا سیلِ طوفانی — وہ کاجل سے بھری آنکھوں کو ہی ساحل سمجھتے ہیں
سرِ جہلم وہ جاناں ہے یہاں سب کچھ ہی فانی ہے — قفس کو توڑنا اب وہ ذرا مشکل سمجھتے ہیں
اُسے ہردم تو ہونا تھا فقط ہمزاد ہی میرا — جہاں والے میرے ہر درد کو محفل سمجھتے ہیں

ایم۔زیڈ۔کنول
(لاہور)

پھر آئینے سے چھڑ گئی خوابوں کی گفتگو — صبر و شکیب چھین کے یادوں کی گفتگو
دل کے صحیفے دل سے ملاقات کے لئے — سانسوں میں بھر کے لائے گلابوں کی گفتگو
پیروں کی بیڑیوں نے چھپا کر حناؤں سے — لکھی ہتھیلیوں پہ مرادوں کی گفتگو
صحنِ چمن بھی رونے لگا ہائے زار زار — خاروں سے آ ملی جو بہاروں کی گفتگو
تاروں کا قافلہ چلا میری انا کے ساتھ — کی روشنی نے بجھتے چراغوں کی گفتگو
سنگ زار آ گئے مجھے بیدار دیکھ کر — کرنے کو رتجگوں سے عذابوں کی گفتگو
پھر دھوپ کی شفق مرے آنگن میں آ گی — ابرِ کرم کو دے کے سحابوں کی گفتگو
چشم کنولؔ نے لکھی ہے خاک شفا کے ساتھ — کرب و بلا میں بکھرے گلابوں کی گفتگو

○

ہوا کے دوش پر

(ایک عام آدمی کی داستان حیات)

فیروز عالم

(کیلی فورنیا' امریکہ)

قسط۔۔۱۶

کیا دنیا میں فرشتے بھی ہوتے ہیں

ایک ہفتے بعد مجھے داخلے کی اطلاع مل گئی اور مجھ سے کہا گیا کہ میں دس دن کے اندر اندر داخلے کی فیس جمع کروا دوں جس کے بعد مجھے متعلقہ کاغذات اور کالج کے داخلے کا شناختی کارڈ مل جائے گا۔ رشید کو بھی ایسی ہی اطلاع مل گئی۔ مالی طور پر یہ دور ہمارے گھرانے کا مشکل ترین دور تھا۔ مالی طور پر ہم بہت زیادہ فارغ البال تو کبھی بھی نہیں تھے البتہ! ایک متوسط گھرانے کے طور پر عزت سے گذارا ہو جاتا تھا۔ مگر اس دور میں دو وجوہات کی بنا پر حالات دگرگوں تھے۔ ایک تو یہ کہ میرے ابّا پچپن سال کی عمر میں ریلوے سے ریٹائر کر دئے گئے تھے (کہ اس زمانے میں سرکاری ملازمت سے لازمی طور پر سبک دوشی کی یہی عمر تھی) اور بیحد دوڑ دھوپ کرنے کے باوجود ان کی پنشن بھی ابھی تک شروع نہیں ہوئی تھی۔ دوسرے چند ہی ماہ پہلے ہمارے گھرانے کے واحد کفیل، میرے بڑے بھائی جان سلطان عالم کی شادی ہوئی تھی۔ اگرچہ گھر کے حالات دیکھتے ہوئے وہ شادی کے لئے ہرگز تیار نہیں تھے مگر میری والدہ نے یہ سوچتے ہوئے کہ اگر حالات اچھے ہونے کا انتظار کیا گیا تو اس میں اتنا طویل عرصہ لگ جائے گا کہ پھر شاید وہ کبھی شادی نہ کر سکیں۔ یہ تھا بھی صحیح کیونکہ ہم تین بہن بھائی یعنی میری بہن ریحانہ آپا، میں اور پھر میری چھوٹی بہن دردانہ سب اتنے چھوٹے تھے کہ ان سب کو اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے میں دس سال لگتے۔ بھائی جان کہتے بھی یہی تھے کہ ہماری خاطر وہ کبھی بھی شادی نہیں کریں گے اور بخوشی اپنا فرض نبھائیں گے۔ مگر میری والدہ یہ نہیں چاہتی تھیں کہ ہمارے کنبے کی وجہ سے بھائی جان کے ساتھ ناانصافی ہو اور وہ زندگی کی حقیقی خوشیوں سے محروم رہیں۔ وہ انہیں پھلتے پھولتے دیکھنا چاہتی تھیں۔ اس لئے انہوں نے زور دے کر سلطان بھائی جان کی شادی کر دی تھی۔ اسکی وجہ سے نہ صرف ایک فرد کا اضافہ ہو گیا تھا بلکہ ہمارا گھرانا کچھ قرضے کے بوجھ تلے بھی دب گیا تھا۔ داخلے کے لئے کالج نے پانچ سو روپے طلب کئے تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ رقم ہمارے پاس نہیں۔ میں اپنی والدہ کے زانو پر سر رکھ کر رو رو کر یہی کہتا تھا کہ یہ روپے کہاں سے آئینگے مگر میری والدہ ہمیشہ یہی کہتی تھیں کہ تم صرف ہمت رکھو اور امید کا دامن نہ چھوڑو اللہ خود کوئی انتظام کرے گا میں اس پر جھلا کر کہتا ''مگر کیسے؟؟'' وہ کہتیں بس صبر سے کام لو۔ مجھے بہت عرصے یہ نہیں معلوم ہوا کہ وہ پانچ سو روپے کہاں سے آئے مگر داخلے کی آخری تاریخ سے پہلے میری امّاں نے مجھے پانچ سو روپے دئے میں نے اور سلطان بھائی جان نے جام شورو جا کر میرا داخلہ کروا دیا۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ انہوں نے بڑی کوشش کر کے کمیٹی ڈالی تھی اور پہلا حصہ لیا تھا۔ میں بیحد خوش تھا مگر مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ ابھی ایک اور مشکل اور آزمائش تھی جو شاید ایسی تھی کہ اسے عبور کرنا میرے یا میری والدہ کے اختیار میں بھی نہ ہوتا اور میں ساحل پر آتے آتے ڈوب جاتا۔ مگر ایک تو اللہ یقیناً اس کی مدد کرتا ہے جو اس پر توکل کرے دوسرے میرا ایمان ہے کہ دنیا میں ہمیشہ ایسے فرشتہ خصلت لوگ ہوتے ہیں جن کی زندگی کا مقصد کسی کی بے لوث مدد کرنا ہوتا ہے۔

یہاں میں ایک ایسا واقعہ لکھ رہا ہوں جس نے میری زندگی بدل دی۔ اس سے بہت سے لوگوں کو سبق حاصل ہوگا۔

داخلہ کی خوشی تو تھی مگر مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ کالج کی ماہانہ فیس، ہاسٹل کا خرچہ، روزانہ کھانے کے اخراجات، کتابیں اور ذاتی ضروریات کے لئے مجھے کم از کم سو روپے مہینہ درکار ہونگے۔ سلطان بھائی جان کی ڈھائی سو روپے کی تنخواہ میں سے سو روپے میرے لئے مختص کرنا ناممکن تھا۔ میں نے اپنے اخراجات پورے کرنے کے لئے اس پر آس لگائی تھی کہ مجھے میرٹ اسکالرشپ مل رہا ہے جو اگرچہ پینسٹھ روپے ماہانہ ہے مگر میں اسی میں کسی طرح کھینچ تان کر گزارا کر لوں گا۔ اگر بہت ہی سنگین ضرورت ہوئی تو گھر والوں سے حد سے حد بیس روپے اور لے لونگا۔ مگر داخلے کے فوراً بعد ہی مجھے بتایا گیا کہ کاغذات کی تیاری، حکومت کی آہستہ روی اور دوسری وجوہات کی وجہ سے اسکالرشپ کی رقم یک مشت سال کے آخیر میں ملے گی اور پہلا سال پوری طرح مجھے خود اپنی جیب سے اخراجات پورے کرنے ہونگے۔ اس نے مجھے ایک ایسا دھچکہ پہنچایا جس کا صدمہ میں آج بھی محسوس کر سکتا ہوں یعنی مجھے بارہ سو روپے کا بندوبست کرنا تھا۔ یاد رہے یہ وہ دور تھا جب ایک اچھی کار چھ سات ہزار میں آتی تھی اور ناظم آباد میں ایک درمیانہ گھر بارہ ہزار میں تعمیر ہو جاتا تھا۔ اتنی بڑی رقم کا بندوبست ہمارے کنبے کے لئے ناممکن تھا۔ گھر میں روزرات کئی طرح کے حل تلاش کرنے کی کوشش کی گئی مگر کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ ہمارے کنبے میں ان گنت متمول اور صاحب ثروت گھرانے تھے مگر ماضی میں انہوں نے وقت پر نہ صرف ہماری کوئی مدد نہیں کی تھی بلکہ ان سے مدد طلب کرنے پر انہوں نے ہمیشہ منفی رویہ اختیار کیا تھا۔ پھر اپنی تعلیم کے سلسلے میں تو مجھے کسی جانب سے کبھی کوئی حوصلہ افزائی نہیں ملی تھی۔ بہت سوچنے کے باوجود بھی ہمیں کوئی راہ نظر نہیں آتی تھی۔ میں نے رو رو کر اس تلخ حقیقت کو قبول کر لیا تھا اور اس بات کا فیصلہ کیا تھا

کہ میں پہلے میرپورخاص سے BSC کروں گا وراس کے بعد ہر روز گاڑی پکڑ کر حیدرآباد جا کر سندھ یونیورسٹی سے فزکس میں MSC کروں گا۔

میرے انٹر سائینس میں پورے صوبے میں فزکس میں اتنے چھ نمبر تھے کہ مجھے بتایا گیا تھا کہ اس سے پہلے اتنے نمبر یعنی سو میں سے ترانوے نمبر کسی نے نہیں لئے تھے۔ایم ایس سی کے بعد میرا خیال تھا کہ مجھے شاید حکومت کی طرف سے کسی غیر ملک میں جا کر نیوکلئر فزکس میں مزید تعلیم حاصل کرنے کا وظیفہ مل جائے۔اس زمانے میں پاکستان ایٹومک انرجی کمیشن اچھے اور ذہین لڑکوں کی تلاش میں تھا۔پھر بھی میں بہت دکھی ہوتا تھا اور میں نے امید کا دامن بالکل چھوڑ دیا تھا مگر میری امّاں مستقل یہی شعر پڑھتی تھیں

اسے فضل کرتے نہیں لگتی بار

نہ ہو اس سے مایوس امید وار

وہ بار بار کہتی تھیں اللہ کہیں نہ کہیں سے ضرور مدد کرے گا۔میں چڑ کر کہتا کہاں سے کرے گا کیا وہ خود اتر کر زمین پر آئے گا تو وہ کہتیں نہیں وہ خود تو نہیں آئے گا مگر وہ کوئی وسیلہ ضرور پیدا کرے گا اللہ تمہاری محنت کو کبھی رائیگاں نہیں جانے دے گا مگر مجھے کوئی امید نظر نہیں آتی تھی۔اتنے اچھے نمبروں سے پاس ہونے اور سرفہرست داخلے کے باوجود اپنی ساری زندگی کے حسین ترین اور واحد خواب کے چکنا چور ہونے پر مجھ پر جو گذر رہی تھی وہ میں ہی جانتا تھا۔اس کی گواہی میرا وہ تکیہ ہی دے سکتا تھا جو راتوں کو بھیگ جاتا تھا۔میں نہیں چاہتا تھا کہ میرے گھر والے مجھے رنجیدہ دیکھیں اور اپنی کم مائیگی پر نادم ہوں۔

ہمارے گھر کے سامنے ایک بہت بڑا نیم کا درخت تھا اور ہمارا گھرانا سارے شہر میں اس درخت کے حوالے سے پہچانا جاتا تھا۔میں عام طور سے صبح دس بجے کے وقت اس درخت کے نیچے ایک چارپائی پر بیٹھ کر اپنی سوچوں میں غلطاں ہو جاتا تھا۔ایک دن میں اسی طرح اس درخت کے سائے میں بان کی چارپائی پر بیٹھا تھا کہ میرے پاس سے فخر الدین خان صاحب گذرے۔وہ میرے ابّا ہی کے ہم عمر تھے اور انہی کی طرح ریلوے میں گارڈ کی ملازمت کر رہے تھے۔وہ ہمارے محلے سے دور ایک دوسرے محلے یعنی کھڈرو لائن میں رہتے تھے۔وہ ہمارے علاقے میں آتے بھی نہیں تھے نہ جانے اس دن کس سلسلے میں ادھر آ نکلے۔چھاجھ بھری کھچڑی داڑھی گٹھا ہوا بدن قدرے چھوٹا قد۔شرعی پاجامہ پہنتے تھے اور اپنی شرافت، رواداری اور دین کی پاسداری کے لئے بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔میں نے انہیں سلام کیا۔وہ رک گئے پہلے سلام کا جواب دیا پھر خوشدلی سے کہنے لگے ''بھئی معلوم ہوا ہے کہ تم نے بڑے اچھے نمبروں سے امتحان پاس کیا ہے اور اب تمہیں بڑے اعزاز کے ساتھ میڈیکل کالج میں داخلہ ملا ہے۔کب جا رہے ہو جام شورو؟؟'' میں نے ڈوبی ہوئی آواز سے کہا ''جی ہاں داخلہ ملا تو ہے مگر شاید میں وہاں جا نہ سکوں۔'' بہت حیرانی سے پوچھا ''مگر کیوں۔۔ایسا موقعہ کس کو ملتا ہے'' اب میری آواز رندھ گئی اور میں نے بڑی مشکل سے کہا کہ کچھ مالی مسائل ہیں۔انہوں نے تفصیل پوچھی میں نے انہیں بتایا کہ اسکالرشپ سال کے آخیر میں یکمشت ملے گا مگر اس وقت تک خود کو سپورٹ کرنے کے لئے مجھے کافی روپوں کی ضرورت ہے جو ہمارے پاس نہیں ہیں۔بس انہوں نے مزید کچھ نہیں پوچھا۔۔کہنے لگے جعفری آپا (میری والدہ) کہاں ہیں؟؟ میں نے کہا وہ تو کہیں گئی ہوئی ہیں۔کہنے لگے جیسے ہی آئیں ہمارے یہاں بھیج دینا۔یہ وہ زمانہ تھا جب پورا محلّہ ایک کنبے کی طرح ہوتا تھا سب کے غم اور سب کی خوشیاں مشترک ہوتی تھیں۔میری والدہ شام کو ان کے یہاں گئیں۔انہوں نے ہر مہینے سال بھر پینسٹھ روپئے (جو میرے وظیفے کے برابر رقم تھی) دینے کا وعدہ کیا جس سے میں اپنے اخراجات پورے کروں۔میری والدہ نے انہیں اس بات پر راضی کیا کہ یہ قرض ہوگا اور جیسے ہی وظیفے کی رقم ملے گی ان کے روپئے انہیں اکھٹے واپس کر دئے جائینگے۔اس فرشتہ خصلت انسان کی وجہ سے میں آج یہاں پہنچا ہوں۔میں نے کالج جائن کیا اور اسکے بعد بغیر یاد دہانی کرائے ہر ماہ کے شروع دنوں میں ان کا منی آرڈر مجھے مل جاتا تھا۔یہ رقم کلی طور پر تو اخراجات کے لئے کافی نہیں تھی مگر میں کسی نہ کسی طرح اس میں گذارا کر لیا کرتا تھا۔دوسرے سال سے وظیفہ ہر ماہ ملنے لگا اور مجھے مزید کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلانے پڑے۔اگرچہ فخر الدین صاحب نے ایک سال میری کفالت کی اور وظیفہ ملتے ہی ہم نے ان کے یہ روپئے شکریہ کے ساتھ واپس بھی کر دئے مگر ان کی اس رقم کا کوئی مول نہیں کیونکہ یہ مدد میری زندگی کے ایک ایسے موڑ پر تھی کہ اس کی وجہ سے میں اس قابل ہوا کہ اپنے خواب پورے کر سکوں۔باالواسطہ طور پر میری موجودہ ترقی اور حیثیت کے ذمہ دار وہی ہیں جس کے لئے میں ان کا ہمیشہ احسان مند اور شکر گذار رہوں گا۔میں نے ان کے احسان کا تذکرہ درجنوں دفعہ محفلوں میں بیٹھ کر کیا۔میں ان کے لئے ہمیشہ دعا گو رہتا ہوں کہ اللہ انہیں اور ان کی اولادوں کو اسکا صلہ دے۔

اسی کے ساتھ میں اپنے دوست رشید غوری کے ساتھ بھی ایسے ہی واقعہ کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔اس کے مالی حالات تو شاید مجھ سے بھی دگرگوں تھے۔وہ میرپورخاص سے کچھ میل دور ایک چھوٹے شہر سانگھڑ کا تھا۔اس نے بھی فرسٹ ڈویژن میں امتحان پاس کیا تھا اور اس کو بھی لیاقت میں داخلہ مل گیا تھا۔مگر اسے اسکالرشپ نہیں ملا تھا اس لئے اس کو نہ صرف ایک سال بلکہ پورے پانچ سال تک اپنے اخراجات پورے کرنے تھے جو بالکل ناممکن تھے۔وہ ناکام ہو کر واپس سانگھڑ جا رہا تھا۔اس نے بھی سوچ لیا تھا کہ وہ پی ڈبلیو ڈی میں نوکری کر لے گا۔مگر بقول اس کے اس کا ضمیر مطمئن تھا کہ اس کے مستقبل کی تباہی کی وجہ اس کی نااہلی نہیں بلکہ حالات کی زیادتی ہے۔ریل میں اسے سانگھڑ کے ایک بزنس مین ملے جن کا وہاں ایک میڈیکل سٹور تھا۔انہوں بڑے جوش اور فخر سے رشید سے کہا کہ تم نے سانگھڑ کا نام بلند کر دیا ہے سنا ہے تمہیں میڈیکل کالج میں داخلہ مل گیا ہے (اس وقت تک سانگھڑ کی تاریخ میں رشید دوسرا لڑکا تھا

جسے میڈیکل کالج میں داخلہ ملا تھا) رشید نے کہا مل تو گیا ہے مگر میں وہاں تعلیم حاصل نہ کر پاؤں گا۔ وہ حیران ہوئے۔ رشید کے بتانے پر کہ مسئلہ اخراجات کا ہے انہوں نے فوراً اسے پیشکش کی کہ پورے پانچ سال وہ رشید کی تعلیم کے اخراجات اٹھائینگے۔ رشید کو پورے پانچ سال انکا سو روپے کا مہینہ وار منی آرڈر ملتا تھا اور چونکہ اسے سو روپے ملتے تھے اور میرا وظیفہ صرف پینسٹھ روپے تھا اس لئے حقیقت میں رشید مجھ سے بہتر حالت میں رہتا تھا۔

یہ سب اس لئے لکھا جا رہا ہے کہ لوگوں کا انسانیت پر سے اعتماد نہ اٹھ جائے اس لئے کہ ہر دور میں، حتی کہ آج کے خود غرض دور میں بھی مجھے یقین ہے کہ ایسے لوگ ہوں گے جن کا مقصد حیات ضرورت مندوں کی مدد کرنا ہے۔ یہ لوگ فرشتہ نہ تھے مگر ان کو فرشتہ ہونے کی ضرورت بھی نہ تھی کیونکہ انسان ہونا ہی سب سے بڑی خوبی ہے۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے

فرشتہ سے بہتر ہے انسان ہونا
مگر اس میں پڑتی ہے محنت زیادہ

انہی دنوں میرے بھائی جان کی شادی ہوئی۔ یہ میرے اور میرے کنبے کے لئے ایک ناقابل فراموش خوشی و مسرت کا باعث ہوئی اس لئے یہاں اس کا تذکرہ ضروری ہے۔

بھائی جان کی شادی

میرے ابّا کے صرف دو بیٹے تھے۔ میں اور میرے بڑے بھائی صاحب جنہیں میں ''بھاجب'' کہتا تھا۔ میں ان سے بہت چھوٹا تھا اسلئے ہم تمام بہن بھائیوں کی اس آرزو اور تمنا کا مرکز کہ ہمارے گھر میں بھی ایک بھابی کا پیار بھرا آنچل لہرائے ہمارے بڑے بھائی سید سلطان عالم تھے۔ ہم اس لمحے کے لئے بیقرار تھے کہ ہم سب ایک نئی نویلی دلہن پر اپنی محبت نچھاور کریں۔ سلطان بھائی جان اس وقت گھر کا واحد سہارا تھے اور ان کی انتہائی قلیل تنخواہ میں اتنا بڑا کنبہ پل رہا تھا۔ ان میں قیامت کی احساس ذمہ داری تھی اور خدا نے انہیں بے مثال ایثار کا جذبہ عطا کیا تھا۔ وہ کسی حالت میں شادی پر تیار نہیں ہوتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ قدرت نے انہیں اسی لئے پیدا کیا تھا کہ وہ ابّا کے ریٹائرمنٹ اور آنکھوں سے معذوری کے بعد کنبے کی مکمل کفالت کرینگے، دونوں بہنوں کی شادی کرینگے اور فیروز کو ڈاکٹری پڑھائینگے۔ مگر میری امّاں کو یہ قبول نہ تھا کہ وہ ہم سب کے لئے قربانی دے کر اپنی زندگی برباد کرلیں۔ میں اپنے بھائی پر اسی سرگزشت میں ایک مکمل باب لکھ چکا ہوں اس لئے مختصراً یہ لکھنا کافی ہوگا کہ میرے بھائی جان کی شادی حیدرآباد میں سید آباد علی صاحب کی صاحبزادی شکیلہ سید سے طے ہوگئی۔ بھابی اس وقت سندھ یونیورسٹی میں اردو ادب میں ایم اے کی طالبہ تھیں اس بات کی بڑی خوشی تھی کہ یہ گھرانہ بھی سید تھا کیونکہ اس وقت تک میرے ابّا اس بات پر بضد تھے کہ ہم کھرے سید ہیں اور رشتہ صرف سید گھرانے ہی میں ہونا چاہئے (بعد میں سلطان بھائی جان کو بھی اس پر اصرار تھا کہ ان کی بیٹی ڈاکٹر نعمانہ سلطان کی شادی بھی سیدوں میں ہو۔ یہ اس لئے لکھ رہا ہوں کہ میں ان باتوں کو نہیں مانتا میرے نظریہ میں انسان کا کردار اسکی ذات ہے۔ میرے نام کے ساتھ کہیں ''سید'' نہیں ہے، اور میرے بچوں کے رشتوں میں یہ شرط نہیں ہوگی) مجھے بھابی کا شوق بچپن سے تھا جس کی وجہ سے میں بیحد مسرور تھا مگر اس خوشی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ہماری ہونے والی بھابی اردو میں ایم اے کر رہی تھیں اور مجھے ان کی کتابیں پڑھنے کا موقعہ ملے گا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ خوب گذرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو۔

یہ شادی ایسی یادگار شادی تھی کہ اس پر کئی صفحات کالے کئے جاسکتے ہیں مگر میں اختصار سے کام لوں گا۔

شادی ستمبر ۱۹۶۳ میں ہوئی۔ بارات حیدر آباد جانی تھی۔ میری والدہ خاندان میں بیحد ہر دالعزیز تھیں اور ہر ایک کی شادی میں کراچی گئی تھیں اس لئے کراچی سے دور دور کے رشتہ دار میر پور خاص آ گئے۔ اب ہمارا دو کمروں کا چھوٹا سا مکان۔۔ شہر میں کراچی والوں کے معیار کا کوئی ہوٹل نہیں، آس پڑوس والے بھی چھوٹے چھوٹے گھروں میں بڑے کنبوں کے ساتھ مشکل سے وقت گذار رہے تھے۔ یہ تقریباً دو سو افراد تھے۔ ایک PANIC پھیل گیا۔ مگر واہ۔۔ کیا محبتوں اور مروتوں کے زمانے تھے۔ میر پور خاص کے اسٹیشن ماسٹر انچارج نے کہا سلطان پورے محلے، بلکہ پوری ریلوے کا بیٹا ہے۔ ہمارے گھر کے سامنے جو ریلوے لائن پڑی تھی اس پر ایک خصوصی طور پر تیار کی گئی ریل گاڑی جس میں صرف فرسٹ اور سیکنڈ کلاس کی بوگیاں تھیں کھڑی کردی گئی، ان میں صاف ستھری ایسی سیٹیں تھیں جن پر رات کو سویا جاسکتا تھا اور ان میں اٹیچ باتھ روم کی بھی سہولتیں تھیں۔ ولیمے کے دوسرے دن تک یہ ٹرین کھڑی رہی اور تمام مہمان اس میں بڑے آرام سے رہے۔ نہ صرف ہمارے کراچی کے عزیز بلکہ میر پور خاص کے ملنے والے بھی انگشت بدنداں رہ گئے کہ کتنا اچھا انتظام ہوا۔ اس کا آج بھی تذکرہ ہوتا ہے۔ دوسرے دن جب بارات حیدرآباد گئی تو ایک بار پھر ایک سپیشل ٹرین چلی جو اس بارات کو لے کر حیدرآباد گئی۔ لگتا تھا کسی معمولی آدمی کی نہیں بلکہ کسی رجواڑے کے راجکمار کی شادی ہے۔ اس کی بڑی وجہ میری امّاں کا اخلاق اور محلے والوں کے لئے ان کی طبیعت، میرے ابّا کی منکسر المزاجی اور سلطان بھائی جان کے لئے لوگوں کی محبت تھی۔

ابّا کا وہم

لیکن اس کے ساتھ ہی ایک اور دلچسپ بات کا تذکرہ بھی ضروری ہے۔ شادی کی گہما گہمی اپنی جگہ تھی اور دوسری طرف میرے ابّا سخت پریشان تھے اور کبھی کونے میں بیٹھ کر آہیں بھرتے تھے کبھی کمرے میں جا کر تنہا لیٹ جاتے تھے۔ دراصل میں نے شروع میں لکھا تھا کہ میرے ددھیال میں یہ روایت تھی کہ باپ اپنے بڑے بیٹے کا سہرا نہیں دیکھ پاتا اور شادی سے پہلے انتقال کر جاتا ہے تو یہی وہم انہیں پریشان کر رہا تھا۔ میری امّاں تو اس قسم کے توہمات کے بیحد خلاف

تھیں مگر جب تک بھائی جان کا نکاح نہیں ہو گیا، چھوہارے تقسیم نہ ہو گئے اور ابّا کو لوگوں نے گلے لگا کر مبارکباد نہ دے دی انہیں پریشانی رہی۔ میری امّاں انہیں چھیڑنے کے لئے کہنے لگیں ''لو۔۔ اگر میں تمہاری سنتی تو میرا بیٹا تو کنوارا ہی رہ جاتا'' بارات ساتھ خیریت کے اسی اسپیشل ٹرین میں واپس آئی اور دوسرے دن بڑی شان سے ولیمہ ہوا جس میں آدھا میر پور خاص شریک تھا۔۔ مگر نہ جانے کیوں میرا دیوانہ دل یہ آس لگائے بیٹھا تھا کہ شاید اس ولیمے کے بہانے نجمہ کے گھر والے بھی ہماری محفل میں شریک ہو جائیں اور مجھے نجمہ کو سجے بنے جوڑے میں دیکھنے کا موقعہ نصیب ہو جائے۔۔ میری آنکھیں اسے تلاش کرتی رہیں مگر میری یہ آرزو پوری نہ ہو سکی۔ ہوتی بھی کیسے نجمہ کے کنبے سے ہمارے کسی قسم کے تعلقات نہیں تھے۔ یہ آپ بیتی لکھتے ہوئے مجھے خمار بارہ بنکوی کا یہ شعر یاد آ رہا ہے

وہی آج پھر یاد آنے لگے ہیں
جنہیں بھولنے میں زمانے لگے ہیں

میڈیکل کالج کے لئے روانگی

شادی کے چند ہی دن بعد مجھے حیدر آباد بلکہ یوں کہیں جام شورو کے لئے روانہ ہونا تھا۔ ایک تو ہمارے گھر میں ویسے ہی رونق کا سماں رہتا تھا دوسرے ایک نئی نویلی دلہن کی آمد کی وجہ سے ماحول بیحد دلکش اور پیارا ہو گیا تھا۔ صبح صبح ناشتے پر زیادہ تر میں بھابی کے ساتھ ہوتا کیونکہ میری بہنیں ریحانہ آپا اور دردانہ اسکول ہوتیں اور بھائی جان کی ملازمت ایسی تھی کہ وہ ریل گاڑی لیکر کہیں گئے ہوتے ادھر بھابی اور مجھ میں خوب جمتی کہ وہ میری چرب زبانی اور میں ان کی حاضر جوابی سے بہت محظوظ ہوتا تھا۔ ان حالات میں یہ تصور ہی بڑا برا لگتا تھا کہ میں چند دنوں میں یہ پر رونق ماحول چھوڑ کر جام شورو کے اجڑے بیابان کی جانب سدھارونگا۔

بہر حال وہ شام بھی آ پہنچی جب میری روانگی تھی۔ امّاں نے میرا بکسا (جی ہاں ایک لوہے کا صندوق جسے بکسا کہا جاتا تھا) تیار کر دیا تھا۔ شام کو پونے پانچ بجے ایک ریل کار میر پور خاص سے حیدر آباد جاتی تھی۔ مجھے اس سے جانا تھا۔ مجھے اس کا اندازہ نہیں تھا کہ میں رخصت کے وقت اس قدر جذباتی ہو جاؤنگا۔ جب امّاں مجھ سے گلے ملیں اور انہوں نے دعائیں دیں تو میں اس قدر جذباتی ہو گیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ میں ویسے بھی ایک بیحد جذباتی اور حساس انسان ہوں اور اس عمر میں بھی کئی مقامات پر میرے سب کے سامنے آنسو نکل آتے ہیں۔ میں گھر سے تو پچاسوں بار باہر گیا تھا مگر اس موقعہ پر جبکہ میرا سامان بندھا تھا مجھے اس خیال سے کہ اب میرا گھر مجھ سے چھوٹ رہا ہے اور آئندہ پانچ سال میرا گھر یہ نہیں بلکہ لیاقت میڈیکل کالج کا ہوسٹل ہوگا اور اگر یہاں واپس آؤں گا بھی تو اس گھر میں ایک مہمان کی صورت آؤں گا میرا دل بیٹھنے لگا اور میرے آنسو نکل آئے۔ سب نے سمجھایا کہ میں ایک نیک مقصد کے لئے گھر چھوڑ رہا ہوں اور کہیں دور نہیں جا رہا۔ اگر ہر ہفتے نہیں تو کم از کم ہر دوسرے ہفتے میر پور خاص آتا رہوں گا۔ مگر میرا دل بوجھل رہا اور میں میر پور خاص سے حیدر آباد، پورے راستے ٹرین کی کھڑکی سے باہر دور افق پر ڈوبتے سورج کو تکتا رہا اور میری آنکھوں سے آنسو رواں رہے۔ ہو سکتا ہے یہ پڑھتے ہوئے بہت سے لوگ میرا مزاق اڑائیں یا مجھ پر ہنسیں کہ بھئی کہیں ''لام'' پر تو نہیں جا رہے تھے مگر اُس وقت یہی میرے جذبات تھے اور انہیں ایمان داری سے بیان کرنا میرا فرض ہے۔

حیدر آباد کے ریلوے اسٹیشن سے تانگہ کیا اور ''مارکیٹ'' پہنچا۔ وہاں سے اگرچہ جام شورو کے لئے میڈیکل کالج کی بسیں مفت چلتی تھیں مگر ایک تو مجھے اچھی طرح معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں سے ملیں گی دوسرے مجھ سے میرے دوست سینئر طلبہ نے کہا تھا کہ اکیلے بس میں نہ بیٹھنا کیونکہ نئے طلبہ کے ساتھ سینئر طلبہ FOOLING کے نام پر بہت خراب حرکتیں کرتے ہیں، میں ڈرا ہوا تھا اور میں نے موٹر رکشہ جو بہت مہنگا تھا لینا مناسب سمجھا۔

یہ شام مجھے اپنی آخری سانس تک یاد رہے گی۔ کچھ عجیب جذبات طاری تھے۔ میری زندگی کا ایک باب اختتام کو پہنچ رہا تھا اور ایک نئے باب کی شروعات ہو رہی تھی۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ آنے والے دن، بلکہ یہ کہیں کہ آنے والے ماہ و سال میرے لئے کیا لیکر آئینگے۔ میرے دل میں امید کی شمعیں روشن تھیں۔ مگر مستقبل ان دیکھا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ قدرت میری محنت اور جذبے کو دیکھتے ہوئے کامیابیوں، خوشیوں اور شادمانیوں سے سرفراز فرمائیگی۔ انہی خیالات میں گم تھا جب رکشہ نے ایک موڑ کاٹ کر مغرب کی جانب ڈھلان پر اترنا شروع کیا۔ ان دنوں حیدر آباد سے جام شورو کا راستہ بہت خوبصورت تھا۔ حیدر آباد ویسے بھی ایک چھوٹی سی پہاڑی پر بنا ہے۔ شہر کی حدود سے نکل کر میدانی راستہ جو چند چھوٹے چھوٹے ریت کے ٹیلوں پر مشتمل ہے شروع ہوتا ہے۔ میرے سامنے سورج غروب ہو رہا تھا اور ڈھلتی دھوپ نے آسمان پر شفق کے گلابی رنگ بکھیرے ہوئے تھے۔ ایک طویل بل کھاتی سڑک پر چلتے ہوئے ہم دریائے سندھ کے کنارے پہنچنے والے تھے۔ اس زمانے میں اس دریا میں بے تحاشہ پانی تھا اور اس پر کچھ ہی سال پہلے غلام محمد بیراج کی تعمیر ہوئی تھی۔ ہمیں یہ پل پار کرنا تھا۔ ابھی مکمل اندھیرا نہیں ہوا تھا مگر اس پل پر لگے سینکڑوں بلب روشن ہو چکے تھے اور ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی خاص تقریب کے سلسلے میں چراغاں ہو رہا ہو۔ میں نے اس کو قدرت کا یہ اشارہ سمجھا کہ میری زندگی کے ایک نئے دور کے ابتدا میں قدرت میرا استقبال کر رہی ہے اور مجھے کامیابی کی نوید سنا رہی ہے۔ دریا کے دونوں جانب مچھیروں کی جھونپڑیاں تھیں جن میں لٹکتی لالٹینوں میں بتیاں جل چکی تھیں۔ دریا کے پانی پر شفق رنگ عکس، پل پر لگے ان گنت قمقموں کی جگمگاہٹ اور مچھیروں کی بستی میں جلتی بجھتی روشنیوں نے ماحول کو سحر انگیز بنا دیا تھا۔ پل پار کرتے ہوئے ہم دریا کے مغربی کنارے پر بنے ''المنظر''

ریسٹورنٹ،جس کا بالائی ڈیک پانی کے اوپر بنا تھا، کے پاس سے گذرے اور ضلع دادو کی حدود میں داخل ہو گئے۔ یہاں سے ہمارا کالج صرف چار میل دور تھا۔اس وقت مجھے معلوم نہیں تھا کہ میڈیکل کالج کے سینئر سالوں میں ہم درجنوں مرتبہ چاندنی راتوں میں یہاں کبھی مچھیروں کی تازہ پکڑی اور تلی ہوئی ''پلاّ'' مچھلی کھانے اور کبھی المنظر پر دیر گئے کافی پینے آئینگے اور واپس پیدل ہنستے کھیلتے چار میل کا سفر طے کر کے اپنے کالج جایا کرینگے۔

کچھ دیر بعد میرا رکشہ ریلوے لائن پار کر کے، ''سرائے'' کے قریب سے گزرتا ہوا ''ابن سینا ہال'' کے سامنے ٹھہر گیا۔ مجھے کمرہ تو ''الطبری ہال'' میں الاٹ ہوا تھا مگر مجھے اس کی چابی نہیں ملی تھی۔اس لئے میں نے اپنے میرپور خاص کے دوست لطیف چغتائی کے ساتھ چند دن گذارنے کا پروگرام بنایا تھا۔ابن سینا ہال کی وسیع لابی میں پلاسٹر آف پیرس کا بنا حکیم ابن سینا کا ''بسٹ'' دیوار پر نسب تھا جس سے اس کی خوبصورتی میں اضافہ ہو گیا تھا۔لطیف نے میرا گرمجوشی سے استقبال کیا۔ہم نے سجے سجائے ڈائینگ ہال میں کھانا کھایا کچھ لڑکوں نے لطیف سے پوچھا کہ میں کون ہوں اس پر انہیں بتایا گیا کہ میں کالج کا نیا طالب علم ہوں۔واپس کمرے پر آ کر ابھی ہم باتیں کر ہی رہے تھے کہ تیسرے سال کا ایک لڑکا منظور جنجوعہ جو بہت لحیم شحیم تھا کمرے میں داخل ہوا۔اس نے پہلے تو لطیف سے رسمی علیک سلیک کی اس کے بعد مجھے بڑے مصنوعی انداز سے خوش کن لہجے میں مبارکباد دی اور خوش آمدید کہا۔اس کے بعد اس نے سخت لہجے میں کہا کہ کھڑے ہو جاؤ۔لطیف نے کہا بھی کہ یہ میرا دوست ہے مگر اس نے لطیف کو بھی ڈانٹ کر کہا کہ ''چپ کرو''۔میں نے سن رکھا تھا کہ بڑی خراب حرکتیں کی جاتی ہیں اس لئے میں خوف سے کپکپانے لگا۔۔اسی وقت دو تین اور لڑکے بھی کمرے میں داخل ہو گئے۔پھر انہوں نے مجھے کونے میں کھڑا کر کے کہا قمیض اتارو۔میں اب اونچی آواز میں رونے اور گڑگڑانے لگا مگر انہوں نے کہا قمیض اتارو۔میں نے ڈرتے ڈرتے قمیض اتاری اور لڑکیوں کی طرح دونوں ہاتھ سینے پر باندھ لئے۔اس سے انہوں نے اور مزہ لیا اور قہقہے لگانے لگے۔پھر وہ مجھے ڈرانے کے لئے آپس میں اس بات پر بحث کرنے لگے کہ پتلون اتارنے کو کہیں، مرغا بنائیں یا سرخی پوڈر لگا کر پورے ہاسٹل میں ناچ کروائیں۔لطیف اس وقت تک بہت اپ سیٹ ہو گیا تھا وہ یہ سب کچھ نہ دیکھ سکا اور کمرے سے چلا گیا۔خوش قسمتی سے انہی لڑکوں میں سے کسی نے کہا بہت ہو گئی اس سے کہو ایک ٹھمکا لگائے اور ایک گانا سنائے۔تقریباً آنسوؤں سے روتے ہوئے میں نے ایک ٹھمکا لگایا اور انہیں ایک گانے کے دو بول سنائے۔بس اس کے بعد سب لڑکوں نے مجھے گلے لگا کر سچ مچ میں خوش آمدید کہا اور یہ کہہ کر کہ بھئی ہمارے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا تھا اور آئندہ سال تمہیں بھی یہی کرنے کا موقعہ ملے گا کمرے سے چلے گئے۔ یہ تھی کالج میں میری پہلی رات۔ دوسرے دن مجھے آٹھ بجے اناٹومی کے شعبہ میں جا کر رپورٹ کرنا تھی۔

...... پنجاب رنگ ......

''کُجھ تاں میرے پلے پاؤ''

بھاں بھاں کردے کمرے دا میں
کلّم کلاّ قیدی
لوکیں میرے بوہے کولوں
انھّی وادے بُلّیاں وانگ
چپ چپیتے لنگھ جاندے نیں
میں تکناں
پراوہ نئیں ویہندے
نئیں پُچھدے میتھوں
یار گوانڈی
کی حال اے تیرا
کچّے پکّے کمرے اندر
وانگ شُدائیاں
اُدریویں دی، کیوں بُکل مار کے رہناں
جے پچھو تے میں دسّاں
بھلیو لوکو
تہاڈے ای میتھوں، میں نمانا
ان گولی دے سب داڈ نگیا
اکلا بے یار دا اُو ہامل کے بیٹھاں
پر
ایہہ گھر چھڈ کے
میں جاواں کتھے
کیہدی ماں نوں ماسی آکھاں
کیہدا اُو ہاٹھوراں
کُجھ تاں مینوں دسّو
کجھ تاں میرے پلّے پاؤ

حنیف باوا (جھنگ)

''رنگوں بھری ممٹیاں''

لوہارخانہ

اقتدار جاوید
(لاہور)

خداوند
چُن اک جگہ
اور چُن
سارے شفاف باطن بھرے لوگ
اور
اُن کو لا
جن کا شفّاف باطن پھٹا،
جن کے شفاف باطن پہ
ٹانکے نہیں لگ سکے
اُن کے نزدیک آ
اُن کی آنکھوں کی پاتال میں
غرق ہو
موت
اور موت سی زندگانی کے مابین
واضح ذرا فرق ہو
جن کے گالوں پہ
اشکوں سے رستے بنے
اُن کے گالوں کو سہلا!

خداوند
لوہارخانہ ہے دنیا
نہ یوں سادِ آہن اڑا
اُن کی پلکوں پہ تاریک ہو
اُن کی نیندوں میں چھُپ
حزنیہ گیت بن
اُن کے ہونٹوں پہ آ
نرم رُو بادلوں کی طرح
اُن پہ جھک
ان کی باتوں کو سن
ان کی محفل میں رُک
ایک خوشبو میں ڈھل
ان کے رنگوں سے جُڑ
اُن کے رستوں پہ اُڑ
اور
دکھا
وہ جگہ
شہرِ آباد ہونا ہے
آخر، جہاں
شاہراہوں نے آ کے
افق تک نکلنا ہے
مٹی نے
گلیوں میں تبدیل ہونا ہے
ان کو وہ گلیاں دکھا
جن میں
بچوں نے پھرنا ہے
خاموش برآمدوں میں
جہاں
قہقہوں نے ابھرنا ہے
ان کو دکھا
وہ منڈیریں
جہاں
لڑکیوں نے دوپٹے سلھانے ہیں
جن کے لیے
دور دیسوں سے پیغام آنے ہیں
کسل نسل پرور نگر میں
ابد تک ٹھکانے ہیں
ان کو دکھا
اپنی عظمت بھرا،
اپنا پوشیدہ، خوابیدہ شہر
ان کی خاطر
جو آباد ہونا ہے
خوشبو اڑا
جو
اٹھاتی ہے ان سے خمیر اپنا
اور
خود کو خوشبو بناتی ہے
خود کو لٹاتی ہے!

رنگوں بھری ممٹیاں
تازہ رنگوں سے بھر
ان کو لقے کبوتر کے کرتب دکھا
اور
ان کو ہنسا
جس نے دنیا اٹھائی ہوئی ہے
تری
اس سحاب کو بچا!!

(ترجمہ)
سعید نقوی/شوکت فہمی
(نیویارک)

Clenched Soul

ہم نے آج بھی شام کی شفق کھودی ہے
کس نے دیکھا ہم کو ہاتھ میں ہاتھ دیئے
شب نے نیلی چادر تانی دنیا پر
میں نے اپنی کھڑکی سے یہ دیکھا ہے.
دور پہاڑ کی چوٹی پر کہیں ایک ضیافت جاری ہے،
اک رخصت ہوتے سورج کی
کبھی کبھی تو سورج کا اک ٹکڑا میرے ہاتھوں میں
سکے کی مانند جھلسا ہے
میری کرب میں ڈوبی روح نے جب، تمھیں یاد کیا
اک ایسے غم کے لمحے میں، جس سے بس تم ہی واقف ہو
تب کہاں تھیں تم ؟
تھیں کس کی ہمراہی میں؟
اور تخاطب کس سے تھا
پھر یہ چاہت مجھ میں یکدم کیسے جا گی
جبکہ میرے چاروں اور اداسی تھی
اور مجھے احساس بھی تھا، تم دور بہت ہو
شام ڈھلے جو ایک کہانی، جان بلب تھی، ختم ہوئی
میرا نیلا سویٹر ایسے دھرا ہے میرے قدموں پر
جیسے دھتکارا کتا ہو
شام سمے تم سدا ہی ایسے کھو جاتی ہو
جیسے شفق کی سرخی میں، سارے ہی سائے مٹ جاتے ہیں

Pablo Neruda

I Do Not Love You Except Because I Love You

میں تجھے چاہتا تو نہیں لیکن، کیوں کہ میں تجھے چاہتا ہوں
تیری چاہت و ناچاہت کے درمیاں پھر رہا ہوں
تیرے انتظار و غیر انتظار کے درمیاں
میرا دل گرم و سرد کے درمیاں پھر رہا ہے

میں تجھے اس لئے چاہتا ہوں کہ صرف، تو ہی تو ہے چاہت میری
بے پناہ ہے تیرے لئے میری نفرت،
اسی نفرت کے ساتھ، تجھ پہ مائل ہوں میں
یہ میرے بدلتے جذبوں کا ہے ثبوت
ا تجھے دیکھے بغیر، تیہری اندھی محبت میں گرفتار ہوں

ممکن ہے بے رحم جنوری کی کرن
کرلے گرفت دل کو میرے
چرا کے یہ میری کلید، سچی تسکین کو

کہانی کے اس موڑ پر، مرنا مجھے ہے
صرف مجھے، میں مروں گا محبت میں، کہ مجھ کو ہے صرف چاہت تری
مجھ کو ہے چاہت تری، آگ میں خون میں چاہت تیری

Pablo Neruda

Winter Depression

صدف مرزا
(کراچی)

ہوا کیوں بَین کرتی ہے؟
ہوا کیوں آج کل سوکھی سڑی سی ماتمی دُھن میں
بِرہ کے گیت گاتی ہے؟
میں ان ماتم کُناں بوڑھی ہواؤں کی
ذرا سی اشک شوئی میں
خود اپنے آپ سے جب بات کرتی ہوں تو لگتا ہے
کوئی مدِّ مقابل مجھ میں چھُپ کر بات سُنتا ہے
ہوائیں ماتمی دُھن میں ہمیشہ چلتی رہتی ہیں
کہ ان کے کان بہرے ہیں
انہیں فُرصت ہی کب ہے، میری تسکین و تسلّی کی!

اداسی کی رتوں کا بھی تو اک موسم ہی ہوتا ہے
گزر جائے گا یہ بھی روتا دھوتا منہ بسورے میرے مسکن سے
مجھے یہ آس ہے، کل اس زمیں کی گردشوں سے
رُت جو نکلے گی تو پھر سے آسماں کی آنکھ کے آنسو
کرن بن کے
کریں گے رقص برفیلی ہوا کے اجلے سینے پر
ہواؤں کی اپسرا پھر سُروں کا اک جہاں پازیب میں باندھے

خزاں دیدہ درختوں کے برہنہ بازوؤں کو
اک نیا ملبوس سے سرسبز کر دے گی
جو ہجرت کر گئے تھے
دور کے ملکوں کے سورج سے حرارت کی بقا لینے
وہ پنچھی لوٹ آئیں گے
بشاشت سے بھری شاخوں کی زلفوں میں
چمکتے شبنمی موتی پروئے گی
زمیں پر برف نے یلغار کر کے موت کی برّاق چادر سی بچھا دی ہے
اسے بھی مہرِ عالم تاب کی لپٹیں حرارت بخش جیون میں بدل دیں گی

مگر اس دل کی دنیا میں اداسی کی رُتیں ڈیرہ جمائے بیٹھی رہتی ہیں
یہاں برسوں گزر جاتے ہیں
پر یخ بستہ موسم کے شمالی قطب میں راتیں
برف سی ٹانگیں سکوڑے سوتی رہتی ہیں
یہاں پر برف ٹیلوں کا جہاں آباد کرتی ہے
کہیں سورج کی کرنوں کا گزر تک بھی نہیں ہوتا
یہاں بس ایک انہونی سی خاموشی میں لپٹی زندگی ہے
موت سے بدتر!
مسافر کی ہتھیلی پر سفر کی ہی لکیریں ہیں
کوئی منزل نہیں ہوتی
دلوں کی بستیوں میں موسموں کے آنے جانے سے
تغیّر کچھ نہیں ہوتا

مگر پھر بھی
ہوا کی اشک شوئی سے مجھے آرام ملتا ہے!

○

مارس

(مارس پر زندگی کے امکان پر اک تاثر)

جاوید زیدی
(امریکہ)

زمیں سے ہم
فضا میں
مارس تک پہنچے
تو یہ دیکھا
نئے ان آسمانوں میں
زمیں کا رنگ ملتا ہے
نئی اک زندگی کا
ڈھنگ ملتا ہے!
بہت نازاں تھے ہم
اپنی زمیں پر
قصّہ آدم تھا رنگیں
اور ہمیں حیران رکھتا تھا
سوال اب ہے زمیں پر
اُس سرزمیں پر بھی خدا کی
مخلوق رہتی تھی کبھی کیا
تو رنگ و نسل کیا تھے
دین و دنیا کے نئے عنوان کیا تھے
وہاں بھی پیغامبر پیغام لائے تھے
تو وہ پیغام کیا تھے
کتابیں کن زبانوں میں اترتی تھیں
روح و بدن کے کیا قواعد تھے
رواج و رسمِ دنیا کے کیا فوائد تھے
زندگی کے کیا حقائق تھے
وہاں بھی کیا ''تصوف کے مسائل'' تھے
وہاں بھی حور و کوثر کے
فضائل تھے
کیا ادبی رسائل تھے؟!
ابھی ہم ایک دیہا سے
نمٹ پائے نہ تھے
کہ دوسری دنیا کا
اک امکان
دستک دے رہا ہے
فکر و رسا کے اِک
نئے در پر
خدا بس خیر رکھے
اپنے عقیدوں اور
وسیلوں پر!

○

طُرفہ ہے رُتبہ نئے سال کا

کرشن گوتم
(چندی گڑھ، بھارت)

سُنیں سب یہ قصّہ نئے سال کا
کہ ہے یہ عجوبہ نئے سال کا
یہ ہر سُو ہے چرچا نئے سال کا
کہ طُرفہ ہے رتبہ نئے سال کا
برس تیرھواں ہے صدی کا کہ یہ
عجب ہے یہ تحفہ نئے سال کا
سبھی ہے ترا تو یہ تیرہ کا سال
کرم کا ہو وعدہ نئے سال کا
صدی میں سبھی کیلئے اے خدا
یہ وقفہ ہو عمدہ نئے سال کا
محبت، اخوت سلامت روی
یہ سب کا ہو ورثہ نئے سال کا
ہو امن و اماں کا برس تیرھواں
یہی ہو فریضہ نئے سال کا
سبھی عقل والے نہیں ہوشیار
نہ چھوٹے شگوفہ نئے سال کا
سیاست غریبوں کی باندی بنے
ہو طُرفہ طریقہ نئے سال کا
اگر خوف ہو تو ہو قانون کا
ملے تو یہ عطیہ نئے سال کا
جو جمہوریت میں ہیں آزادیاں
نہیں وہ سلیقہ نئے سال کا
مبارک نہیں ہیں حقوق آپکے
بنیں گر تماشا نئے سال کا
لگن گر ہو سچّی تو بگڑی بنے
نہیں کم یہ عرصہ نئے سال کا
دُعا ہے یہی کرشن گوتم کی آج
ملے سب کو تحفہ نئے سال کا

سانجھا درد

طالب زیدی
(میرٹھ، بھارت)

جب تلک بات بنے بات بنائی جائے
مِشعلِ امن بحر طور جلائی جائے
سرحدِ ضبط پہ یلغار بہت ہے لیکن
شاخِ زیتون نہ ہاتھوں سے گرائی جائے
مدتوں بعد نئے موڑ پہ آئے ہیں ہم
راہِ پُرخار کو ہموار کیا ہے ہم نے
مدتوں بعد ملاقات کا اک خوابِ گراں
اپنی تعبیر کا، انجام کا شیدائی ہے
اہلِ دل کی ابھی مٹی سے شناسائی ہے
کشتِ ماضی پہ امیدوں کی گھٹا چھائی ہے
ابھی رشتوں میں حرارت ہے، لہو بولتا ہے
گنگ و راوی کو ملاقات کا موقع دے دو

مشترک درد کی میراث ابھی باقی ہے
ایک ہو سکتے ہیں ہم، آس ابھی باقی ہے

○

پہلی برف باری کے بعد

عظمیٰ صدیقی
(لندن)

فروری کی رات تھی
رات کی سیاہی میں
برف کا اجالا تھا
چاروں اُور اجالے نے
چاندنی بچھادی تھی
برف کے وہ گالے تھے
یا سفید تتلیاں
جو جگنوؤں کو ڈھونڈنے
نکل پڑی ہوں رات میں
وادی کے پیڑوں نے بھی
برف کے زیوروں سے
یوں سنگھار کرلیا تھا
جیسے کوئی مغربی
دلہن سجی سجی سی ہو
پہلی برف باری کے
اس حسیں نظارے کو
ہم نے اور تم نے جب
ساتھ ساتھ دیکھا تھا

تم نے میرے شانوں پر
اپنا کوٹ ڈال کر
پیار سے کہا تھا جب
زندگی کی برف میں
الاؤ ہمارے پیار کا
کبھی نہیں بجھے گا اب
فروری کی رات ہے
رات کی سیاہی میں
برف کا اجالا ہے
فرق صرف اتنا ہے
الاؤ ہمارے پیار کا
سرد کب کا ہو چکا
جگنوؤں کو ڈھونڈنے میں
تتلیاں بھی کھو گئیں
آج برف منظروں کا
تم بھی ایک حصّہ ہو
میں بھی ایک حصّہ ہوں

○

لمحہ بہ لمحہ، پل بہ پل

غالب عرفان (کراچی)

زلفِ ریشم کے سُنہری تار لہراتے ہوئے
خامشی میں چوڑیوں کی کھنکھناہٹ برمحل
بھیگی بھیگی سی فضا میں خوشبوئیں مہکی ہوئیں
پھر خرامِ ناز میں رُخ پر وقارِ بے بدل
آنکھ بلّوری، افق میں دور تک اُٹھتی ہوئی
دیکھنے کو آسماں لمحہ بہ لمحہ، پل بہ پل
جسم کا ہر زاویہ ملبوس سے اُلجھا ہوا
اُس پہ شانوں سے پھسلتا یہ ترا آنچل یہ بل
کچھ ہواؤں کی شرارت پر نہیں ہے منحصر
کچھ تری فطرت ہی باغی ہو چلی ہے آج کل

○

وہ آواز اِک

رب نواز مائل (کوئٹہ)

گو نہ ہوتا ہو یُوں روز ہی
بس کبھی
یا دنوں ہفتوں میں ہوتا ہو
جب وہ آواز اِک
چُپ سے ہی چُپ کی آواز اِک
جانے کس اور سے
آتی ہے کانوں میں اس طرح
جیسے چُپ نے ہو منہ، اپنا اُس پر رکھا
سو سُنوں اور کیا
اور پھر دیکھوں بھی تو یہ میں اور کیا
گم ہزاروں طرح ہو کے اُس ایک ہی
خوش سی آواز میں

○

ہائیکو

انوار فیروز
(راولپنڈی)

نکلا اُجلا دن
اب لوگوں پر تیرا ظلم
ہو گا ناممکن

یہ جو دولت والے ہیں
مُلک کو لوٹ کے ہوئے امیر
دل کے کالے ہیں

کتنے ہیں نادان
بھائی کا یہ خون پئیں
کہنے کو انسان

یہ مقتل ہیں
وحشی چیتے پھرتے ہیں
شہر بنے یہ جنگل ہیں

بھاگ یہاں سے بھاگ
انسانوں کے بھیس میں ہر سو
شوک رہے ہیں ناگ

○

''کیلنڈر''

شگفتہ نازلی
(لاہور)

مِرے دُکھ سُکھ کا ساتھی ہے۔۔۔
مِرے کمرے کا کیلنڈر۔۔۔
کہ اس کی کتنی تاریخیں۔۔۔
لکیروں، دائروں کے سنگ۔۔۔
کبھی آنسو رُلاتی ہیں۔۔۔
کبھی مجھ کو ہنساتی ہیں۔۔۔
اور یوں سالِ رواں کی۔۔۔
ایک مالا کو پروتی ہیں۔۔۔
جو انمِٹ نقش رکھتی ہے۔۔۔
خزاؤں اور بہاروں کا۔۔۔
وہ جس کے بن لگیں۔۔۔
شام و سحر بھی نامکمل سے۔۔۔
اُسے کہتے ہوئے میں الوداع۔۔۔
رنجیدہ خاطر ہوں۔۔۔!
مگر وہ اجنبی بن کے۔۔۔
ہوا جاتا ہے یوں رخصت۔۔۔
کہ جیسے جانتے نہ ہوں۔۔۔
مرے دُکھ سُکھ کا ساتھی تھا۔۔۔
مرے کمرے کا کیلنڈر۔۔۔!

○

ہوس

جہانگیر اشرف
(برمنگھم)

یہ دُنیا بھی کیا دُنیا ہے
یہاں ہوس کے سوا کیا ہے
کوئی طالب
جاہ و حشمت کا
کوئی دولت کا
کوئی منصب کا
حُسن کا پرستار کوئی
شہرت کا طلبگار کوئی
یہاں ہر سو یہی اندھیرا ہے
ہر دل میں ہوس کا ڈیرا ہے
ہوس ایسا جذبہ ہے
جو گھٹتا نہیں
صرف بڑھتا ہے
شاید کہ
موت ہی اس مرض کی
دوا ہے

○

عالمی اردو مرثیہ کانفرنس

بلاشبہ اردو زبان وادب ترقی پذیری کے زمرے میں شمار ہوتے ہیں مگر کچھ اصناف اور شخصیات اس طرح کی حد بندی سے بغاوت کرتے ہوئے کامیابی وکامرانی کے وہ منازل ومراتب طے کر چکے ہیں جن پر ترقی یافتہ زبانیں اور ادب بھی رشک ہی کر سکتے ہیں۔ یوں تو ڈاکٹر سید تقی عابدی تن تنہا ایک ادارہ کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔ آپ نے شعروادب کے علاوہ تحقیق وتنقید کے باب میں اس قدر کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں کہ شخصیات تو کجا بہت سے ادارے بھی آپ کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتے۔ گذشتہ دنوں عالمی مرثیہ کانفرنس کا انعقاد ڈاکٹر تقی عابدی کی مساعیِ جمیلہ کی روشن مثال ہے۔ اس تین روزہ عظیم الشان کانفرنس کی نسبت فرد واحد کے تاثرات کانفرنس اور اعلیٰ حیثیت ومرتبہ کے حامل شرکا سے سراسر ناانصافی ہوگی۔ ذیل میں ہم نے کوشش کی ہے کہ کانفرنس کا آنکھوں دیکھا حال اور شرکائے محفل کے رشحات قلب وقلم سے آپ کا تعارف مکمل اور مفصل طور پر کرایا جائے تاکہ آپ ''مرثیہ'' جیسی عظیم صنفِ ادب اور اُس کے حوالے سے ہونے والی پیش رفت سے کُلّی طور پر آگاہی حاصل کر سکیں۔

راشد جمال (دہلی، بھارت)

انجمن ترقی اردو دہلی کے زیر اہتمام غالب انسٹی ٹیوٹ اور نیشنل کونسل برائے فروغ اردو کے تعاون سے ایک تین روزہ عالمی اردو مرثیہ کانفرنس غالب آڈیٹوریم ایوانِ غالب نئی دہلی میں عظیم الشان طریقے پر ۲۸، ۲۹ اور ۳۰ دسمبر ۲۰۱۲ء کو منعقد کی گئی۔ کانفرنس کا افتتاحی اجلاس ۲۸ دسمبر شام ۶ بجے برگزار ہوا جس کا افتتاح عزت مآب جناب محمد حامد انصاری نائب صدر جمہوریہ ہند نے کیا۔ اس جلسہ کی صدارت پروفیسر گوپی چند نارنگ نے کی۔ پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے استقبالیہ کلمات پیش کیے۔ ڈاکٹر سید تقی عابدی نے کلیدی خطبہ دیا۔ نائب صدر جمہوریہ ہند محمد حامد انصاری نے کہا کہ مرثیہ ہماری نایاب میراث ہے۔ عدم تشدد جو آج ایک اہم فلسفہ اور صلح وامن کا اہم ذریعہ سمجھا جاتا ہے وہ حسینؑ ابن علی کے کردار سے نمایاں ہے۔ شبلی نعمانی کے موازنہ انیس ودبیر کی حکایت کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے بتایا کہ مرثیہ بغیر قلبی لگاؤ کے نہ لکھا جا سکتا ہے اور نہ سنا جا سکتا ہے۔ اردو مرثیہ اور شاعری کی اہم صنف سخن ہی نہیں بلکہ اس کے پیغام سے یہ درس بھی حاصل ہوتا ہے کہ اگر حق ساتھ ہو تو عدم تشدد سے نبرد آزما ہوا جا سکتا ہے۔ نائب صدر جمہوریہ ہند نے کہا کہ رثائی ادب نے اردو کی ترقی میں اہم رول ادا کیا ہے اور اردو مرثیہ نے امام حسینؑ کے امن کے پیغام کی تشہیر کی ہے۔

پروفیسر صدیق الرحمان قدوائی نے اپنے استقبالیہ کلمات میں عالمی مرثیہ کانفرنس کا خیر مقدم کرتے ہوئے بتلایا کہ بڑی طویل مدت کے بعد یہ عمدہ مرثیہ کانفرنس غالب انسٹی ٹیوٹ کے تعاون سے برگزار ہو رہی ہے۔ انہوں نے کہا کہ مرثیہ ایک عظیم ادبی اور ثقافتی روایت ہے، مرثیہ اردو ادب کی قدروں کا خزانہ ہے جس سے ہمارے قومی کلچر کو فروغ ہوتا ہے۔ کینیڈا سے آئے ہوئے نامور محقق نقاد اور شاعر ڈاکٹر تقی عابدی نے مرثیہ پر کلیدی خطبہ دیا جسے سراہا گیا۔ ڈاکٹر عابدی نے اردو مرثیہ کی تاریخ اور اس کا مقام تعین کرتے ہوئے بتایا کہ اردو شاعری کا تقریباً ایک تہائی حصہ اسی صنف سخن میں ہے۔ قدیم اردو کی پہلی منظوم کتاب نوسرہار بھی واقعہ کربلا کا منظوم کلام ہے۔ مرثیہ صرف امام باڑوں تک محدود نہ ہونا چاہیے اس کو مدرسوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے نصاب میں رکھ کر اس کی ادبی اور اخلاقی اقدار سے زبان اور سماج کو ترقی دی جا سکتی ہے۔ مرثیہ حسن یوسف ہے اس کو بازار مصر ہی نہیں بلکہ بازار جہاں میں پیش ہونا چاہیے۔ شاید اسی لیے مولانا ابوالکلام آزاد نے کہا تھا ''اردو ادب کی جانب سے غالب کی غزلیں اور انیسؔ کے مرثیے دنیائے ادب کو تحفہ میں پیش کیے جا سکتے ہیں۔'' اردو مرثیہ دراصل انیسؔ اور دبیرؔ کے کلام کا دوسرا نام ہے۔ ڈاکٹر عابدی نے بتایا کہ بین اگرچہ مرثیہ کا ضروری اور لازمی جزو ہے لیکن اس کے متن میں آزادی حریت عزت نفس اور احترام حقوق بشر کا پرچار ہے۔ آج ہم کو مرثیہ کی ضرورت ہے اس کے افکار مطالب ضابطہ اخلاق اس کی خوش عہدی خوش کرداری کی ضرورت ہے جو اس کے اعلیٰ کرداروں میں پائی جاتی ہے۔ انیسؔ اور دبیرؔ نے اخلاقی اقدار کو جو عالم گیر اور آفاقی نوعیت کی تھیں اور اس زمانے کا معاشرہ جن سے بے بہرہ تھا عوام کے صرف ذہن نشین ہی نہیں کیا بلکہ اپنے فن کے کمال سے عملی کرنے کی بھی کوششیں کیں۔ ڈاکٹر عابدی نے مزید کہا کہ مرثیہ کسی خاص فرقہ کی جاگیر نہیں مرثیہ سے روگردانی اردو ادب سے منہ موڑنے کے معنی ہیں۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابق وائس چانسلر سید شاہد مہدی نے کہا کہ میر انیسؔ اور مرزا دبیر نے مرثیوں کے ذریعے ہندوستانی تہذیب وثقافت کو اخلاقی اور آزادی قدروں کو اجاگر کیا ہے اور واقعۂ کربلا کی برگزیدہ شخصیتوں کو ہمارے کلچر میں قابل تقلید بنا دیا ہے۔ واقعۂ کربلا اردو ادب کا استعارہ ہے جو حق کی حمایت اور ظلم وجور کی مخالفت بن کر رہ گیا ہے۔ مہمانِ ذی وقار سابق گورنر جھارکھنڈ جناب سید سبط رضی صاحب نے اردو مرثیہ کی وسعت اس کی گیرائی اور گہرائی پر گفتگو کی۔ انہوں نے کہا کہ اردو کو جو بین الاقوامی مقام حاصل ہوا وہ صرف مرثیہ کی بدولت تھا۔ اردو مرثیہ سے عدم دلچسپی اور اس کے ساتھ عدم تعاون کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے بتایا کہ برصغیر میں رثائی ادب اب ایک ایسے دریا کے

مانند ہے جس کا روز بروز پانی کم ہوتا جارہا ہے جو اردو ادب کی کشت اور آبیاری کے لیے تشویش کا باعث ہے۔ افتتاحی اجلاس کے صدر پروفیسر گوپی چند نارنگ نے کہا کہ مرثیہ اردو شاعری کی اہم صنف سخن ہی نہیں بلکہ اردو مرثیہ ہماری تہذیبی اور ثقافتی قدروں کا نقیب بھی ہے۔ اردو مرثیہ کی ترویج اور تشہیر دراصل اردو ادب کی ہی خدمت ہے۔ اردو مرثیوں میں ہندوستانی سماج اور یہاں کے کلچر کے نقوش نے اسے ایک غیر فانی صنف بنادیا۔ کربلا اب صرف مرثیوں کی روایات یا حکایات تک محدود نہ رہا بلکہ یہ اردو ادب اور شاعری میں ظلم و جور کے خلاف امن اور حریت کا استعارہ بن گیا۔ آخیر میں شاہد ماہلی نے جو غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائریکٹر بھی ہیں اس پروگرام کے نکات پر روشنی ڈالتے ہوئے مہمانان اور حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ اس افتتاحی اجلاس کی نظامت ڈاکٹر رضا حیدر نے کی جنہوں نے مہمانوں کے تعارف کے ساتھ ساتھ مرثیہ کانفرنس سے مربوط عمدہ اردو مرثیہ کے اشعار بھی سنا کر محفل میں چار چاند لگادے۔ اس اجلاس کے اختتام پر دلّی کے مشہور استاد اقبال احمد خان نے اپنے مخصوص انداز میں سوز خوانی اور سلام خوانی کی پھر چیئرمین وقف بورڈ بہار جناب محسن علی معصومی نے تحت اللفظ میں خاص دلکش اور پرتاثر انداز میں مرثیہ خوانی کی۔

جلسے میں بڑی تعداد میں سامعین موجود تھے۔ جلسے میں شامل افراد میں پروفیسر آزردہ زماں، پروفیسر انیس اشفاق، پروفیسر عتیق اللہ، پروفیسر شمیم حنفی، پروفیسر علی احمد فاطمی، پروفیسر آزرمی دخت، پروفیسر وہاج الدین علوی، پروفیسر شریف حسین قاسمی، پروفیسر عراق رضا زیدی، پنڈت گلزار دہلوی، ڈاکٹر خالد علوی، پروفیسر ابن کنول، مہتاب نقوی، ڈاکٹر فاضل ہاشمی، پروفیسر محمد رضا مولوی، پروفیسر ناشر نقوی، ڈاکٹر حسن مثنیٰ، ڈاکٹر عابد حسین حیدری، ڈاکٹر شجاعت علی، ڈاکٹر نگینہ جبین، ڈاکٹر عظیم امروہوی، ڈاکٹر دھرمیندر ناتھ، احسن ہاشمی، اشفاق عارفی، محمد محسن نقوی، علیم الدین اسعدی، سلیم امروہوی، خصال مہدی، ممتاز عالم، ڈاکٹر علی جاوید اور اقبال مرزا شامل تھے۔

دوسرے دن بروز ہفتہ ۲۹ر دسمبر ۲۰۱۲ء ٹھیک سوا دس بجے صبح پہلے اجلاس کا آغاز ہوا۔ اس اجلاس کی صدارت ادارہ تحقیقات فارسی علی گڑھ کی ڈائریکٹر پروفیسر آزرمی دخت صفوی نے کی۔ مہمان خصوصی ڈاکٹر سید تقی عابدی تھے۔ ڈاکٹر حسن مثنیٰ نے نظامت کی۔ اس اجلاس میں تین مقالے پڑھے گئے۔ پہلا مقالہ ڈاکٹر مولا بخش نے پیش کیا جس میں انیسؔ کے مرثیوں کا مطالعہ ماحولیاتی تنقید کے تحت کیا گیا۔ دوسرا مقالہ الٰہ آباد یونیورسٹی کے ڈائریکٹر فاضل ہاشمی نے مرثیہ اور ادب عالیہ کے زیر عنوان انیسؔ کی شعریات میں اخلاقیات، سماجیات اور جمالیات کی نمائندگی کو پیش کیا۔ تیسرا مقالہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے فارسی پروفیسر عراق رضا زیدی کا تھا جو بہت پسند کیا گیا۔ انہوں نے کلام دبیرؔ میں علم نجوم کی اصطلاحات اور علم نجوم کے عمل دخل پر پُر مغز گفتگو کی۔ مہمان خصوصی ڈاکٹر تقی عابدی نے تینوں مقالوں پر اجمالی گفتگو کی اور آخیر میں پروفیسر آزرمی دخت نے مقالوں پر گفتگو کر کے مرثیہ کے عصر حاضر کے مسائل پر بھی گفتگو کی۔

اس اجلاس کے فوری بعد دوسرے اجلاس کا آغاز ہوا جس کی صدارت کینیڈا سے آئے ہوئے محقق و نقاد اور شاعر ڈاکٹر تقی عابدی نے کی اور ڈاکٹر اقبال مرزا مہمان خصوصی رہے۔ اس اجلاس میں چار مقالے پڑھے گئے۔ اس اجلاس کی رپورٹنگ کرتے ہوئے روزنامہ انقلاب کے معروف رپورٹر خصال مہدی نے لکھا۔

عالمی اردو مرثیہ کانفرنس کے دوسرے دن الہ آباد یونیورسٹی میں شعبہ اردو کے پروفیسر علی احمد فاطمی نے ''مرثیہ کی جمالیات'' کے موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ بڑی شاعری روایتی تصورات کو بدل دیتی ہے اور مرثیہ اس لئے بڑی شاعری ہے کیونکہ مرثیہ نے ادب یا شاعری میں پائے جانے والے روایتی تصورات کو بدل دیا۔ انہوں نے کہا کہ انیسؔ کا دبستان حرکت و عمل سے پیدا ہوتا ہے، شجاعت و قربانی دنیا کے بڑے موضوع تھے اور ہیں۔ کربلا زندگی سے عبارت، آگہی سے عبارت ہے، اقدار و ایثار سے عبارت ہے، مرثیہ لسانی جمالیات سے زیادہ انسانی جمالیات سے تعلق رکھتا ہے، گریہ کی قدر و قیمت کے تعلق سے پروفیسر فاطمی نے کہا کہ گریہ پیدائش سے لے کر موت تک راہ نجات ہے۔ انہوں نے کہا کہ مرثیہ میں انسان ہی نہیں انسانی معاشرہ کی جمالیات دکھائی دیتی ہے۔ رامپور رضا لائبریری کے ڈائریکٹر پروفیسر سید محمد عزیز الدین حسین نے کہا کہ مرثیہ کو ہندوستان کی زمین بڑی راس آئی جو شاہکار اردو مرثیہ کی شکل میں سامنے آئے اس کی مثال دنیا کی مانی ہوئی زبانوں عربی، فارسی، سنسکرت، ہندی اور انگریزی میں نہیں ملتی۔ عجیب بات ہے کہ جو خراج عقیدت اردو مرثیہ نے امام حسینؑ کو ہندوستان میں پیش کیا وہ عالم اسلام میں بولی جانے والی زبانیں عربی، فارسی، ترکی اور دری وغیرہ بھی نہ پیش کر سکیں۔ پروفیسر عزیز نے کہا کہ ہندوستان میں واقعہ کربلا اور اردو مرثیہ اس قدر توجہ کا مرکز بنا کہ ہندو دانشور اور شعرا جن کی اپنی تاریخ میں کربلا جیسا واقعہ تھا ہی نہیں انہوں نے اس واقعہ سے متاثر ہو کر سینکڑوں مرثیے کہے۔ عزیز الدین حسین نے استاد قمر جلالوی کی فن مرثیہ گوئی پر بھی تفصیلی گفتگو کی۔ پٹیالہ یونیورسٹی کے پروفیسر ناشر نقوی نے اردو مرثیہ معنویت، روایت اور روہیل کھنڈ، کے عنوان سے اپنا مقالہ پڑھتے ہوئے کہا کہ کسی برگزیدہ شخصیت کے وصال کے بعد اس کے صالح اور قابل تقلید کردار اور پیغام کی منظوم تشہیر و تبلیغ کو مرثیہ کہتے ہیں۔ اس کے علاوہ پروفیسر عتیق اللہ نے انیسؔ اور شعری روایات اور ڈاکٹر خالد علوی نے بھی اپنے مقالے میں شبلی کی تنقید پر اعتراض کیا۔

صدارتی خطبہ میں ڈاکٹر تقی عابدی نے مقالہ نگاروں کے مقالوں پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ مرثیہ کے تنقیدی میدان میں بھی ادبی دہشت گردی پائی جاتی ہے۔ انہوں نے کہا کہ میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ کے کلام کے تقابل کے چکر میں بہت سے لوگوں نے ادبی دہشت پھیلائی ہے وہ اس طرح کہ شعر کسی شاعر کا

کسی اور شاعر سے منصوب کر دیا۔ انہوں نے کہا کہ مرثیہ کسی فرقہ کی جائداد نہیں ہے۔ مرثیہ جمالیات کا پورا مرقعہ ہے مراثی اردو کی فرہنگ ہیں اور میر انیسؔ محاوروں کے شہنشاہ ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے مرثیہ کی موجودہ صورت حال کے علاوہ میر انیسؔ، مرزا دبیرؔ اور بیسویں صدی کے مرثیہ نگاروں کی مرثیہ نگاری کا تنقیدی جائزہ پیش کیا۔ تیسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر عتیق اللہ نے کی اور مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے رضا لائبریری کے ڈائریکٹر پروفیسر عزیز الدین موجود تھے۔ ڈاکٹر تبسم صابر، ڈاکٹر کوثر مظہری، ڈاکٹر مہتاب حیدر نقوی، پروفیسر ابن کنول اور پروفیسر محمد رضا موسوی نے مقالات پیش کئے۔ نظامت عابد حسین حیدری نے کی۔ ڈاکٹر کوثر مظہری نے ڈاکٹر عابدی کی شاہکار تصنیف ''تجزیہ یادگار مرثیہ'' جب قطع کی مسافت شب آفتاب نے پر ایک تنقیدی اور تحلیلی مقالہ پیش کیا۔

چوتھے اجلاس کی صدارت پروفیسر زماں آزردہ نے کی اور مہمان خصوصی کی حیثیت سے پروفیسر آزرمی دخت صفوی موجود تھیں۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر سید شجاعت علی نے انجام دیئے۔ اس اجلاس میں محترمہ سفینہ بیگم، ڈاکٹر سہیل انور، ڈاکٹر حسن مثنیٰ، ڈاکٹر عظیم امروہوی اور ڈاکٹر حسن عباس نے مقالات پیش کیے۔ کانفرنس کے کنوینر ڈاکٹر رضا حیدر نے اعلان کیا کہ بہت جلد ہی تمام مقالات کتابی شکل میں منظر عام پر لائے جائیں گے۔ چائے کے مختصر سے وقفے کے بعد سلام، سوز خوانی اور تحت اللفظ مرثیہ خوانی کا دور شروع ہوا۔ سوز خوانی کے بعد جناب متین امروہوی، ڈاکٹر تاجدار حسین زیدی، معین شاداب، کوثر زیدی کیرانوی اور سلیم امروہوی نے سلام سنائے۔ پھر سید محسن علی معصومی نے اپنے مخصوص انداز میں مرثیے کے کچھ بند پیش کئے جنہیں پسند کیا گیا۔ آخیر میں سابق گورنر جھارکھنڈ سید سبط رضی صاحب نے تحت اللفظ میں مرثیہ پڑھا جسے عمدہ پڑھت میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ اس مرثیہ خوانی کو پسند اور سراہا گیا۔ ایک اچھی تعداد رات گئے مجلس مرثیہ میں موجود رہی۔ مرثیہ کانفرنس کے تیسرے اور آخری روز بروز اتوار ٹھیک ساڑھے دس بجے پانچواں اجلاس شروع ہوا جس کی صدارت ڈاکٹر تقی عابدی نے کی اور مہمان خصوصی کی حیثیت سے پروفیسر زماں آزردہ موجود تھے۔ اس اجلاس کی نظامت کے فرائض ممتاز عالم نے انجام دی۔ ڈاکٹر ممتاز عالم نے استقبالیہ کلمات میں گزشتہ کی گفتگو اور پُر مغز حقائق کے بارے میں دلچسپ گفتگو کر کے یہ بتایا کہ ان حقائق کو صرف کانفرنسوں کے کمروں میں قید رکھنا نہیں چاہیے بلکہ عوام تک پہنچانا ضروری ہے۔ انہوں نے تقی عابدی کے بیان کی تائید میں کہا کہ سو سال قبل اردو ترقی بورڈ بنایا گیا اور اب اردو تحفظ بورڈ کی ضرورت لاحق ہے اور مرثیہ سے غفلت بھی اس زوال میں شامل ہے انہوں نے مزید کہا کہ مرثیہ کو اس کا صحیح مقام دینا اردو ادب کے ساتھ انصاف کرنا ہے۔

پہلا مقالہ ڈاکٹر نگینہ جبین کا تھا جنہوں نے مرثیہ کے تدریسی مسائل پر گفتگو کی۔ ڈاکٹر عابد حسین حیدری، ڈاکٹر شجات علی اور ڈاکٹر علی جاوید نے بھی مقالات پیش کیے۔ خصوصاً ڈاکٹر علی جاوید نے اس بات پر زور دیا کہ ہم جدید مسائل کے تناظر میں بھی مرثیہ کو دیکھ سکتے ہیں۔ نظامت ڈاکٹر ممتاز عالم نے کی۔ دوسرے اجلاس کی صدارت غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائریکٹر شاہد ماہلی نے کی اور لندن سے تشریف لائے ماہنامہ صدا کے ایڈیٹر اقبال مرزا مہمان خصوصی کے طور پر موجود تھے۔ پروفیسر انیسؔ اشفاق، پروفیسر آزرمی دخت صفوی، پروفیسر زماں آزردہ اور ڈاکٹر تقی عابدی نے مقالات پیش کیے۔ تمام مقالات عالمانہ اور پُر مغز تھے۔ خصوصاً ڈاکٹر تقی عابدی نے انیسؔ کی جذبات نگاری پر عمدہ مقالہ پڑھا اور ان غیر مطبوعاتی مراثی پر بھی گفتگو کی جو اب تک چھپ نہیں سکے اور وہ اردو ادب میں شاہکار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انہوں نے مزید کہا کہ اردو ادب کی یہی صنف ہے جس میں انسانیت، اخوت، حریت، بھائی چارگی، محبت اور بین الملکی کا تصور بڑی خوبصورتی کے ساتھ موجود ہے۔ نظامت ڈاکٹر عظیم امروہوی نے کی۔

تیسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر انیس اشفاق نے کی اور مہمان خصوصی کی حیثیت سے ڈاکٹر عظیم امروہوی موجود تھے۔ ڈاکٹر رضا حیدر، ڈاکٹر اشفاق عارفی، ڈاکٹر اقبال مرزا اور پروفیسر وہاج الدین علوی نے مقالات پیش کئے۔ نظامت پروفیسر ناشر نقوی نے کی۔ اختتامی اجلاس کی صدارت پروفیسر اختر الواسع نے کی اور ڈاکٹر تقی عابدی، پروفیسر انیس اشفاق اور جناب شاہد ماہلی نے تینوں دن کے سیمینار پر سیر حاصل گفتگو کی۔ نظامت ڈاکٹر رضا حیدر نے کی۔ ملک میں اپنی نوعیت کے اس پہلے سیمینار میں چالیس سے زائد اسکالر نے مرثیہ کی ہر جہت پر اپنے قیمتی مقالات پیش کیے اور سیمینار کی کامیابی پر شاہد ماہلی اور ڈاکٹر رضا حیدر کو مبارک باد پیش کی۔ شب میں بزم سوز خوانی، سلام اور مرثیہ خوانی کے تحت غلام سجاد نے سوز خوانی کی۔ شعرا کرام نے سلام پیش کیا۔

جن میں گلزار دہلوی، عظیم امروہوی، دھریندر ناتھ، مہدی رضا اور خصال مہدی شامل تھے۔ معروف مرثیہ خواں ڈاکٹر ارشاد حسن معصومی نے میر انیسؔ کا خاص مرثیہ اپنے مخصوص انداز میں پڑھا جسے تحسین و آفرین کے نعروں سے سراہا گیا۔ وائس چیئر مین آئی سی سی آر جناب شاہد مہدی نے میر انیسؔ کا شاہکار مرثیہ پڑھ کر سامعین کو محظوظ کیا۔ موصوف کا تحت اللفظ مرثیہ کا انداز بیان منفرد اور موثر ہے۔ اس کانفرنس میں ڈاکٹر تقی عابدی کی جدید تصنیف و تالیف رباعیات انیسؔ اسکالرس اور ادیبوں کو تحفہ میں پیش کی گئی۔ حسنین امروہوی کے مطبوعہ مراثی حسن علم کا اجرا عمل میں آیا۔ کانفرنس کے پہلے دن مرثیوں کی کتابوں کی نمائش بھی کی گئی۔ کانفرنس میں روزنامہ انقلاب کے مدیر اعلیٰ شکیل شمی اور روزنامہ سہارا کے مدیر اعلیٰ اسد رضا بھی شامل تھے۔ چوتھی دنیا کی مدیرہ وسیم راشد، صحافت کے ایڈیٹر کے علاوہ ڈاکٹر ادریس احمد، فاروق ارگلی، ایم رحمان سمیت دوسری علمی، ادبی، سماجی اور ثقافتی شخصیات بھی موجود تھیں۔

''ہم زباں چُپ ہو گئے''

نند کشور وکرم
(دہلی، بھارت)

ممتاز و نامور نقاد، دانشور اور فکشن نگار دیویندر اِسر کچھ مدت سے شدید علیل تھے اور گھر پر اُن کی اچھی طرح دیکھ بھال نہیں ہو رہی تھی۔ اور جو بھی ان سے ملنے جاتا تھا وہ اُن کی ناگفتہ بہ حالت کو دیکھ آہ بھر کر رہ جاتا تھا مگر کر کچھ نہیں سکتا تھا۔ ہاں سوچتا ضرور تھا کہ ان کے لئے کچھ کیا جائے۔ اسی دوران ۲۷ر دسمبر ۲۰۱۱ء کو اُن کے ایک ہمدرد و پرستار ہمانشو شرما سے اُن کی بے بسی اور لاچاری دیکھی نہ گئی اور نیٹ ورک پر اُنہوں نے اسر صاحب کے رشتہ داروں دوستوں اور پڑوسیوں سے اپیل کی کہ وہ اُن کی مدد کریں۔ انہوں نے بڑے دُکھ اور افسوس کے ساتھ تحریر کیا تھا کہ:

''One of the eminent award winning-writer Devendra Issar, 84,is looking for help from the society at large after apathetic attitude of his sons rendered him to a stinky corner of his house in Janakpuri.

اس کے بعد ہمانشو شرما نے اِسر صاحب کی اُردو اور ہندی میں کی گئی گراں قدر خدمات کا تفصیل سے ذکر کرتے ہوئے آخر میں لکھا تھا کہ:

''....Unfortunately ,he is not receiving due care from his sons.He has been kept in the servant room of the backyard of his house which he built with his own hard-earned money.He is now looking for help of his neighbours ,friends,well-wishers and society at large.

اِسر صاحب کی اس ناگفتہ بہ حالت سے ان کے سبھی جانکار اور احباب اچھی طرح واقف تھے اور ان کی نجی زندگی کے بارے میں بھی بہت کچھ جانتے تھے کہ وہ اپنی بیوی سے طلاق کے بعد اپنے کئی کمروں پر مشتمل لگ بھگ دو سو گز مکان میں صرف ایک چھوٹی سی کوٹھری میں تنہائی اور بے بسی کے عالم میں زندگی بسر کر رہے ہیں اور بقیہ سارے مکان پر ان کے بیٹوں کا قبضہ ہے جو ہر آنے جانے والے پر کڑی نگاہ رکھتے ہیں۔ گو اِسر صاحب نے اپنی پریشانی اور لاچاری کے بارے میں سوائے چند قریبی دوستوں کے کسی سے کبھی ذکر نہیں کیا تھا تاہم اس بارے میں ان کے سبھی احباب اور جانکار متفکر رہتے تھے لہذا ایک بار ان کے کسی دوست نے بڑی ہمت کر کے اُن سے پوچھا تھا کہ آپ کے ان تشویشناک حالات کے کارن آپ کو آخری وقت میں بہت پریشانی ہوگی۔ تو انہوں نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا تھا۔ ''آخری وقت .....میرے مرنے کے بعد میرا کوئی مسئلہ نہیں۔ اول تو میرے رشتہ دار مجھے ٹھکانے لگا دیں گے۔ اگر وہ نہیں لگائیں گے تو جب میرے کمرے میں سڑاند پیدا ہوگی تو محلے والے میرا انتم سنسکار کر دیں گے اور اگر بالفرض وہ بھی تیار نہ ہوئے تو میونسپل کارپوریشن والے اس کام کو سرانجام دے دیں گے۔ لہذا یہ میرا مسئلہ نہیں سماج کا مسئلہ ہے۔''

لیکن کسے معلوم تھا کہ اُن کی وفات پر اس کی اطلاع اُن کی اکلوتی بہن، ماموں، خالہ زاد اور ماموں زاد بھائیوں تک کو نہیں دی جائے گی اور بغیر کسی قریبی رشتہ دار یا ان کے قریبی دوستوں کو بتائے، ان کا پُر اسرا حالت میں انتم سنسکار کر دیا جائے گا۔ اور کسی کو خبر تک نہیں دی جائے گی۔ کیوں آخر کیوں؟

اگر مَیں ۲۰ر نومبر کو اُن کی عیادت کے لئے نہ گیا ہوتا تو شاید مہینوں تک ادبی دنیا کے ایک نامور شخصیت کی موت کے بارے لوگوں کو پتہ تک نہ چلتا جس نے تنقید اور فکشن کے میدان میں بڑی شہرت پائی تھی اور جس کے افسانوں کے مجموعے ''گیت اور انگارے''، ''شیشوں کا مسیحا''، ''کینوس کا صحرا'' اور ''پرندے اب کیوں نہیں اُڑتے''.....ناولٹ ''خوشبو بن کے لوٹیں گے''.....اور تنقیدی کتابوں ''فکر اور ادب''، ''ادب اور نفسیات''، ''ادب اور جدید ذہن''، ''مستقبل کے روبرو''، ''ادب کی آبرو'' اور ''نئی صدی اور ادب'' کی ادبی حلقوں میں بڑی پذیرائی ہوئی تھی اور جنہیں جدیدیت اور مابعد جدیدیت کو اُردو میں متعارف کرانے والوں میں ایک اہم مقام حاصل تھا۔ اُن کی ادبی حیثیت کے بارے میں معروف نقاد اور فکشن نگار سلیم اختر صاحب نے تحریر کیا تھا:

''دیویندر اسر نئی نسل کے ذہین ناقدین میں شمار کئے جاتے ہیں۔ نفسیات کے ساتھ وجودیت، سررئیلزم، اور دیگر جدید ترین ادبی اور فکری تحریکوں سے بھی گہری واقفیت ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جب نفسیات کا مطالعہ کیا تو اس کی افادیت ثابت کرنے یا خامیاں گنوانے تک خود کو محدود نہ رکھا بلکہ جدید ادب اور جدید ذہن کو نفسیات کے حوالے سے سمجھنے کی کوشش کی۔''

اسی طرح ممتاز محقق وقار عظیم صاحب نے اپنی تحقیقی کتاب ''داستان سے افسانے تک'' میں ان کی افسانوں کے بارے میں یوں رائے زنی کی:

''دیویندر اسر ہمارے اُن گنتی کے افسانہ نگاروں میں سے ہیں جنہوں نے زندگی کی تلخیوں اور اس کے انتشار و اضطراب سے گھبرا کر تصور اور تخیل کی دنیا میں پناہ لینے کی کوشش نہیں کی۔ انہوں نے اس انتشار اور اضطراب

کا مقابلہ بڑی پامردی سے کیا ہے۔اُن کی نظر زندگی کی چھوٹی چھوٹی برائیوں پر بھی ہے۔لیکن اُن کا عقیدہ ہے کہ یہ بُرائیاں پورے نظام کو بدلے بغیر پوری نہیں ہوسکتیں۔''

مَیں سروس لین کی جانب سے جا کر اِسر صاحب کے دروازے کی گھنٹی بجاتا ہوں تو گھنٹی نہیں بجتی لیکن بجتی بھی کیسے جب کہ اس کے تار نکال دئے گئے تھے یا اُسے خراب کر دیا گیا تھا تا کہ کوئی اسر صاحب سے مل نہ سکے۔پھر مَیں نے زور سے دروازہ کھٹکھٹایا مگر نہ کوئی آواز آئی اور نہ کسی نے دروازہ کھولا۔مجبوراً میں سامنے والے مین گیٹ پر پہنچا اور گیٹ کھٹکھٹایا کیونکہ گیٹ پر گھنٹی نہیں تھی مگر کسی نے دروازہ نہیں کھولا شاید اندر والوں کا خیال تھا کہ مَیں دروازہ کھٹکھٹا کر چلوں جاؤں گا۔لیکن مجھے خدشہ ہو رہا تھا کہ کوئی گڑ بڑ ضرور ہے۔مَیں پھر عقبی جانب پہنچ کر دروازہ زور زور سے پیٹتا ہوں تو اندر سے اُن کے بیٹے کی آواز آتی ہے۔

''کون ہے؟''

مجھے معلوم ہو گیا یہ اُن کے بڑے بیٹے کی آواز ہے۔تب مَیں نے کہا''مَیں ہوں بیٹا، ذرا دروازہ کھولو''

''دوسری طرف سے آؤ۔''

مَیں ان کے مین گیٹ پر پہنچ جاتا ہوں جہاں تالہ لگا ہوا تھا۔دروازہ کھٹکھٹانے پر اُن کا بڑا بیٹا باہر نکلتا ہے۔اور مجھے عجیب نظروں سے دیکھتا ہے۔اور پھر سوالیہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے سوال کرتا ہے۔''کیا ہے؟''

مَیں نے بڑی ملائمت سے جواب دیا۔ذرا گیٹ کھولو؟''

''کیوں؟''

مَیں جانتا تھا وہ تالہ کھولنا نہیں چاہتا اور چاہتا ہے کہ مَیں واپس چلا جاؤں۔مگر میں اتنی دُور سے آنے کی وجہ سے چاہتا تھا کہ اِسر صاحب کو ایک نظر دیکھ لوں۔مَیں چند ثانئے تو سوچ میں پڑ گیا پھر بڑا حوصلہ کر کے کہا''مَیں اِسر صاحب کو دیکھنا چاہتا ہوں''

اُس نے دروازہ نہیں کھولا اور اسی طرح کھڑے کھڑے جواب دیا۔''اُن کی تو وفات ہو چکی ہے؟''

مجھے بجلی کا کرنٹ سا لگا اور ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے مجھ پہ گولی داغ دی ہو۔میں حیران و پریشان اس کی صورت دیکھنے لگا کہ وہ شخص جس سے میرا بھائیوں کی طرح رشتہ تھا۔مجھے اُس کی موت کی خبر تک نہیں دی گئی۔مَیں اندر سے غصے سے کھول اُٹھتا ہوں، میں بڑے صبر و تحمل سے سوال کرتا ہوں۔''کب؟''

''۶ نومبر کو''

مگر تم نے اطلاع کیوں نہیں دی؟

''کیوں اطلاع دیتا۔آپ کیا ہمارے رشتہ دار ہیں۔''اُس نے کرختگی سے جواب دیا۔

اب میں اسے کیا جواب دیتا کہ میرا اِسر صاحب سے کیا رشتہ ہے۔مجھے تو کبھی کبھی احساس ہوتا تھا کہ مَیں ان کا ہمزاد ہوں حالانکہ وہ ۱۴ر اگست ۱۹۲۸ء کو پیدا ہوئے تھے اور میں ۱۷ر ستمبر ۱۹۲۹ء کو۔

ہماری پہلی ملاقات آج سے کوئی ستر سال پیشتر راولپنڈی میں ہوئی تھی۔اور پھر ہمارا ساتھ زندگی بھر کا ساتھ ہو گیا۔اسر صاحب کے بڑے بھائی مہندر اسر اور میرے ماموں نے تقسیم سے چند سال پیشتر راولپنڈی میں''وپلو آیورویدک فارمیسی'' قائم کر کے آیورویدک دوائیاں بنانے کا کاروبار شروع کیا تھا۔اور جب بٹوارے کے بعد مجبوراً انہیں ہجرت کر کے پاکستان سے کانپور آنا پڑا تو وہاں انہوں نے مشترکہ طور پر چونے کے بھٹے کا کاروبار شروع کیا اور کچھ مدت تک دونوں پریوار ایک ہی مکان میں رہتے رہے۔پھر اِسر صاحب کا پریوار قریب ہی ایک دوسرے کرائے کے مکان میں منتقل ہو گیا اور دن میں پریوار کے لوگ کئی کئی بار ایک دوسرے سے ملتے رہے۔کبھی مَیں اسر صاحب کے گھر چلا جاتا اور کبھی وہ۔شام کو ہم مول گنج چلے جاتے جہاں سرشار صدیقی، نامی انصاری وغیرہ کئی دوستوں کے ساتھ گپ شپ ہوتی۔ان دنوں ہمارے پاس ایک ہی سائیکل تھی جو اِسر صاحب کی ملکیت تھی جسے ہم باری باری چلایا کرتے تھے۔اگر جاتی بار وہ چلاتے تھے تو واپسی پر یہ فریضہ میرا ہوتا تھا۔اسی سائیکل کو کانپور اسٹیشن کے سائیکل اسٹینڈ پر کھڑا کر کے ہم پارٹی کی میٹنگ میں شرکت کے لئے لکھنؤ بھی گئے تھے اور گھر والوں کو پتہ تک نہ چلا۔انہیں تو تب پتہ چلا جب یکم جنوری ۱۹۵۰ء کو اِسر صاحب گرفتار ہو گئے تو سی آئی ڈی والوں نے انہیں بتایا کہ یہ لوگ لکھنؤ میں کمیونسٹ پارٹی کی میٹنگ میں شرکت کے لئے جایا کرتے تھے۔ورنہ انہیں گمان تک نہ تھا کہ ہماری پوشیدہ سرگرمیاں بھی ہیں۔وہ تو یہی سمجھتے رہے کہ ہم معمول کی طرح کسی کام سے باہر گئے ہیں۔

کانپور میں قیام کے دوران ہم نے''ارتقاء'' نامی ایک رسالہ بھی نکالا تھا۔مجھے آج بھی اچھی طرح یاد ہے کہ نومبر دسمبر کی شدید سردی میں ہم کھلی چھت پر بیٹھے بارہ ایک بجے تک اس کی پیکنگ اور پتے لکھنے میں مصروف رہتے تھے اور سردی کے باجود ہم اتنے خوش تھے کہ ہمیں سردی کا احساس بھی نہیں ہو رہا تھا۔

کانپور میں ہی ایک بار پارٹی نے ہمیں ہدایت دی کہ ہمیں ایک روپوش کامریڈ کو رات نو بجے حلیم مسلم کالج سے کسی دوسری جگہ منتقل کرنا ہے۔ایک کامریڈ نے ہمیں دن کو مذکورہ جگہ دکھا دی تا کہ ہمیں رات کو ڈھونڈنے میں دقت نہ ہو۔پھر رات نو بجے ہم حلیم کالج پہنچے اور وہاں سے ہم نے ایک بڑے بڑے منتشر بالوں والے پریشان حال نوجوان کو اپنے ساتھ لیا اور چمن گنج سے ایک رکشا میں اس نوجوان کو بیچ میں بٹھا کر ہم تینوں اس مکان پر پہنچے جہاں اسے قیام کرنا تھا۔جب وہ نوجوان مکان کے اندر چلا گیا تو ہم واپس اپنے گھر آ گئے۔بعد

ازاں معلوم ہوا کہ وہ نوجوان کامریڈ مونس رضا تھے جو بعد ازاں دہلی کے وائس چانسلر بھی رہے۔

اِسر صاحب کی موت کی خبر نے مجھے اندر سے ہلا دیا۔ گھر آ کر مَیں نے کسی دوست کو خبر سنانے سے پہلے اس کی تصدیق کرنا ضروری سمجھا تا کہ بعد ازاں غلط نکلنے پر مجھے پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ پہلے مَیں نے اُن کے ماموں صاحب سے ٹیلی فون پر رابطہ قائم کیا تو انہوں نے بتایا کہ چند دن پیشتر دہرہ دون سے اِسر صاحب کی بہن نملیش نے انہیں اطلاع دی تھی کہ ان کی وفات ہوگئی ہے۔۔تب مَیں نے دہرہ دون نملیش سے بات کی تو اُس نے بتایا کہ کہ اُسے دس دن بعد ۱۵ نومبر کو معلوم ہوا تھا کہ بھائی صاحب کی مرتیو ہوگئی ہے۔وہ بھی یوں کہ جب کئی بار فون کرنے پر اُن سے رابطہ قائم نہ ہوسکا تو مَیں نے اُن کے بیٹے سے موبائیل پر بات کی تو اُس نے بتایا کہ ان کی تو ۶ نومبر کو وفات ہوچکی ہے۔اس پر میں نے اس سے پوچھا کہ اُس نے ہمیں اطلاع کیوں نہیں دی تو اُس نے جواب دیا کہ آپ کو کیوں بتاتے آپ کا ہمارے ساتھ کیا رشتہ ہے؟'

فون پر یہ بات سُن کر مَیں غم وغصہ سے پاگل ہوا اُٹھا کہ جو شخص اپنی پھوپھی سے اپنا کوئی رشتہ نہیں مانتا وہ بھلا میرے رشتے کو کیا سمجھے گا، کیونکہ میرا اُن سے وہ رشتہ تھا جو کسی اور کا نہیں تھا۔اُن کے ہر کام میں میں شریک رہا۔۔وہاں جہاں کہیں بھی جاتے تھے مَیں اُن کے ساتھ ہوتا تھا۔ جب انہیں حکومتِ پنجاب کا شرومنی اعزاز ملا تو بھی وہ اپنے ساتھ مجھے ہی لے کر گئے تھے نہ کہ اپنے کسی بیٹے کو۔مگر میرا اُن کے ساتھ کیا رشتہ تھا وہ نہیں سمجھ سکیں گے۔حالانکہ خود اسر صاحب نے میرے اور اپنے رشتے کے بارے میں لکھا تھا کہ:

''نند کشور وکرم میرے گہرے اور عزیز ترین دوست ہیں اور ہمراز بھی۔اور یہ دوستی ستر برسوں پر محیط ہے حالانکہ ہماری عمروں میں محض ایک سال کا فرق ہے لیکن مَیں انہیں اپنا عزیز ہی سمجھتا ہوں۔میری پیدائش ۱۴ اگست ۱۹۲۸ء کو کیمبلپور حال اٹک شہر میں ہوئی تھی اور اُن کی ۱۷ ستمبر ۱۹۲۹ء کو راولپنڈی میں جو میرے شہر سے پچپن میل کی دوری پر تھا.....

ہم نے اپنی کاروباری زندگی ایک ہی وقت ایک ساتھ شروع کی تھی۔کانپور میں ہم نے ''ارتقاء'' پرچہ مشترک طور پر نکالا تھا جو بند کرنا پڑا۔میرے بھائی صاحب کی وفات ہوئی تو ہم ''استھی پرواہ کے لئے اکٹھے ہردوار گئے۔وہاں اُن کے جاننے والے پنڈت کے گھر رات رُکے۔اُس رات مجھ پر دمے کا بڑا شدید دورہ پڑا جس کا مَیں تقسیم کے بعد نقلِ مکانی کے دوران شکار ہوگیا تھا۔وہ رات یا تو کیمسٹ کی تلاش میں گھومتے رہے یا میری تیمارداری کرتے رہے۔اور ایک پل بھی نہیں سوئے۔دلی میں جب مجھے گھر چھوڑنا پڑا تو میرے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔نہ کپڑے نہ چائے کے برتن اور نہ پیسے۔لیکن یہ وکرم صاحب ہی تھے جنہوں نے مجھے سہارا دیا اور سب کچھ مہیا کرانے میں میری مدد کی۔اُس روز بارش ٹوٹ کر پڑ رہی تھی اور مَیں اُن کے اسکوٹر پر بیٹھا شہر کے گلی کوچوں میں گھوم رہا تھا''

(نند کشور وکرم از دیویندر اسر سہ ماہی اردو ادب، نئی دہلی)

کبھی ایک زمانہ تھا جب ہم ہر ہفتہ موہن سنگھ پیلس کے کافی ہاؤس میں شام کو ملا کرتے تھے۔یہ سلسلہ برسوں چلتا رہا۔پھر کچھ عمر کے تقاضہ اور کچھ ہمارے گھروں میں فون لگ جانے سے یہ سلسلہ دھیرے دھیرے کم ہوگیا۔اب ہم مہینوں بعد کافی ہاؤس یا شری رام سینٹر ملتے تھے۔آخری بار کوئی ڈیڑھ سال پہلے ہم کافی ہوم میں دن کے وقت ملے تھے تو مَیں نے اندازہ کرلیا کہ اب ان سے صرف گھر پر ہی جا کر ملاقات ہو سکے گی کیونکہ اب ان کا آنا جانا دشوار ہوگیا تھا۔خود انہوں نے بتایا کہ وہ کافی ہاؤس کا راستہ بھول گئے تھے اور بڑی مشکل سے پہنچے ہیں اور ضعف کے کارن ان سے چلا بھی نہیں جاتا۔واپسی پر مَیں نے انہیں تھری ویلر پر بٹھایا اور کچھ راستہ اُن کے ساتھ بھی گیا۔پھر مَیں نے اسکوٹر کے ڈرائیور کو جو ایک ادھیڑ عمر سردار جی تھے ہدایت دی کہ سردار جی انہیں آپ گھر کے اندر تک چھوڑ کر آیئے گا کیونکہ یہ بہت کمزور ہیں اور انہیں چلنے میں دشواری ہو رہی ہے۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ مزید کمزور ہوتے گئے۔اور ایک بار تو وہ گر بھی گئے تھے اور انہیں چلنے میں مزید دقت ہونے لگی تھی۔اب میں اُن سے ٹیلی فون پر بات کر لیتا تھا لیکن وہ گفتگو میں بھی زیادہ Response نہیں دیتے تھے اور مجھے ان کی صحت کے بارے میں تشویش ہونے لگی تھی کیونکہ ان کی یادداشت بھی تھوڑی کمزور ہوگئی تھی۔ان کی اس حالت سے مَیں ہی نہیں ان کے دوسرے قریبی دوست بھی متفکر رہتے تھے اور فون پر اُن کی خیر و عافیت پوچھتے رہتے تھے۔

پھر ایک دن ہمارے ایک مشترکہ دوست راجیو شریواستو صاحب کا فون آیا کہ آپ جنک پوری آ جایئے کیونکہ اِسر صاحب کی طبیعت بہت خراب ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ انہیں کسی نرسنگ ہوم میں داخل کرایا جائے۔مَیں فوراً تیار ہو کر جنک پوری پہنچا، جہاں راجیو مجھ سے پہلے پہنچ چکے تھے اور میرے کال بیل بجانے پر انہوں نے ہی دروازہ کھولا۔ابھی مجھے بیٹھے ہوئے چند منٹ ہی ہوئے تھے کہ اسر صاحب کا چھوٹا بیٹا آ کر بڑے غصے سے راجیو پر چلانے لگا کہ آپ گھنٹی بجنے پر دروازہ، کیوں کھولتے ہیں۔ہماری بلی باہر نکل جاتی تو؟' اور پھر ہمیں مخاطب کر کے بڑے زور سے چلا کر کہنے لگا۔'ہم ان کا علاج کرا رہے۔پھر بھی اگر آپ لے جانا چاہتے ہیں تو لے جایئے۔'اس کے بولنے کے انداز سے ہمیں احساس ہوگیا کہ یہ نہیں چاہتا کہ ہم انہیں لے جا کر علاج کے لئے نرسنگ ہوم میں داخل کرائیں۔تب مَیں نے راجیو سے کہا کہ 'راجیو جی! بہتر ہے کہ ہم انہیں نرسنگ ہوم میں داخل کرانے نہ لے جائیں۔کیونکہ اگر انہیں کچھ ہوگیا تو یہ

ہم پر الزام لگا کر کچھ بھی کر سکتے ہیں کیونکہ ہم اِسر صاحب کے جتنے بھی قریب ہوں، ان کے بیٹوں کی مرضی کے بغیر ہمیں کوئی حق حاصل نہیں۔ اور انہیں قانونی حق حاصل ہے۔ لہذا ہم اِسر صاحب کو اسی حالت میں چھوڑ کر چلے آئے اس کے کچھ دن بعد ان کا فون بھی منقطع کر دیا گیا تا کہ باہر کا کوئی شخص اُن سے رابطہ قائم نہ کر سکے۔ اور اب جب مہینوں بعد ان کے گھر پہنچا تو اچانک پتہ چلتا ہے کہ آج سے پندرہ دن پیشتر وہ اس جہان فانی سے کوچ کر چکے ہیں۔

اِسر صاحب کی ازدواجی زندگی کی کہانی بہت ہی تکلیف دہ تھی اور اس سے ان کے سبھی جانکار واقف ہیں۔ جن دنوں ان کا وِمل (منکوحہ بیوی) سے معاشقہ چل رہا تھا تو انہوں نے مجھے اس بارے میں بتایا کہ وہ اس سے شادی کر رہے ہیں اور وہ اس کے ساتھ مجھے ملنے کے لئے برلا مندر کے پاس پنجاب یونیورسٹی کے جرنلزم کے شعبے میں بھی آئے تھے جہاں میں جرنلزم کی کلاسیں اٹینڈ کرتا تھا۔ مگر گھر والے اس شادی سے زیادہ خوش نہیں تھے کیونکہ وہ ایک غیر برادری کی لڑکی تھی اور ان دنوں غیر برادری میں شادی کرنے کا زیادہ رواج نہ تھا۔ بہر حال اُن کی شادی ہوگئی اور اُن کے دو بیٹے ہوئے اور وہ ایسٹ پٹیل نگر میں کرائے کے مکان میں رہنے لگے..... پھر حالات نے ایسا پلٹا مارا کہ انہیں رات کے نو بجے گھر پہنچنے پر گھر میں گھسنے نہیں دیا گیا اور اچانک وہ گھر سے بے گھر ہو کر رہ گئے۔

اس واقعہ کو انہوں نے اپنی آخری کہانی ''مسٹر روشو'' میں بھی جو کہ ان کی اپنی کہانی معلوم ہوتی ہے یوں بیان کیا ہے کہ:

''اس دن وہ کسی ادبی نشست سے واپس آئے تھے۔ رات کے قریب نو بجے تھے۔ ریڈیو پر خبریں سنائی جا رہی تھی۔ انہوں نے دروازے پر دستک دی۔ اندر سے آواز آئی۔ جہاں سے آئے ہو وہیں چلے جاؤ۔ لفظوں کے اندر آواز تھی۔ جس عورت کے ساتھ شام گزار کے آرہے ہو واپس اُس کے پاس چلے جاؤ، مسٹر روشو نے دوبارہ دستک نہیں دی۔ یہ ان کا دستور نہیں تھا۔ انہوں نے ایک لمحہ اُس بند دروازے کو دیکھا جسے وہ کئی راتوں کو نیم وا رکھتے تھے کہ نہ جانے وہ کب کسی ڈرامے کی ریہرسل سے لوٹے۔ ایک بجے، دو بجے، تین بجے، پو پھٹنے کے وقت..... اور اسے دستک نہ دینی پڑے دروازہ بند نہ ملے مسٹر روشو ہولے ہولے بغیر چاپ کئے سیڑھیاں اُتر کر نیچے آگئے۔ مین گیٹ کھولا اور باہر سڑک پر آگئے۔''

بلاشبہ ''مسٹر روشو'' ان کی اپنی زندگی کے کئی واقعات پر مبنی کہانی ہے جس میں انہوں نے اپنی زندگی کے کئی واقعات بیان کئے ہیں جیسے کالج کے زمانے میں ان کا کمیونسٹ پارٹی میں شامل ہونا۔ شہید بھگت سنگھ سے متاثر ہو کر انقلابی بن جانا اور اور تحریک آزادی میں حصہ لینا اور جلسے جلوسوں میں شامل ہونا۔ ''مسٹر روشو'' میں انہوں نے یہی واقعات یوں قلم کئے ہیں:

''اسٹالن گراڈ، پر حملہ ہوا تو ریڈ آرمی بنالی۔ اگست انقلاب ہوا تو دیواروں پر عبارت لکھ دی۔ انگیریزو ہندوستان چھوڑو..... بنگال کا قحط پڑا تو گلی کوچوں میں بھوکا ہے بنگال رے ساتھی، گاتے ہوئے کپڑے لتے، آٹا چاول جمع کرنے لگا۔ جب شہر کی فضا بگڑنے لگی تو اُس نے طالب علموں کا جلوس نکالا۔ 'امن مارچ' شہر میں اس سے بڑا جلوس پہلے کبھی نہیں نکلا تھا اور لوگوں نے اس طرح ایک ساتھ مارچ نہیں کیا تھا۔ اس دن بھی نہیں جب شہر کی سڑکوں پر ہجوم اُبل پڑا تھا۔ لال قلعے سے آئی آواز۔ ڈھلوں 'شاہنواز' کچہری کے پاس پولیس نے جلوس کو روک دیا۔ روشو اور اُس کے ساتھ دو اور طالب علموں کو حراست میں لے لیا گیا''

گھر سے نکالے جانے کے بعد وہ رات انہوں نے کہاں گزاری مجھے یاد نہیں شاید جنک پوری چلے گئے ہوں جہاں ان کا مکان زیر تعمیر تھا اور جہاں ان کے والد قیام پذیر تھے۔ تاہم دوسرے دن شام کو وہ اپنے دفتر سے سیدھے میرے دفتر پٹیالہ ہاؤس آئے اور مجھے ساری روداد سنائی۔ تب ہم کینٹین گئے اور وہاں سے ہم نے کچھ بنیانیں، انڈرویئر۔ تولیہ ٹوتھ پیسٹ وغیرہ خریدے اور پھر جنک پوری والے مکان میں آگئے جہاں ان کے والد قیام پذیر تھے۔ کچھ مہینے وہ لوگ الگ الگ رہے اس اثنا میں اِسر صاحب کے والد کا انتقال ہو گیا اور ان کی بیوی بھی اس موقع پر جنک پوری آئی تو اِسر صاحب کے کسی رشتہ دار نے دونوں میں سمجھوتہ کرا دیا اور وہ ایسٹ پٹیل نگر سے جنک پوری منتقل ہوگئی۔ لیکن دونوں میں جھگڑے، تکرار اور کشمکش کا سلسلہ جاری رہا..... اسی اثنا ایک دن وہ ہمارے گھر آئے تو ان کی کلائی پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ میری بیوی نے پوچھا 'بھائی صاحب! یہ کیا ہوا ہے؟' تو انہوں نے جواب دیا 'میڈم نے کُکر مارا ہے'۔ بعد ازاں حالات اتنے خراب ہو گئے کہ نوبت طلاق تک پہنچ گئی۔ طلاق کی ایک وجہ یہ بھی بتائی گئی تھی کہ ان کی بیوی ان کو زدوکوب کرتی ہے۔ اس پر جج نے کہا تھا کہ یہ عجیب کیس ہے جس میں کسی مرد کی پٹائی کی گئی ہے ورنہ اکثر عورتیں ہی اس طرح کی شکایت کرتی ہیں۔

طلاق کے بعد ان کی مطلقہ بیوی تو کہیں اور رہنے لگے مگر بیٹے وہیں رہنے لگے جو ہر وقت آنے جانے والے پر نظر رکھتے تھے۔ اور جب مَیں بیس نومبر کو اِسر صاحب کی عیادت کے لئے گیا تو پتہ چلا کہ پندرہ دن پیشتر وہ اس دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں اور اُن کے کسی رشتہ دار کو مطلع نہیں کیا گیا حتیٰ کہ ان کی سگی بہن کو بھی نہیں۔ کیسی عجیب وغریب اور پُر اسرار موت تھی یہ، جس میں ان کے کسی رشتہ دار کو بھی مطلع نہیں کیا گیا اور چپ چاپ ان کا انتم سنسکار کر دیا گیا۔

دیویندر اِسر کے اکثر مضامین اور افسانوں میں سوالیہ نشان ہوتے تھے، مگر یہ معلوم نہ تھا کہ موت کے بعد وہ خود بھی ایک سوالیہ نشان بن جائیں گے۔ اور اپنے احباب واعزاء کے دل و دماغ میں بھی سوالیہ نشان چھوڑ جائیں گے۔ معلوم نہیں اُن کی وفات ہسپتال میں ہوئی یا گھر پر۔ کون کون اُس وقت اُن کے پاس موجود تھا؟ کس شمشان گھاٹ پر انہیں نذرِ آتش کیا گیا اور اس میں

باقی صفحہ ۱۱۶ پر ملاحظہ کیجیے

ایک صدی کا قصہ
کے۔ایل۔سیگل

دیپک کنول (ممبئی، بھارت)

وہ ہندی فلموں کا سپر اسٹار تھا۔ وہ فلمی سنگیت کا تان سین تھا۔ وہ گویوں کا جگت گرو تھا۔ اُس نے نغموں کو لے بخشی۔ اُسنے گیتوں کو آہنگ دیا۔ اُسنے لفظوں کو نئے معنی عطا کئے۔ اُسنے آواز کو سوز و گداز سے آراستہ کیا۔ وہ ایک عام گویا نہیں تھا بلکہ وہ ایک ہمہ جہت فن کار تھا۔ اس ہمہ جہت فن کار کا نام کندن لال سہگل تھا۔ کندن لال سہگل 11 جون سن 1904 کو ریاست جموں و کشمیر کے گرم خطے جموں کے نواں شہر میں پیدا ہوا۔ اُس کے باپ کا نام امر چند سہگل تھا جو کہ پنجابی نژاد تھا اور اُس کا آبائی شہر جالندھر تھا۔ وہ روزگار کے سلسلے میں جموں منتقل ہوا تھا۔ امر چند مہاراجہ کی عدالت میں تحصیلدار کے عہدے پر فائض تھا۔ اُس کی ماں کیسر کور بہت ہی سیدھی سادھی اور پرہیز گار عورت تھی اور ہندوستانی کلاسیکل سنگیت کے ساتھ اُسے ایک والہانہ لگاؤ تھا۔ وہ اکثر بھجن کیرتن میں حصہ لیا کرتی تھی۔ وہ ننھے کندن کو بھی ایسی دھارمک تقریبات میں حصہ لینے کیلئے اپنے ساتھ لے جایا کرتی تھی اور وہ بھی شبد کیرتن میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا کرتا تھا۔ کندن کیسر کور کے پانچ بیٹوں میں سے چوتھے نمبر پر تھا اور وہ ہر برس رام لیلا کے ناٹک میں بھاگ لیا کرتا تھا۔ گول مٹول سے سہگل کو سیتا کا کردار بہت پسند تھا اس لیے وہ رام لیلا کے ناٹک میں سیتا کا کردار ہی ادا کرتا تھا۔

سہگل کی پڑھائی بڑی مختصر رہی۔ جب بھی اُس کا باپ ریاست کے دورے پر نکل جاتا تھا تو وہ کندن کو اپنے ہمراہ لے جاتا تھا۔ ریاست کے مضافات میں جہاں وہ قیام کرتے تھے تو وہاں کے مقامی لوگ تحصیلدار صاحب کو خوش کرنے کے لئے اُن کا سواگت لوک سنگیت سے کیا کرتے تھے۔ ننھے کندن کے کانوں میں جب سنگیت کے بول پڑتے تھے تو اُس کی روح کو ایک سکون سا مل جاتا تھا۔ پڑھائی کے ساتھ اُسے زیادہ رغبت نہ رہی۔ اُسے اسکول کی پڑھائی کو جلد ہی خیر باد کہنا پڑا۔ وہ سنگیت کی اور کھچتا چلا گیا۔ اُس کی ماں اُس کے شوق کو دیکھ کر اُسے صوفی پیر سلیمان یوسف کے پاس لے جایا کرتی تھی۔ بارہ برس کی کچی عمر میں سہگل نے مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے دربار میں میرا بھجن گایا جسے سن کر مہاراجہ بہت متاثر ہوا اور اُس نے نہ صرف ننھے سہگل کو آشیر واد دیا بلکہ ساتھ میں یہ پیشن گوئی بھی کر دی کہ سہگل کا مستقبل بہت ہی روشن ہے۔ اُس کے باپ کو سہگل کا گانا بجانا قطعی پسند نہ تھا۔ ویسے بھی اُس زمانے میں گانے بجانے والوں کو عزت کی نظر سے دیکھا نہ جاتا تھا۔ یہ پیشہ میراثیوں نے اپنایا تھا اسلئے کوئی بھی عزت دار گھرانہ سنگیت کو پیشے کے طور پر اپنانے سے احتراز ہی کرتا تھا۔ جب امر چند نے محسوس کیا کہ سہگل سنگیت کا دیوانہ بن چکا ہے اور وہ اسے پیشے کے طور پر اپنانا چاہتا ہے تو امر چند بڑا دکھی اور پریشان ہوا۔ جلد ہی اُسے بہت گہرا صدمہ لگا جب اُسے پتہ چلا کہ سہگل نے پڑھائی کو خیر باد کہہ دیا ہے۔ اُس نے سہگل کو سمجھانے کی بہت کوشش کی مگر سہگل بھی کم ضدی نہ تھا۔ وہ اپنا فیصلہ بدلنے پر آمادہ نہ ہوا۔

وہ جب تیرہ سال کا ہوا تو اُس کی آواز میں بدلاؤ آنے لگا۔ اپنی پتلی سی آواز کی جگہہ اُسے اپنی نئی اور پھٹی ہوئی آواز جب سنائی دینے لگی تو وہ چکرا کے رہ گیا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ سن بلوغت میں قدم رکھ چکا ہے اور اُس میں جو یہ جسمانی بدلاؤ آرہے ہیں یہ تو ہارمونز کی تبدیلی کا ایک فطری عمل تھا۔ سہگل بلوغت کے اس عمل سے آشنا نہ تھا۔ اُس نے مون رہنے کا فیصلہ کیا۔ اُس کی چپی نے گھر والوں کو کافی پریشان کر دیا۔ وہ مہینوں ایسے چپ رہا جیسے چپ شاہ کا روزہ رکھ لیا ہو۔ سب سے زیادہ اُس کی ماں اُس کے مون رہنے سے دکھی تھی۔ ایک دن وہ اُسے ایک فقیر کے پاس لے گئی جس نے اُسے بڑے پیار سے سمجھایا کہ وہ جوان ہو رہا ہے اسلئے اُس کی آواز میں جو بدلاؤ آرہا ہے وہ کوئی تشویش کی بات نہیں بلکہ یہ ایک تخلیقی عمل ہے اسلئے وہ اپنا مون توڑ دے اور ریاض سے ناغہ نہ کرے۔ سہگل نے فقیر کی بات مان لی اور اگلے تین سال تک وہ رات و دن سنگیت کا ریاض کرتا رہا۔ سہگل دوسروں کے سہارے جینے پر یقین نہیں رکھتا تھا اسلئے اُس نے بچپن سے ہی کام کرنا شروع کیا۔ پیسے کمانے کی خاطر اُس نے پنجاب ریلوے میں ٹائم کیپر کی نوکری کر لی۔ سنگیت سے اُسے جنون کی حد تک پیار ہو گیا تھا۔ اُس کی سنگیت کی محفل خاص دوستوں تک ہی محدود ہوا کرتی تھیں۔ دوست و احباب کا ایک چھوٹا سا حلقہ تھا جن سے سہگل داد و تحسین پا لیتا تھا۔ جب اُس نے ''ریمنگٹن ٹائپ کمپنی'' میں ٹائپ رائٹر سیلز مین کی حیثیت سے کام کرنا شروع کیا تو یہاں سے اُس کی قسمت نے کروٹ بدلی۔ ہوا یوں کہ وہ دوستوں کو اپنی گائکی سے محظوظ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ اُس کے سننے والوں میں ''ہندوستان ریکارڈ کمپنی کا ایک نمائندہ بھی بیٹھا ہوا ہے۔ اُس شخص کو سہگل کی آواز بڑی دم دار لگی اور اُس نے سہگل کو کمپنی کے ساتھ ایک معاہدہ کرنے پر آمادہ کر لیا۔ اس کمپنی نے سہگل کا پہلا گراما فون ریکارڈ بازار میں اُتارا۔ ''جھولا نا جھلاؤ'' اُسی ریکارڈ کا ایک گانا تھا جو راتوں رات ہٹ ہوا تھا۔ ''ریمنگٹن ٹائپ کمپنی'' میں کام کرنے کی بدولت اُسے ملک کے کئی حصوں میں گھومنے پھرنے کا موقع مل گیا۔ گھومتے گھامتے وہ لاہور پہونچ گیا جہاں اُس کی ملاقات مہر چند جین سے ہوگئی۔ مہر چند جین ایک کاروباری آدمی تھا جو ادبی رجحان رکھتا تھا۔ دونوں بہت جلد دوست بن گئے۔ مہر چند جین نے شیلانگ کے انارکلی بازار میں ایک صابن کی فیکٹری کھولی۔ بعد میں وہ دونوں کلکتہ چلے آئے۔ یہاں پر روز شعر و سخن کی محفلیں سجتی تھیں۔ اُن دنوں سہگل شوقیہ گایا کرتا تھا۔ سہگل، کی آواز میں ایک عجب سا درد تھا۔ مہر چند جین کو سہگل کی آواز بڑی پسند تھی۔ یہ مہر چند جین ہی تھا جس نے سہگل

کو گانے کی تحریک و ترغیب دی۔ سہگل اکثر کہا کرتا تھا کہ وہ جو کچھ بھی ہے اس میں مہر چند جین کی حوصلہ افزائی کا کافی عمل و دخل ہے۔ اس بیچ اُس نے ہوٹل منیجر کی نوکری بھی کر لی اور ساتھ ہی اپنے شوق کی تسکین کے لئے گاتا بھی رہا۔ بعد میں اُس کی گائکی کا شوق جنون کی حد اختیار کر گیا۔ وہ اپنے فن کو جلا بخشنے کے لئے رات دن ریاض میں لگا رہتا تھا۔

یہ سن 1930 کی بات ہے۔ کلاسیکی سنگیت کے اُستاد اور مشہور سنگیت کار ہریش چند بالی کندن لال سہگل کو آسام سے کلکتہ لے آیا اور اُس نے اس نونہال گلوکار کو اُس زمانے کے مشہور سنگیت کار آر۔ سی۔ بورل سے متعارف کرایا۔ آر۔ سی۔ بورل کو سہگل میں فن کارانہ صلاحیتیں نظر آئیں اور وہ اُسے کلکتہ کے ''نیو تھیٹرز اسٹوڈیو'' کے مالک بی۔ این۔ سرکار کے پاس لے گیا جس نے اُسے دو سو روپے ماہانہ کے معاہدے پر اپنی کمپنی میں رکھ لیا۔ یہیں پر سہگل اُس زمانے کی مشہور ہستیوں کے رابطے میں آ گیا جن میں پنکج ڈے، کے۔ سی۔ ملک اور پہاڑی سانیال شامل تھے۔ ان کی صحبت میں رہ کر سہگل نے سنگیت کی باریکیاں سیکھ لیں۔

اسی بیچ انڈین گراموفون کمپنی نے سہگل کا پہلا ریکارڈ بازار میں اُتارا۔ یہ پنجابی گیتوں پر مبنی ایک البم تھا جس کا سنگیت ہریش چند بالی نے ترتیب دیا تھا۔ ہریش چند بالی کو سہگل کا پہلا سنگیت کار ہونے کا فخر حاصل ہے۔ کچھ عرصے بعد سہگل کو فلم ''محبت کے آنسو'' میں ایک چھوٹا سا کردار ادا کرنے کا موقع ملا۔ اس فلم کے بعد دو اور فلمیں آئیں جن کے نام ''صبح کا ستارا'' اور ''زندہ لاش'' تھیں۔ یہ فلمیں 1932 میں ریلیز ہوئیں مگر دونوں فلمیں ناکام رہیں اس طرح سہگل کی اداکاری کا سفر خوشگوار ثابت نہ ہو سکا۔ کاتب تقدیر نے سہگل کے لئے کچھ اور سوچ کے رکھا تھا۔ یہ سن 1933 کی بات ہے جب فلم ''پورن بھگت'' ریلیز ہوئی۔ اس میں کندن لال سہگل کے چار بھجن تھے۔ ان بھجنوں نے ملک بھر میں ایسی دھوم مچا دی کہ سہگل راتوں رات اسٹار بن گیا۔ اس کے بعد تو فلموں کی لائن لگ گئی۔ سہگل کی یکے بعد دیگرے فلمیں ریلیز ہونے لگیں جن میں ''یہودی کی لڑکی''، ''چنڈی داس''، ''روپ لیکھا'' اور ''کاروان حیات'' قابل ذکر ہیں۔ لتا منگیشکر نے اپنے ایک انٹرویو کے دوران اس بات کا اعتراف کیا تھا کہ جب اُسنے 1935 کی فلم ''چنڈی داس'' میں سہگل کی اداکاری دیکھی تو وہ اُس کی اداکاری سے اتنی متاثر ہوئی کہ اُس کے دل میں سہگل سے شادی کرنے کی خواہش جاگی۔

سہگل نے اپنی لافانی اداکاری سے شرت چندر چٹرجی پادھائے کے شہرہ آفاق ناول ''دیوداس'' کو امر کر دیا۔ اس فلم کو پی۔ سی۔ بروا نے ڈائرکٹ کیا تھا۔ مزے کی بات یہ ہے کہ اس فلم کا جو کیمرہ مین تھا وہ ہندوستان کا مایہ ناز ہدایت کار بمل رائے تھا۔ اس فلم کے صدا بہار گانے ''بالم آئیو بسو میرے من میں'' اور ''دکھ کے اب دن بیتت ناہی'' ہمیں سہگل کی مدھ بھری صدا بہار آواز کے قائل کر دیتے ہیں۔ فلم ''دیوداس'' نے سہگل کو ہندی فلموں کا اسٹار بنا دیا۔ یہ فلم 1935 میں ریلیز ہوئی اور اس فلم نے ملک بھر میں دھوم مچا دی۔ لاکھوں کروڑوں سینما شائقین سہگل کے دیوانے بن گئے۔ سہگل نے نہ صرف اداکاری میں اپنا سکہ جمایا تھا بلکہ گائکی میں بھی اُس نے کامیابی کی معراج کو چھو لیا تھا۔ دیو داس کے کردار کو اُس نے زندگی بخشی تھی اور یہ کردار لافانی بن کر رہ گیا تھا۔

سہگل پنجابی نژاد ہونے کے باوجود بڑی تیزی سے بنگالی سیکھنے میں کامیاب ہو گیا۔ اُس نے کلکتہ میں رہ کر سات بنگالی فلموں میں کام کیا۔ کہا جاتا ہے کہ رابندر ناتھ ٹیگور نے اپنے گانے کسی غیر بنگالی سے پہلی بار گوانے سے پہلے سہگل کا باضابطہ انٹرویو لیا۔ جب اُسے اطمینان ہو گیا کہ سہگل اُس کے گانوں کے ساتھ پورا انصاف کر پائے گا تو اُس نے سہگل کو گانا ریکارڈ کرنے کی اجازت دی۔

''نیو تھیٹرس'' کے ساتھ سہگل نے کئی کامیاب فلمیں کیں۔ 1937 کی ''پریذیڈنٹ'' 1938 کی ''اسٹریٹ سنگر'' اور 1940 کی ''زندگی''۔ ان ساری فلموں میں کندن لال سہگل نے مکھیہ رول ادا کیا تھا۔ ''بابل مہورا نہار چھوٹا جائے'' ایسے صدا بہار گانے ہیں جو کہ سہگل نے کیمرے کے سامنے گائے ہیں۔ حالانکہ پلے بیک سنگنگ کا چلن شروع ہو گیا تھا تاہم سہگل نے اپنے بیشتر گانے پرانے طرز سے ہی گائے۔

دسمبر 1941 میں سہگل کلکتہ سے بمبئی منتقل ہو گیا۔ یہاں پر اُس نے ''رنجیت موی ٹون'' کی فلموں میں کام کرنے کا فیصلہ کیا۔ اُس نے ''رنجیت موی ٹون'' کی کئی کامیاب فلموں میں کام کیا جن میں 1942 کی ''بھگت سورداس'' اور 1943 کی ''تان سین'' قابل ذکر ہیں۔ موخرالذکر فلم اس کے صدا بہار گانوں سے کافی چرچا میں رہی۔ اسی فلم کا ایک گانا ''دیا جلاؤ'' جو کہ راگ سدھا کلیان میں تیار کیا گیا تھا، موسیقی کی تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ 1944 میں وہ پھر کلکتہ لوٹا۔ یہاں پر اُس نے اپنے محسن کی ایک فلم ''میری بہن'' مکمل کی۔ اسی فلم کے شہرہ آفاق گانے ''دو نینا متوارے'' اور ''اے کاتب تقدیر مجھے اتنا بتا دے'' آج بھی ہر سنگیت پریمی کے دل و دماغ میں تازہ ہیں۔

سہگل شراب کا ایسا رسیا تھا کہ اُس کی صبح جام سے شروع ہوتی تھی اور رات جام پر ختم ہوتی تھی۔ مے خواری نے اُس کی زندگی پر اس قدر غلبہ حاصل کر لیا تھا کہ وہ تبھی گا سکتا تھا جب وہ شراب پیتا تھا۔ وہ پینے کے اُس مقام تک پہونچ گیا تھا جہاں شراب چھوڑنے سے اُس کی موت ہو سکتی تھی۔ سہگل نے اپنی چھوٹی سی عمر میں وہ مقام حاصل کیا جسے پانے میں کئی جنم بیت جاتے ہیں۔ سہگل کی آواز میں بے پناہ درد و سوز تھا۔ یہ آواز اُسے ورثے میں ملی تھی۔ سہگل آواز کا ہی شہنشاہ نہیں تھا بلکہ اُس نے دل بھی سونے کا پایا تھا۔ اُس نے ہر شخص کی مدد کی۔ جسے وہ جانتا تھا اُس کی بھی اور جسے نہیں جانتا تھا اُس کی بھی۔ جب پرتھوی راج کپور نے کیدار شرما کو اُس سے متعارف کرایا تو کیدار شرما کی مالی حالت اُس سے چھپی نہ تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اگر وہ کیدار شرما کو کوئی مالی امداد کی پیشکش کرے گا تو شاید اُس سے اُس کی انا مجروح ہو جائے گی اس لئے اُس نے اُسے گیت لکھنے کے لئے کہا۔ فی گانا کا معاوضہ اُس نے پانچ روپیہ مقرر

کیا۔ وہ کیدار شرما سے گانے لکھواتا رہا اور اُسے پیسے دیتا رہا۔ جب تک کیدار شرما کو فلموں میں کامیابی نہیں ملی سہگل دامے، درمے، سخنے اُس کی مدد کرتا رہا۔ سہگل عجز وانکسار کا پیکر تھا۔ اُس کی منکسر المزاجی کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ وہ کسی کو چھوٹا نہیں سمجھتا تھا۔ ایک بار اُس کے شوفر یوسف نے ایک فلمی رپورٹر کو اشک بار آنکھوں سے کندن لال سہگل کا ایک واقعہ سنایا۔ ہوا یوں کہ جب وہ ایک بار بیمار پڑ گیا تو سہگل صاحب کو کسی ملازم نے یوسف کی بیماری کے بارے میں خبر کر دی۔ سہگل صاحب اگلے روز یوسف کی مزاج پرسی کرنے اُس کے گھر پہونچ گیا اور اپنے ساتھ بہت سارے پھل فروٹ اور دوائیاں لے کر بھی گیا۔ یوسف اپنے صاحب کو اپنے گھر میں دیکھ کر جذباتی ہو گیا۔ سب سے حیران کرنیوالی بات یہ تھی کہ جب وہ اُٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کرنے لگا تو سہگل نے اُسے بیٹھنے سے منع کیا اور زبردستی اُسے لٹالیا اور پھر جا کر اُس کے پاؤں دبانے لگا۔ یہ کہہ کر یوسف اپنے آنسو روک نہ سکا اور اُس نے گلوگیر آواز میں کہا'' کہ وہ انسان نہیں فرشتہ تھا۔''

1945 میں اُن کے ایک چاہنے والے نے سہگل کو اپنے ولے پارلے کے نئے بنگلے میں مدعو کیا تھا۔ وہ اپنے ساتھ کیدار شرما کو بھی لے کر گیا۔ یہ بنگلہ سمندر کے بالکل قریب تھا۔ سہگل کو مہمانوں کی بھیڑ بھاڑ دیکھ کر وحشت ہونے لگی۔ وہ اپنے آپ کو بے چین سا محسوس کرنے لگا اسلئے وہ اپنے میزبان کو بتائے بنا کیدار شرما کیساتھ وہاں سے کھسک گیا اور پاس ہی سمندر کنارے ٹہلنے چلے گیا۔ شام کے دھندلکے چاروں اور پھیلنے لگے تھے۔ سمندر بڑا شانت تھا۔ وہ بہت دیر تک ٹہلتا رہا تبھی ایک فقیر کی آواز گونجی۔ وہ ہارمونیم لے کر غالب کی ایک غزل گا رہا تھا۔ سہگل اُس فقیر کے قدموں میں چپ چاپ بیٹھ گیا۔ کیدار شرما بھی اُس کے بغل میں بیٹھ گیا۔ جب فقیر نے گانا ختم کیا تو سہگل نے اُس فقیر کے پاؤں چھو لئے اور جیب میں ہاتھ ڈال کر اپنا بٹوہ باہر نکالا اور اُس میں جتنی بھی رقم تھی فقیر کی جھولی میں ڈال دی۔ رقم کچھ معمولی نہیں تھی۔ پورے پانچ ہزار روپیے تھے۔ کیدار شرما کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ جب وہ وہاں سے اُٹھ کر جانے لگے تو کیدار شرما نے سہگل سے کہا۔

''آپ کو پتہ ہے آپ نے فقیر کو کتنے پیسے دئے۔ پورے پانچ ہزار تھے۔ پورے پانچ ہزار۔''

جواب میں سہگل نے پنجابی میں کہا۔''اوپر والے نے کیا مینوں گن کے دتے سی؟''

کندن لال سہگل نے کلاسیکل سنگیت کی کوئی باضابطہ ٹریننگ نہیں لی تھی۔ اُسنے سنگیت کے بارے میں جتنا بھی گیان پایا تھا وہ اپنی ماں سے پایا تھا۔ یہ اُس کی خداداد صلاحیت ہی تھی جو وہ اتنی شدت اور گہرائی سے ہر طرح کے گانے گا پایا تھا۔ وہ چاہے کلاسیکی گانا ہو یا بھجن۔ غزل ہو یا فلمی گیت۔ اُس نے ہر گانے کو پورے خلوص اور نیک نیتی سے گایا۔ پنجابی ہونے کے باوجود سہگل کو اُردو زبان پر کس قدر دسترس حاصل تھی اس کا اندازہ اس کی غزلیں سن کر ہی لگایا جا سکتا ہے۔ جب غالب نے یہ غزل لکھی تھی۔''اے کاتب تقدیر مجھے اتنا بتا دے۔ کیوں مجھ سے خفا ہے۔'' تو غالب نے خواب میں بھی یہ سوچا نہ ہوگا کہ ایک زمانے میں سہگل اس غزل کو اس طرح گائے گا کہ یہ غزل جاوداں ہو کر رہ جائے گی۔ سہگل غزل کی روح میں اتر جایا کرتا تھا۔

1932 سے لے کر 1946 تک کا جو دور تھا یہ سہگل کا دور تھا۔ پورا ملک سہگل کے خمار میں ڈوبا ہوا تھا۔ سہگل نے اردو یا ہندی میں ہی نہیں بلکہ ملک کی بیشتر زبانوں میں گیت گائے جن میں پشتو، فارسی، پنجابی، بنگالی اور تامل شامل ہیں۔ وہ کسی بھی گانے کی ریکارڈنگ سے پہلے شراب سے اپنا گلا تر کیا کرتا تھا۔ اُس نے اس کا نام'' کالی پانچ'' رکھا تھا۔ شراب پینے کے بعد ہی ریکارڈنگ ممکن ہوتی تھی۔ شراب اُس کی ایک ضرورت بن کر رہ گئی تھی۔ شراب اُس کے پورے سسٹم کو متحرک کر دیتی تھی۔ بقول نوشاد اُس کی مے کشی اُس مقام تک پہونچ گئی تھی جہاں اُس کو چھوڑنا ناممکن تھا۔ سہگل نے کل ملا کر 185 گانے گائے جن میں 142 فلمی اور 43 غیر فلمی تھے۔ کندن لال سہگل نے فلموں میں کامیابی پانے کے بعد اپنے بڑے بھائی کی بیٹی میگھا رانی کو گود لیا تھا۔ سہگل اُن دنوں کنوارا تھا۔ بعد میں اُس نے آشا رانی نامی ایک عورت سے شادی کی تھی جس سے اُس کے تین بچے ہوئے۔ ایک بیٹا اور دو بیٹیاں۔ بیٹے کا نام مدن موہن تھا اور بیٹیوں کا نام نینا اور بینا تھا۔ افسوس کہ اُس کے خاندان میں سے کوئی بھی فرد اب حیات نہیں ہے۔ اُس کی بیوی 1978 میں اور بیٹا 1981 میں گزر گیا جب کہ بڑی بیٹی نینا 15 اپریل 2000 ممبئی میں اور چھوٹی بیٹی بینا 31 اُکتوبر 2001 دلی میں انتقال کر گئیں۔

سہگل زندگی کی بیالیس بہاریں ہی دیکھ سکا۔ بلا کی مے نوشی اُس کی زندگی کو گہن لگا چکی تھی۔ وہ 18 جنوری 1947 کو اس جہان فانی سے کوچ کر گیا۔ موت سے قبل وہ اپنے آبائی شہر جالندھر میں تھا جہاں اُس نے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے آنکھیں موند لیں۔ لاکھوں کروڑوں شائقین کا محبوب جب اس جہاں فانی سے کوچ کر گیا تو اُس کے جنازے میں تیس چالیس لوگ سے زیادہ شریک نہ ہوئے تھے۔'' پروانہ'' اُس کی آخری فلم تھی جو اُس کی موت کے بعد ریلیز ہوئی۔ سہگل کا جگر خراب ہو چکا تھا۔ ساتھ ہی وہ شوگر کی بیماری میں بھی مبتلا تھا۔ وہ ان جان لیوا بیماریوں کے ساتھ پورے دس سال تک جیتا رہا۔ عالم مے نوشی میں اُس نے بہت سارے صدا بہار گانے سنگیت پریمیوں کو دئے جن کی تفصیل یہاں پر بیان کرنا ممکن نہیں ہے۔ موت سے قبل اُس نے سنگیت کار نوشاد کے ساتھ فلم ''شاہجہاں'' کی۔ اس فلم میں چھ گانے تھے۔ پانچ سولو اور ایک دوگانا۔ یہ سارے گانے بیحد مقبول ہوئے۔ اس فلم سے مجروح سلطانپوری جیسے گیت کار کا طلوع ہوا۔ اس فلم کے لافانی گیت یوں تھے۔ ا۔ غم دئے مستقل، اتنا نازک ہے دل، یہ نہ جانا، ہائے ہائے یہ ظالم زمانہ۔ ۲۔ جب دل ہی ٹوٹ گیا

پھر جی کر کیا کریں گے۔۳۔میرے سپنوں کی رانی۴۔اے دل بیقرار جھوم۵۔چاہ برباد کرے گی۶۔کر لیجئے چل کر میری جنت کے نظارے۔

نوشاد نے اپنے ایک انٹرویو کے دوران کہا کہ وہ کندن لال سہگل کا دیوانگی کی حد تک پرستار تھا۔یہ سن 1946 کی بات ہے۔کندن لال سہگل کی طوطی برصغیر میں بول رہی تھی۔ایک دن کا واقعہ ہے نوشاد اور گیت کار ڈی۔این۔مدھوک کاردار اسٹوڑیو میں کسی فلم کے بارے میں بات کر رہے تھے کہ اتنے میں ایک گنجے سر کا ایک دراز شخص جس نے باریک سا چشمہ پہنا تھا کمرے میں داخل ہوا۔ڈی۔این۔مدھوک اُس شخص سے بڑے تپاک سے ملا اور پھر وہ دونوں بہت دیر تک بیٹھ کر باتیں کرتے رہے۔نوشاد پس منظر میں بہت دیر تک کھڑا رہا۔اچانک مدھوک کی نظر نوشاد پر پڑی تو اُس نے اُسے اپنے پاس بلایا اور بڑی سادگی سے اُس سے پوچھا۔''تم ان کو جانتے ہو نا؟''

نوشاد نے نفی میں سر ہلا دیا۔مدھوک اس جواب سے دنگ رہ گیا۔اُس کی حالت دیدنی تھی۔ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم۔اُس نے سراپا حیرت بن کر نوشاد سے پوچھا۔''تم ان کو نہیں جانتے'' نوشاد نے ایک بار پھر نفی میں سر ہلا دیا۔اس بیچ سہگل صاحب مسکراتے رہے۔مدھوک نے تقریباً چلاّ کر کہا۔''نوشاد۔تم اتنے بڑے سنگیت کار ہو اور تم یہ نہیں جانتے کہ یہ کون ہیں۔یہ سہگل صاحب ہیں۔سہگل صاحب''

اب کے نوشاد خوشی سے اُچھل پڑا۔جس شخص کا وہ برسوں سے دیوانہ تھا وہ اُس کے روبرو بیٹھا تھا۔نوشاد آگے بڑھا اور سہگل صاحب سے ہاتھ ملا کر معذرت بھرے لہجے میں بولا۔''سہگل صاحب۔میں نے جس کندن لال سہگل کو اپنے من میں بٹھا رکھا ہے اُس کا سر گنجا نہیں ہے۔وہ ایک دم جوان رعنا ہے۔'' سہگل نوشاد کا جواب سن کر زور سے قہقہہ لگانے لگا۔یہ اُن کی پہلی اور یادگار ملاقات تھی۔

بہت جلد دونوں ایک ساتھ کام کرنے لگے۔فلم تھی '' شاہ جہاں''۔نوشاد کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔سہگل کے ساتھ کام کرنا بہت بڑے اعزاز کی بات سمجھی جاتی تھی۔سہگل جب بھی گانے کی ریکارڈنگ کرتا تھا ریکارڈنگ سے قبل وہ پوجا ارچنا کرنا نہیں بھولتا تھا۔اُس نے کبھی بھی کھڑے کھڑے یا کرسی پر بیٹھ کر گانا نہیں گایا۔جب بھی سہگل کے گانے کی ریکارڈنگ ہوتی تھی،اُس کے لئے ایک مٹرس بچھا دیا جاتا تھا جس پر بیٹھ کر وہ ریکارڈنگ کرتا تھا۔ریکارڈنگ سے پہلے وہ ایک تسبیح ہاتھوں میں لے کر پھیرتا تھا۔پھر وہ تسبیح اپنے بوائے کو سونپ دیتے تھے۔ریکارڈنگ کی تیاری سے پہلے وہ اپنے ڈرائیور یوسف کو بلا لیتے تھے اور اُس سے ''کالی پانچ'' لانے کے لئے کہتے۔وہ بھاگ کر وسکی کی بوتل لاتا تھا۔پھر وہ یہ وسکی ایک بڑے گلاس میں انڈیل دیتا تھا اور سہگل اُسے ایک ہی گھونٹ میں پی جاتا تھا۔دارو سہگل کے پیٹ میں چلی جاتی تھی تو اُس کا سر تال صحیح ہو جاتا تھا۔ایک بار جب بہت سارے ری ٹیک ہونے لگے اور سہگل خم کے اوپر خم چڑھاتے گئے تو اُس کی آواز گڑبڑانے لگی اور وہ ٹھیک سے لفظوں کی ادائیگی نہیں کر پائے۔اُس کی حالت دیکھ کر ریکارڈنگ ملتوی کرنی پڑی۔فیصلہ یہ ہوا کہ اگلے روز ریکارڈنگ کی جائے۔

اگلے روز نوشاد صاحب نے سہگل سے یہ مودبانہ گزارش کی کہ وہ ایک ٹیک بنا دارو کے اور ایک ٹیک دارو پینے کے بعد دیں۔سہگل تردد میں پڑ کر نوشاد سے بولے کہ کیا ایسا ممکن ہے۔نوشاد صاحب نے اُن کا حوصلہ بڑھا کر کہا کہ کوشش کرنے میں کیا حرج ہے۔دو ٹیک ہوئے۔ایک بنا دارو کے اور ایک دارو پینے کے بعد۔جب سہگل کو دونوں ٹیک سنائے گئے تو اُنہیں بنا دارو والا ٹیک اچھا لگا۔گانا تھا''جب دل ہی ٹوٹ گیا،پھر جی کے کیا کریں گے۔''افسوس کہ ایسا نابغہ روزگار،ایسا نستعلیق فن کار وقت سے پہلے ہم سے بچھڑ گیا۔

بقیہ: ''ہم زبان چپ ہو گئے''

کون کون شامل ہوا؟ ہر بات صیغہ راز میں ہے اور حقیقت شاید اُن کی مطلقہ بیوی یا اُس کے بیٹے ہی جانتے ہیں۔

کیا کہوں اور کیا نہ کہوں۔عجیب تذبذب میں ہوں۔طویل عمری کا ایک المیہ یہ بھی ہے کہ آپ اپنے بہت سے عزیز احباب و اقربا کو اپنی آنکھوں کے سامنے ہمیشہ ہمیشہ کیلئے داغِ مفارقت دیتے ہوئے دیکھتے ہیں اور انہیں سپردِ لحد کرنے یا نذر آتش کرنے کا صدمہ بھی جھیلتے ہیں اور کے ان آخری سفر پر خون کے آنسو بہاتے ہیں۔مگر مَیں نے تو اپنے بھائی جیسے عزیز ترین دوست کا انتم سنسکار بھی نہیں دیکھا۔کوئی بھی عینی شاہد نہیں ملا جو کہے کہ میں ان کے داہ سنسکار میں شامل ہوا۔ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کسی شخص کو قتل کر کے بغیر اس کے اعزاء و اقارب کو اطلاع دئے اسے چپکے سے ٹھکانے لگا دیا گیا ہو۔اِسر صاحب زندگی بھر اپنی تحریروں میں سوال کھڑے کرتے رہے اور اب ان کی موت نے بھی کئی سوال کھڑے کر دیئے ہیں اور سبھی کو حیرت واستعجاب کے بحرِ عمیق میں غرقاب کر دیا ہے۔میرا تو بہت ہی قریبی ساتھی ہمیشہ ہمشہ کے لئے داغِ مفارقت دے گیا ہے جسے بھولنا ممکن نہیں اور ان کی وفات سے بڑی شدت سے یہ خیال پیدا ہوا ہے کہ:

ہم زباں چُپ ہو گئے ہم داستاں چُپ ہو گئے
کیسے کیسے محفل آرا ناگہاں چُپ ہو گئے

رس رابطے

جستجو، ترتیب، تدوین

وقار جاوید (راولپنڈی)

جناب محترم گلزار جاوید صاحب، آداب۔

''چہارسُو'' سال ۲۰۱۳ کا پہلا شمارہ مل گیا ہے۔ شکریہ۔ میرا جیسا تیسا ادب سے رشتہ فکشن سے ہے۔ اور شومئی قسمت کہ میں اردو فکشن کے جیّد نقاد عالی جناب پروفیسر وارث علوی کے قرطاس اعزاز کے سپاس گزاروں میں شریک نہیں ہوں۔ بندہ بشر حالات سے اتنا مجبور بھی ہوسکتا ہے، یقین نہیں آتا۔ گوشے کی محفل آپ نے اچھی سجائی۔ میں ذاتی طور پر بھی احسان مند ہوں۔ وارث علوی کی علمی، ادبی اور فکری سوغات ''روح کی اڑان'' شامل کر کے آپ نے اپنے کمالِ انتخاب کو پایۂ ثبوت تک پہنچا دیا۔ یہ معمولی تحریر نہیں بلکہ ایک خطبہ ایک تقریر ہے۔ تحریر کئے ہوئے الفاظ زبان سے ادا کئے ہوئے ارشادات میں بدل کر پڑھنے والی آنکھوں، سننے والے کانوں اور سوچنے والے ذہنوں کو بہ یک وقت گرفت میں لے لیتے ہیں۔ میں نے پڑھنا شروع کر دیا۔ پیراگراف کر کے اور جستہ جستہ۔ ان کے نام اور گجرات سے ان کے تعلق کی اساس پر ان کو ولی دکنی، احمد آبادی، گجراتی کی وراثت کا امین قرار دینے کو جی چاہتا ہے۔

میں نے سب سے پہلے ''روح کی اڑان'' پڑھا۔ اتفاق کی بات کہ فرصت ملتی ہی چلی گئی، میں نے 'چہارسُو' کی جانب رجوع کیا اور کرتار سنگھ دُگل کی کہانی 'رات گئے قتل' اردو ترجمہ جناب حنیف باوا کی وساطت سے پڑھا۔ کیا اچھا ترجمہ کہ ترجمہ نہیں لگا۔ کہانی میں کرتار سنگھ دُگل نے خاکے (مطالعہ کردار) کو ایک وقوعے یا وقوعے کے گمان کی مدد سے کہانی میں بدلا ہے اور یوں کہ پڑھنے والے پر اپنی گرفت کسی مرحلے پر ڈھیلی نہیں ہونے دیتی۔ اس کہانی کے بعد آپ کی تحریر اس کے عنوان سے چونک جانے کے باعث پڑھی کیونکہ میرے لئے چوائس آپ نے رکھا نہ تھا۔ ''وی ہیونو چوائس'' میں آپ نے چھوٹے چھوٹے ان گنت المیہ افسانوں کو ایک لڑی میں پرو کر ہم جیسے کتنے پڑھنے والوں کی خوب خوب کھنچائی ہی نہیں پٹائی کی ہے۔ آپ مانیں یا نہ مانیں گلزار جاوید صاحب آپ کی کہانی ہو یا ڈرامہ، یا پھر کسی اور طرح کی نگارش، ڈرامائیت آ ہی جاتی ہے۔ چنانچہ کہانیوں کے زیرِ نظر اس مجموعے میں (وی ہیونو چوائس کہانیوں کا مجموعہ ہی تو ہے) بھی ایک ڈرامہ موجود پا رہی ہوں جو تقسیمِ ہند اور تشکیلِ پاکستان کے مرحلے سے آج کے زمانے تک کے اسٹیج پر کھیلا جا رہا ہے۔ اس کے علاوہ آپ نے اپنی تحریر کے سفر میں آج کے سائنس اغائی (Imperialism) امپی ریلزم کو بھی نشانہ بنایا ہے۔ جو لائقِ تحسین ہے۔

کرشنا جی (بیگم جوگندر پال) سے میری ٹیلی فونی بات چیت میرے ذہن و دل میں پیوست ہے۔ اس کو کاغذ پر منتقل کر کے آپ کو نذر کیا تو آپ نے ''چہارسُو'' میں جگہ دی۔ مجھے یقین تھا کہ 'چہارسُو' کے قارئین بھی ہمارے عصر کے ایک عظیم افسانہ نگار جوگندر پال جی کے بارے میں ان کی چہیتی رفیقۂ حیات سے اس مکالمے سے ضرور متاثر ہوں گے۔ افسوس ایسا نہیں ہوا۔ بہر حال شگفتہ نازلی صاحبہ نے اس مکالمے سے متاثر ہونے کا اظہار کر کے مجھے بڑی طمانیت دی۔ ''چہارسُو'' کے پڑھنے والوں میں اہلِ دل ابھی بھی موجود ہیں۔

شہناز خانم عابدی (کینیڈا)

محترم گلزار صاحب، السلام علیکم۔

اس ماہ کے شمارے میں قرطاسِ اعزاز آپ نے ''وارث علوی'' جیسی نابغہ ہستی کے نام کیا ہے۔ مسرت ہوئی کہ تنقید کی دنیا کا اہم نام ''چہارسُو'' میں بھی گونجے گا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وراث علوی ایک دینی خانوادے سے ہونے کے باوصف دنیاوی علوم سے متصف ہیں۔ لیکن اُن کے مضامین ''روح کی اڑان'' اور ''پیروئ مغرب'' میں موجود اُن کی تنقیدی بصیرت میں موجود اُن کی نثر نے مجھ جیسے کم علم کو شاید اس لیے متاثر نہیں کیا کہ اس میں ادب کی چاشنی اور لذت کے بجائے کھُردری زبان اور اکھڑا اکھڑا لہجہ استعمال کیا گیا تھا۔ ہاں، اُن پر لکھے گئے مضامین میں ترنم ریاض کی تحریر ''بادشاہ اوروں کی خاطر'' البتہ دلچسپ لگی۔ افسانوں میں گورمکھی زبان کا افسانہ ''رات گئے قتل'' جسے کرتار سنگھ دُگل نے لکھا اور حنیف باوا نے ترجمہ کیا دل کو چھوتا ہوا گزرا دوسرا بہترین افسانہ ''انتظار'' تھا جس میں نصرت بخاری نے بہت خوبصورتی سے انسان اور جانور کے درمیان فرق کو نہ صرف واضح کیا بلکہ افسانے کے آخری جملہ ''کاش کوئی انسان آ جاتا تو میری جان بچ جاتی!'' تک اُس کا حُسن قائم رکھا۔ مجھے خوشی ہے کہ اُن کا فن روبہ ارتقا ہے۔ شمشاد احمد اپنے افسانہ ''ہائے وہ لوگ'' میں ماضی کی اقدار کے ساتھ اپنے فن کی بلندی پر نظر آئے اور بہت خوب نظر آئے۔ گلزار جاوید کا افسانہ ''We Have NO Choice'' تمام افسانوں پر بازی لے گیا۔ دوسری جنگ عظیم کی ایک یادگار سے متاثر ہو کر ایک افسانہ نگار عصرِ حاضر کو کس طرح اُس پر منطبق کرتا ہے یہ کمال اس میں موجود ہے۔ مبارکباد! دیپک کنول حسبِ معمول لیش چوپڑہ کی عظمت پر لکھتے ہوئے انہیں خراج پیش کر گئے۔

غالب عرفان (کراچی)

محترم گلزار جاوید صاحب، آداب و تسلیمات۔

نیا شمارہ ملا، شکریہ۔ پہلے تو حسبِ دستور اسکرین پر آ گیا تھا لیکن کاغذی پیرہن میں جو لطف ہے وہ کمپیوٹر ڈاکومنٹ میں کہاں۔ آپ بڑی جاں سوزی سے رسالہ نکالتے ہیں۔ قرطاسِ اعزاز کسی حقدار کے سپرد کرتے ہیں۔

فکشن کی طرف خاص توجہ ہے، رس رابطے بہت بے تکلف۔ دیپک کنول قابلِ ستائش ہیں۔ مزید تحریریں اور انشائیے سب کے سب اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ بس ایک میدان میں چہارسو شاید اپنے ہی معیار سے کم ہے۔ وہ ہے میدانِ شاعری۔ خوب خوب غزلیں اور نظمیں شائع ہوتی ہیں بڑوں کی بھی اور چھوٹوں کی بھی۔ ہم جیسا شعر پرست، تغزل کا رسیا سانس روکے پڑھتا ہے۔ ہمت کر کے میں نے ایک اور ورق پر جنوری، فروری کے شمارے کی شاعری کا جائزہ لیا ہے اور بے حد خلوص کے ساتھ اُن Irregularities کی طرف اشارہ کیا ہے جو اشعار میں موجود ہیں اور کسی صورت بھی ''چہارسو'' کے شایانِ شان نہیں۔ شاید مدیر چہارسو نے یہ شعبہ کسی اور کے سپرد کیا ہوا ہے یا شاید مدیر ''چہارسو'' فکشن پرست ہوتے ہوئے Rhyaing Relpm سے دور ہیں۔

اس شمارہ میں آپ کا فکشن فیچر ''نو چوائس'' چھپا ہے۔ اپنی طرز کا یہ اچھا اظہار، ۱۳ پڑاؤ استعمال کر کے آپ نے ہمارے معاشرے کی ساری جناثیت، غلاظت اور شرارتِ آئینہ کر دی ہے اور قنوطی انداز میں پیش کی ہے۔ عوام کی بے بسی اور خواص کی بے حسی تبدیل نہیں ہوں گی۔ کوئی فرق نہیں آئے گا۔ یہ معاشرہ سڑ چکا ہے اور ہمارے دانش وراس قدر بزدل ہیں اور شدت پسندی و تنگ نظری ہمارے ضمیر و خمیر میں یوں سرائیت کر گئی ہے کہ اب امیدیں باندھنا خود کو دھوکا دینے کے سوا کچھ نہیں۔ ہم ایک Unstoppable Fast Train ہیں جو رک نہیں سکتی اور کسی مقدس غار میں ہی کریش ہو گی۔ آپ نے اچھا ہی کیا کہ کسی قسم کا ''حل'' پیش نہیں کیا اور کھوکھلی امید کا سہارا نہیں لیا۔ یہ Raw Fiction ایک ڈاکومنٹ کے طور پر انگلش میں بھی چھپ جائے تو بہتر ہے۔

چند ماہ پہلے آپ کا ڈرامہ چھ + ایک بھی پڑھا تھا۔ یہ ایک مکالماتی پلے ہے جس میں لیکھک کے بجائے کردار ہی بدل رہے ہیں عورت مرد مختلف طبقات سے تعلق رکھنے والے۔ آپ نے کُھل کر لکھا ہے اشاروں میں، بہت کچھ کہلوا دیا ہے۔ بازاری اور گھٹیا الفاظ بھی ضروری ہیں۔ ''کل پھر بلایا ہے'' بھی آ گیا اور نسوانی اشارے۔ آپ نے بیس (۲۰) سین پیش کیے ہیں۔ مگر تھیٹریکل کنونشن کے مطابق تو اس میں 16 ایکٹ ہیں۔ ''ساتویں بہن'' کی خودکشی کی دھمکی پر ڈرامہ ختم ہوتا ہے اور قاری کو مایوس نہیں کرتا۔ ہضم ہو جاتا ہے۔ سین ۲۰ میں آپ نے جبار سے ایک شعر پڑھوایا ہے جو دراصل یوں ہے:

پی کے ہم تم جو چلے آئے تری محفل میں
آگ سے آگ لگا دیں گے تری محفل میں

اپنے افسانہ میں آپ نے پروین شاکر کا شعر صحیح نہیں لکھا۔ شعر دراصل یوں ہے:

اُس نے تپتی ہوئی پیشانی پہ جب ہاتھ رکھا
روح تک آ گئی تاثیر مسیحائی کی

اور آخر میں اقبال کے شعر کا دوسرا مصرع یوں ہے

لیا جائیگا تجھ سے کام دُنیا کی امامت کا

تشنہ بریلوی (کراچی)

محترم جناب گلزار جاوید، آداب۔

ہمیشہ کی طرح ''چہارسو'' ہاتھ میں آتے ہی محسوس ہوتا ہے جیسے پوری دنیا مٹھی میں آ گئی ہو کیونکہ پوری دنیا کے تخلیق کار اس میں یکجا ہوتے ہیں اور آپ نے صرف زبانی طور پر نہیں بلکہ عملی طور پر اس دنیا کو گلوبل ویلیج بنا دیا ہے۔ پرچہ ہمیشہ کی طرح عمدہ معیار کا حامل ہے۔ اس دفعہ یہ پرچہ آپ نے پروفیسر وارث علوی کے نام کیا ہے جو بلاشبہ جدید تحقیق و تنقید کا درخشندہ ستارا ہے۔ وارث علوی صاحب پر لکھے ہوئے تمام مضامین بلاشبہ بلند پایہ ہیں بلکہ پروفیسر صاحب اس سے بھی زیادہ کے مستحق ہیں۔

حنیف باوا نے کرتار سنگھ دگل کے افسانے کا جو ترجمہ کیا ہے اچھی کاوش ہے لیکن کہیں کہیں جھول محسوس ہوتا ہے۔ حنیف باوا بلاشبہ ایک عظیم افسانہ نگار ہیں ان کے افسانے اپنے اردگرد کے سماجی مسائل کو اپنے اندر سمائے ہوتے ہیں اس لیے ان کا افسانہ پڑھتے ہوئے کبھی اجنبیت محسوس نہیں ہوتی اور وہ پنجابی میں لکھیں یا اُردو میں لکھیں ان کی زبان ہمیشہ بہتے جھرنوں کی پاکیزگی لیے ہوتی ہے۔

حصہ غزل بھی خوب ہے لیکن اس میں کچھ شاعروں کی غزلیں پچھلے شمارے میں بھی شامل تھیں مثلاً نسیم سحر اور عبدالرحمٰن عبد کی غزلیں شاید اشاعتِ مکرر کے طور پر شامل کی گئی ہیں۔ فیروز عالم کا مضمون ''ہوا کے دوش پر'' خوبصورت یادوں کا گلدستہ ہے اور پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ نظموں کے باب میں بھی خوبصورت نظمیں شامل ہیں۔ الغرض مجموعی طور پر اس پرچے نے ایک اچھا تاثر چھوڑا ہے۔ جو آئندہ شمارے تک برقرار رہے گا۔

انتظار باقی (جھنگ)

مدیر محترم، سلام و رحمت۔

چہارسو کی سالہا سال سے یہ قابل ستائش روایت رہی ہے کہ علمی، ادبی تحریروں پہ مستزاد ''قرطاسِ اعزاز'' کی مستقل رفاقت ہے۔ اس مرتبہ متنوع رنگ و بو سے سجا یہ گلدستہ محترم پروفیسر وارث علوی صاحب سے منسوب ہوا تو بہت خوب ہوا کہ وہ اپنی نوعیت کے نہایت منفرد ناقد ہیں۔ اُن کا اندازِ تنقید مروجہ روش سے یکسر ہٹ کے ہے اور اسلوب نقد و نظر کے پیمانے و زاویے بھی بالکل جداگانہ ہیں۔ ''روح کی اڑان'' ہو یا ''پیروئ مغرب'' قاری کے دل و دماغ کو ان کے مطالعے سے فرحت و مسرت، فراخی و کشادگی، بہجت و لطافت کی سرشار کُن کیفیت محسوس ہوتی ہے اور تخلیق کی ندرت و تازگی، آفاقیت و شگفتگی، بشاشت و سرشاری بقول میلا رے Sublime State of Mind سے ہمکنار کئے دیتی ہے۔

براہ راست کے جوابات میں بھی پروفیسر صاحب کا الگ سا رنگِ

گفتار ترشح ہے۔ تنقید کا نور، تنقیدی بصیرت کا پُر خلوص اظہار یہ ہے۔ بالعموم قرطاس اعزاز کے مضامین میں خواتین کی شمولیت کم کم ہی ہوا کرتی ہے مگر اس مرتبہ پروین شیر صاحبہ اور ترنم ریاض صاحبہ کی اپنے اپنے زاویہ نظر کے ساتھ شرکت اچھی لگی۔ ''نو چوائس'' میں کہانی کہنے کی تکنیک کو عجب جدت سے ہمکنار کیا گیا ہے۔ علامتی ڈھنگ اور استعاراتی رنگ میں ملکی وقومی مسائل ومعائب کی جس دروں بینی سے آپ نے نشاندہی کی ہے اور جس دلسوزی واخلاص مندی سے اُسے حرف حرف محسوس کیا اور مشاہدے میں لائے ہیں وہ اپنی جگہ۔ مستند ومعتبر مگر یہ اظہار یہ سب کے لیے لمحہ فکریہ ہی نہیں راست سمت عملی اقدام اٹھانے کی ترغیب و تحریص بھی ہے۔ ''ہمارا گشتی ادب'' شعری ونثری حوالوں سے دلچسپی کا حامل رہا ''رس رابطے'' کے حوالے سے ایک اعزاز وافتخار ایسا ہے جو بلاخوفِ تردید صرف مجھ تک ہی محدود ہے اور جس کے گواہ ''چہارسُو'' کے سارے شمارے ہیں۔

شگفتہ نازلی (لاہور)

گلزار بھائی، آداب۔

''چہارسُو'' کا تازہ شمارہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ پروفیسر وارث علوی صاحب کی نسبت آپ کی جستجو کامیاب ٹھہری۔ پروفیسر صاحب کے دونوں مضمون اور پروفیسر صاحب کے بارے دیگر احبابِ قلم کے مقالات بہت علمی اور بلند معیار کے حامل ہیں۔ چہارسو میں شامل سبھی افسانے اپنی جگہ خوب ہیں مگر آپ کا ''No Choice'' پڑھ کر دل دھل گیا۔ آپ نے اس قدر سنگین موضوع پر کس قدر دل جمعی کے ساتھ طویل افسانہ لکھ ڈالا۔ افسانہ پڑھتے ہی دل سے بے اختیار دعا نکلی کہ اے دوجہانوں کے مالک اس دنیا بلخصوص ہمارے خطہ پر رحم فرما۔ دونوں طرف بسنے والوں کے بیچ پیار ومحبت کی فضا قائم کر اور ہمارے دشمنوں کو ہوش کے ناخن دے۔ میں بار بار آپ کا افسانہ پڑھ رہی ہوں اور حالات کی سنگینی کی بابت اُف اُف کر رہی ہوں۔ آپ کی کہانی نے میرے ذہن کو اس قدر جکڑ لیا ہے کہ سر پر منوں بوجھ محسوس کر رہی ہوں۔ اگر کہانی پڑھنے والے کو سانس رُکتی محسوس ہو رہی ہے تو جن پر یہ سب کچھ گزر رہی ہے اُن کا کیا حال ہوگا۔ کاش میں آپ کی کہانی پر آپ کو مبارکباد دے سکتی! میری خواہش ہے کہ اگلے ''چہارسُو'' میں آپ کے قلم سے کوئی ہنستی مسکراتی کہانی نکلے جو دلوں اور دماغوں کو سکون بخش دے۔ آمین۔

ڈاکٹر رینو بہل (چندی گڑھ، بھارت)

بھائی گلزار جاوید صاحب، سلام مسنون۔

مجھے چہارسو کا شدت سے انتظار رہتا ہے اور جب ملتا ہے تو دل میں خوشیوں کے پھول کھلنے لگتے ہیں کیونکہ اس میں شامل ہر چیز پڑھنے کے قابل ہوتی ہے۔ اس بار سرورق بھی پہلے سے اچھا لگا۔ پروفیسر وارث علوی کا قرطاس اعزاز اچھا ہے۔ یہ سلسلہ بہت اچھا ہے اور اس سے ہمارے سامنے معزز شخص کی شخصیت اور فن پوری طرح سامنے آ جاتا ہے۔ افسانے تمام ہی خوب ہیں۔ شمشاد احمد، محمد طارق علی، شاہد جمیل، نصرت بخاری، جاوید اختر، شفیع ہمدم اور گلزار جاوید کے افسانے کے کیا ہی کہنے۔ آپ نے علامتی انداز میں ملک کی حالت کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ قابل تعریف ہے۔ دیپک کنول کا ''ایک صدی کا قصہ'' حسب معمول دلچسپ ہے۔ اسی طرح فیروز عالم کی خودنوشت بھی، حصہ نظم بھی معیاری ہے۔ غرض یہ مجلّہ آپ کے حسن ادارت کا مظہر ہے۔

انوار فیروز (راولپنڈی)

پیارے گلزار، بہت بہت پیار۔

بات وہی ہے ''باغ بہاراں تے گلزاراں''۔ چہارسو بعنوان وارث علوی اپنی جملہ لطافتوں، علوی وراثتوں اور ادیبانہ شاعرانہ حماقتوں اور رعایتوں کے ساتھ یہاں خوش منظر ہوا۔ وہ جیسے میں اکثر کہا کرتا ہوں بوئی کے ویرانے میں سو بہ سو، چہارسو کیفیتِ گلزار کا ساسماں بندھ گیا۔ رس رابطے رسیلے لہجوں اور لفظوں سے آویزۂ گوش ہوئے۔ آنکھوں میں بسے، دل میں اُترے کانوں میں ترنم ریز ہوئے۔ وارث علوی کی علمی ادبی کاوشوں کا ''روپ سروپ'' پاکستان کے حوالوں اور مقالوں میں بھی باقیا ہے۔ فی الواقع تنقید کے نور کی حد بندی نہیں ہوتی۔ یہ اپنے تاثرات اور ثمرات لے کر چہارسو پھیل جاتا ہے۔ عبد اللہ جاوید کو کہ میرے دیرینہ آشنا ہیں، دیکھ کر خوشی ہوئی۔ حسن عسکری کاظمی کو لفظوں کی آئینہ بندیوں سے پہچانا ہوا ہے۔ ''زبان تصوف میں جو کچھ لکھا ہے یہی کچھ لکھا ہے'' دل گداز پیرایہ ہے۔ کاظمی صاحب سے اکادمی ادبیات کی بین الاقوامی اہل قلم کانفرنس میں ملاقات ہوئی تھی۔ ایسی محبت سے ملے کہ دل صدقے قربان ہوگیا۔ بہت خوشی کی بات یہ ہوئی کہ میں نے جب افضل احسن رندھاوا سے اپنا تعارف کرایا تو انہوں نے میرا ہاتھ چوم لیا۔ گویا آفتاب حقیر کے دامن میں اُتر آیا۔

آصف ثاقب (بوئی، ہزارہ)

محترم گلزار جاوید، السلام علیکم۔

پروفیسر وارث علوی کو ''قرطاسِ اعزاز'' عطا کر کے ''چہارسُو'' کے قارئین پر ایک اور علمی وادبی احسان کیا ہے۔ ''براہِ راست'' میں ہمیشہ کی طرح آپ کے گہرے مطالعے کے ترجمان جرأت مندانہ سوالات اور وارث علوی صاحب کے بے باک جوابات، کسی کسی سوال پر پروفیسر صاحب چڑچڑاہٹ کا شکار ہوگئے نہ جانے کیوں؟ وارث علوی صاحب پر لکھے گئے مضامین اور فن کے متنوع زاویے سامنے آئے ہیں خصوصاً شفاعت قادری، ش۔ک۔ نظام اور پروین شیر کی تحریریں انتہائی اہم ہیں۔

گلزار بھائی آپ نے دوسری جنگ عظیم کے دوران برطانیہ میں ہلاک ہونے والے پرندوں کی یادگار پر کندہ They Have No Choice سے متاثر ہو کر لکھے گئے افسانے ''We Have No Choice'' میں پاکستان کی سماجی، معاشی اور سیاسی تاریخ کا نوحہ لکھ دیا ہے۔ ہر پڑاؤ میں ایک بڑے ایشو

کو علامتی انداز میں پیش کیا ہے۔ کوئٹہ، کراچی، پشاور، لاہور، فیصل آباد، اسلام آباد اور دیگر شہروں اور شخصیات کے چمکتے دمکتے ماضی کو دھواں دھواں ہوتے دکھایا ہے اس افسانے کا زادِ راہ دکھ، مصیبتیں، آہیں، بھوک، جلتے گھر، قتل وغارت گری، عدم تحفظ اور بہتا لہو ہے۔

نصرت بخاری کا افسانہ ''انتظار'' ایک نیم علامتی ہے بہت کچھ سمجھایا گیا ہے کہانی میں ''امید'' پر فوکس ہے مگر اُمید کس سے؟ جاوید اختر کا افسانہ ''شناخت'' دلچسپ ہے۔ اس میں پیش کردہ مسئلہ شاید ہر باشعور شخص کا ہے۔ محمد طارق علی نے ''زرد دائرے'' میں باطن سے اٹھنے والے سوالات کے جوابات تلاش کرنے کی کوشش کی ہے اختتام چونکا دینے والا ہے۔ کرتار سنگھ دُگل کی کہانی ''رات گئے قتل'' کا ترجمہ بہت رواں ہے حنیف باوا کے انتخاب کی بھی داد دیتا ہوں۔

غزلوں میں سید مشکور حسین یاد صاحب کی انفرادیت ہر بار متاثر کرتی ہے۔ آصف ثاقب صاحب نے مسکراتی کھلکھلاتی غزل کہی ہے ڈاکٹر یوگیندر بہل تشنہ نے چھوٹی بحر میں کمال کی غزل کہی ہے۔ سید خورشید کاظمی کی غزل اچھی ہے مگر ردیف نے دھمکی آمیز لہجہ پیدا کر دیا ہے۔ نصرت زیدی، نسیم سحر، رب نواز مائل، پروفیسر زہیر کنجاہی، اشرف جاوید، صدیق شاہد، سیفی سرونجی، کرامت بخاری، انجینئر سید تقی محمد، شگفتہ نازلی، خورشید انور رضوی، نزہت انیس، تصور اقبال، محمود کاوش اور اجیت سنگھ حسرت کی غزلوں میں تازگی بھی ہے اور عصری شعور کی کیفیت بھی، فکر بھی ہے اور امکانات بھی۔ حسن عسکری کاظمی، شفیق احمد فاروقی اور صابر عظیم آبادی کی نعتوں میں عقیدت بھی ہے اور جستجو بھی۔

ڈاکٹر فیروز عالم کی خودنوشت سوانح عمری ''ہوا کے دوش پر'' کی قسط نمبر پندرہ کا مطالعہ پُر لطف رہا جس نے ذہن ودل کو ایک عجیب سی راحت بخشی۔ موجودہ قسط میں ڈاکٹر صاحب نے اپنے بارہویں کے نتیجے (پوزیشن) لیاقت میڈیکل کالج میں داخلے کی دلچسپ داستان بیان کی ہے۔ یہ خودنوشت میر پور خاص کے علمی وادبی حلقوں میں ذوق وشوق سے پڑھی جارہی ہے۔

نوید سروش (میر پور خاص)

میرے گلزار، خوش رہو۔

ہر بار تازہ چہارسو ملنے پر میرا دل باغ باغ ہو جاتا ہے مگر اس بار چہارسو کا وارث علوی نمبر وصول پا کر میں سرتاپا شرابور ہو گیا ہوں۔ پروفیسر صاحب واقعی بڑے عالم فاضل اور جہاندیدہ شخص ہیں۔ آپ کے ہاں الفاظ و تراکیب کا ذخیرہ بھی آج کے دور کے کسی بھی ادیب اور ناقد سے کہیں زیادہ اور کہیں بہتر ہے۔ اگر شمارے کے تمام مشمولات الگ بھی کر دیئے جائیں تو پروفیسر صاحب کے دو مضامین ''روح کی اڑان'' اور ''پیروئ مغرب'' شمارے کا حاصل اور اُس کی جان ہیں۔ ہاں مگر ایک تخلیق ایسی بھی ہے جو تن تنہا صحرا میں کھڑی اذان دے رہی ہے۔ ''We Have No Choice'' تحریر کر کے آپ نے ایسا قرض ادا کیا ہے جسے اگر بھلایا یا فراموش کیا جائے گا تو اُن لوگوں کا اپنا نقصان ہوگا جو اس عمل کے مرتکب ہوں گے۔ ہر چند آپ کی تحریر پڑھ کر آدمی ایک مرتبہ کے لیے غم کی گہرائی میں گر جاتا ہے مگر جوں جوں تحریر اُس کے خون میں شامل ہوتی ہے تو اُسے اندازہ ہوتا ہے کہ اُس کے گردوپیش میں کیا ہو رہا ہے اور کیا کچھ ہونے جا رہا ہے۔ شاباش، زندہ باد میرے گلزار اسی طرح ہمت اور بہادری سے قلم کا قرض چکاتے رہو!

یوگیندر بہل تشنہ (بھارت)

جناب گلزار صاحب، السلام علیکم۔

وارث علوی صاحب پر مبنی چہارسو کا تازہ شمارہ ملا۔ یہ ایک ضخیم ادبی دستاویز ہے۔ کچھ اپنے پیشے کی مصروفیت اور کچھ عرصہ سے ملک سے باہر رہنے کی وجہ سے مجھے برصغیر کے لکھنے والوں سے کما حقہ واقفیت نہیں تھی جواب چہارسو کے ذریعہ پوری ہو رہی ہے۔ میں وارثی صاحب کے فن اور اردو ادب میں انکی خدمات سے بہت متاثر ہوا۔ ان پر لکھا مواد پر مغز ہے اور میں نے اسے بڑی توجہ سے پڑھا۔ یہ ضرور کہوں گا کہ انکے ''مضمون روح کی اڑان'' کی زبان اور مزاج مجھے کافی تلخ لگا۔ مگر ان پر شاہ فیصل کا مقالہ سخن گسترانہ بات ایک اعلیٰ پیمانے کی تحریر ہے اسی طرح ایجازِ بیان نے بھی متاثر کیا۔

اس کے بعد آپکی اور قائین کی اجازت کے ساتھ میں اپنی سرگزشت کی اشاعت کے سلسلے میں کچھ کہنا چاہتا ہے۔ میں ایک نہایت جذباتی انسان ہوں اور میری فطرت بہت ہی احسانمندانہ ہے۔ جیسا میں نے اس سرگذشت کے اولیں صفحے پر لکھا تھا اس سرگزشت کے لکھنے کا مقصد تو صرف یہ تھا کہ میں صرف اور صرف اپنے لئے یا حد سے حد اپنے ان چند میر پور خاص کے دوستوں کے لئے ان یادوں کو قلم بند کرلوں جو ذہن میں دھندلانے لگی تھیں مگر گلزار صاحب آپ نے اصرار کر کے اور میری حوصلہ افزائی فرما کر اسے شائع کرنا شروع کر دیا۔ آپ نے ایک ذرّے کو آفتاب بنا دیا۔ ایک گمنام شخصیت کی زندگی کی داستان سے کسی کو کیوں دلچسپی ہو سکتی تھی مگر آپ کے قارئین نے اسے شرف قبولیت بخشا جس کے لئے میں ان سب کا تہہ دل سے مشکور ہوں۔ یہ سب اب میرے دوست ہیں اور اسکو پڑھ کر اپنی قیمتی رائے سے مجھے نوازتے ہیں یہی ہیں جو اسے جاری رکھنے کا حوصلہ دیتے ہیں۔ یوگندر بہل تشنہ، مہندر پرتاب چاند، شگفتہ نازلی، رینو بہل، نوید سروش، انوار فیروز اور دیگر احباب مستقل میرا ہاتھ تھامے ہوئے ہیں اور مجھے لکھنے کا حوصلہ دیتے ہیں یقین کیجئے ان تمام احباب کے لئے میرے جو جذبات ہیں اس کی ترجمانی اس امریکی گیت سے ہوتی ہے۔ You are the wind beneath my wings یعنی جو ہوا مجھے اڑان کی طاقت عطا کر رہی ہے وہ تم ہو۔

اس شمارے میں ایک خط ایسا بھی تھا جو مجھے دور بہت دور ماضی کے

کھوئے لمحات میں لے گیا۔شاید ۱۹۶۸ کا آخیر تھا۔میں میڈیکل کالج سے اپنے گھر میر پور خاص آیا تھا۔کراچی ٹیلیوژن کی نشریات میر پور خاص میں بہت ہی مشکل سے نظر آتی تھیں۔پھر شہر میں شاید کل چار ٹی وی سیٹ صرف روٗسا کے یہاں تھے وہ بھی صرف ''شو'' کے لئے اس لئے کہ رسپشن برائے نام تھا۔میرے ایک رشتہ دار کے یہاں ٹی وی تھا۔انہوں نے ہمیں خاص طور سے مدعو کیا کہ ایک ڈرامہ ''عید کا جوڑا'' نشر ہو رہا ہے پورا ملک اس کو دیکھنے کو بیقرار ہے آپ لوگ بھی آ کر یہاں دیکھ لیں۔ہم وہاں پہنچے۔بس سکرین پر کچھ چھپاکے سے آتے تھے کبھی تصویر غائب تو کبھی پردے پر لہرئے مگر اس کے باوجود جس کردار نے ناظرین کو اپنی سحر انگیز شخصیت، اپنی دلنشیں آواز، بولنے کے انداز، اپنی شوخی اور اپنے سانولے اور تیکھے نقوش سے اپنی گرفت میں لے لیا تھا وہ تھی نیلوفر علیم، جو بعد میں نیلوفر عباسی کے نام سے ایک عرصے ٹی وی کی خاتون اوّل بن کر ہمارے سیرئلز پر راج کرتی رہیں۔کیا میں نے اس وقت سوچا تھا کہ یہ گمنام، کم عمر اور کم حیثیت لڑکا کبھی ان سے ملاقات کا شرف حاصل کریگا۔میں اس شمارے میں نیلوفر صاحبہ کا خط پڑھ کر حیران رہ گیا۔یہ میرے لئے ایک نہایت خوشگوار حیرت کا باعث تھا کیونکہ ایک عرصے سے ان سے کوئی رابطہ نہ تھا سالوں پہلے ان سے ملاقات ہوئی تھی۔میرے لئے تو وہ ایک یادگار لمحہ تھا مگر مجھے خیال نہ تھا کہ میں انہیں اب بھی یاد ہوں گا۔میں نے انہیں شکریہ کا فون کیا نہایت محبت اور خلوص سے ملیں یہ انکی بڑائی ہے،گلزار صاحب آپکا اور چہارسو کا شکریہ کہ آپ نے مجھے اتنے اچھے دوستوں سے ملوایا جن میں مندرجہ بالا افراد، جو ہر شمارے میں اس ناچیز کی تحریر کو سراہتے ہیں، بھی شامل ہیں۔یہ سب اب میرے دل کے بہت قریب ہیں۔

اب کچھ مندرجات کے بارے میں۔سب سے پہلے آپ کے علامتی و استعاراتی افسانے NO CHOICE کا تذکرہ ضروری ہے،بہت ہی متاثر کن تحریر ہے۔شروع ہی میں قاری گرفت میں آجاتا ہے مگر متن کچھ دیر میں سمجھ میں آتا ہے۔وقت آخر، موت کے فرشتے کے ساتھ عرش معلیٰ کی سیر اور جہانِ بالا سے ارض خاکی پر نظر۔پھر آپ نے جن شہروں کا تذکرہ کیا ہے اور انکے درخشاں ماضی سے انکے افسوسناک حال کا موازنہ کیا ہے اس سے ہر محبّ وطن خون کے آنسو رونے لگے گا۔اب تو ہر شخص کے لبوں پر یہ ہے کہ ''ہم کہاں سے کہاں آ گئے'' کیا کسی کو سن ساٹھ کی دہائی کا پاکستان یاد ہے، کہاں چلا گیا وہ ملک؟؟ آپ حساس ہیں اسی طرح لکھتے رہئے کہ بقول شاعر:

شاید کہ ترے دل میں اتر جائے میری بات

کرتار سنگھ دگل کا افسانہ میں نے بڑے اشتیاق سے پڑھا کیونکہ میں پنجاب کے دیہی پس منظر میں لکھے افسانوں کا شوقین ہوں اسکا ترجمہ حنیف باوا نے بہت رواں اور خوب کیا ہے افسانے میں سسپنس بھی ٹھیک ٹھاک تھا مگر مجھے اسکا انجام کچھ غیر حقیقی لگا۔ایک نوجوان جوڑے کو صرف باہمی بوس و کنار کرتے دیکھنے سے تائی کا دم کیسے نکل سکتا ہے۔یہ قدرتی یا ڈاکٹری طور پر تو ممکن نہیں۔باقی افسانے جاندار ہیں۔ان کے لکھنے والے سب اردو ادب میں معتبر حیثیت رکھتے ہیں۔حصہ نظم اس دفعہ بہت مضبوط ہے۔خیال آفاقی، صفوت علی صفوت، پنہاں، جاوید زیدی، یوگندر بہل تشنہ اور دیگر شعرا کا کلام پسند آیا مگر خاص طور سے منور علی منور کا ملالہ اور شگفتہ نازلی کا قربتیں اور فاصلے نے زیادہ متاثر کیا نہ صرف میں بلکہ میرے تمام احباب دیپک کنول کا فلم سے متعلق مضمون بیحد دلچسپی سے پڑھتے ہیں۔چوپڑہ برادران میرے پسندیدہ فلمساز رہے ہیں۔

گلزار صاحب چہارسو ایک ایسی انجمن ہے جس سے ہم جیسے بہت سے ترسے ہوؤں کو باذوق افراد کی ہم نشینی کا شرف حاصل ہو رہا ہے۔یہ ایک ایسی شمع ہے جسکی روشنی سے کئی گوشے منور ہو رہے ہیں۔اسکا بوجھ آپ تنہا اٹھائے ہیں میرا ادنیٰ سا مشورہ ہے کہ اب اسکے زرِ سالانہ کے لئے اشاروں یا کنایوں کی زبان ''دل مضطرب نگاہ شفیقانہ'' ترک کیجئے۔ویسے بھی آجکل اشاروں کنایوں کا زمانہ گذر چکا ہے۔نہ کاغذ مفت ہے نہ چھپائی، نہ ہی ڈاک کے اخراجات کہ ایک امریکی محاورے کے مصداق وہاں آپ کی نانی کام نہیں کرتی کہ ڈاک کی ترسیل مفت ہو جائے۔میرا ایک مشورہ ہے کہ برصغیر کے سوا کم از کم غیر ممالک میں رسالہ وصول کرنے والا ہر شخص باقاعدگی کچھ نہ کچھ مناسب طریقے پر بھیجے تو'' اس سے بہتوں کا بھلا ہوگا'' اللہ آپکو سلامت رکھے۔آمین

فیروز عالم (یو۔ایس۔اے)

ڈیئر گلزار جاوید صاحب، سلام مسنون۔

''چہارسو'' پابندی سے مل رہا ہے، کم از کم یہ تو پتہ چلتا ہے کہ بھارت اور دیگر ممالک کے اردو/ ہندی تخلیق کار کیسے سوچتے ہیں، کیا لکھتے ہیں۔ہمارے حکمرانوں نے وطن عزیز کو یوں کاٹ کر الگ سے ایک جزیرہ یا بندی خانہ بنا رکھا ہے۔ایران، افغانستان اور بھارت سے ہمارے تعلقات کشیدہ رکھے جاتے ہیں۔ہم دنیا تو کیا اپنے ریجن میں بھی اکیلے، تنہا اور محبوس ہیں جس کے باعث ہم سبھی Mass Psychosis کے مریض بن گئے ہیں۔ایسی Alienation اور ایسا Premitive رجحان زمانہ قدیم کے قبائلیت کا حصّہ تھا۔جب لوگ مختلف وادیوں میں بکھرے بکھرے خوفزدہ تھے۔اپنی ہی نرگسیت کا شکار رہا کرتے کہ پاس پڑوس کے لوگ ان کے پانی، چراہ گاہ یا مال مویشی پہ قبضہ نہ کر لیں۔اب بھی مکران میں سیاح یا غیر مقامی کو ڈنی مردم کہا جاتا ہے۔چہارسو تو گویا اس بیماری کے خلاف ایک جہاد ہے جس کے باعث ہمیشہ سے میرا پسندیدہ جریدہ رہا ہے۔

آغا گل (کوئٹہ)

محترمی و مکرمی گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

اس بار ''قرطاسِ اعزاز'' میں پروفیسر وارث علوی کے فن اور شخصیت کا تعارف جس طرح آپ نے اور دیگر مضمون نگاروں نے پیش کیا وہ

قابلِ مبارکباد ہے۔ پروفیسر صاحب کی شگفتہ تحریر ''روح کی اُڑان'' نے متاثر کیا۔ تنقید نگاری اور شگفتگی تحریر کا ملاپ خاصا خوشگوار ہے جو پروفیسر صاحب کا خاصہ ہے۔ ''تنقید کا نور'' میں محترم وفا جونپوری نے بڑی خوبی کے ساتھ اُن کے فن کو سراہا ہے۔ دیگر تحریروں نے بھی بڑا لطف دیا۔ ''چہارسُو'' کا ہر شمارہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے اور یہی دعا دل سے نکلتی ہے کہ یہ شمارہ ہمیشہ ترقی کی جانب گامزن رہے۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ عزّ وجل آپ پہ ہمیشہ مہربان رہے۔ آمین

ندیم ہاشمی (کراچی)

جناب گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

اس بار بھی ''چہارسُو'' محبتوں کی خوشبو لیے موصول ہوا تہہ دل سے ممنون ہوں۔ ہمیشہ کی طرح پرچہ خوبصورت اور معیاری تحریروں سے عبارت ہے۔ استفادے کی ہزار ہا صورتیں بہم ہیں۔ آپ جانیں میں نے پورا پرچہ بصد شوق پڑھا ہے۔ آپ کی تحریر پرچے کی جان ہوتی ہے (بے ریا) میں آپ کی تحریریں بطورِ خاص پڑھتا ہوں۔ تقریباً تین ہفتے ''چہارسُو'' میری ملکیت ہوتا ہے۔ پھر باقی گھر والے قبضہ جما لیتے ہیں اور آخر میں دیگر احباب استفادہ کرتے ہیں۔ اُس وقت تک نیا شمارہ آ جاتا ہے ''چہارسُو'' کا ساتھ اور فراغت کے لمحات گویا لازم و ملزوم ہیں۔

تصور اقبال (اٹک)

جناب گلزار جاوید صاحب، آداب۔

'چہارسُو' کا تازہ شمارہ جنوری، فروری ۲۰۱۳ء موصول ہوا شکریہ۔ اس بار صفحۂ قرطاس میں صاحبِ اعزاز پروفیسر وارث علوی صاحب کا نام پڑھ کر بے حد مسرت ہوئی۔ 'چہارسُو' ہمیشہ اُن ادبی شخصیات کو ہی قرطاسِ اعزاز میں اعزاز دیتا ہے جو حقیقتاً اس اعزاز کے صحیح حق دار ہوتے ہیں آپ سیپ میں بند موتی ڈھونڈنے میں مہارت رکھتے ہیں۔ قرطاسِ اعزاز کی اس شخصیت نے جہاں ذہن کو ادب کے کئے نئے زاویوں سے روشناس کروایا وہاں کہیں کہیں تو اُن کے خوبصورت جوابات ہمارے لبوں پر مسکراہٹ بکھیرتے چلے گئے گو کہ وہ مسکراہٹ کہیں کہیں معنی خیز بھی تھیں۔ جناب شفاعت قادری صاحب کا مضمون ''جب بھی دیکھا تجھے'' میں وہ وارث علوی صاحب کے بارے میں خوبصورت لہجے میں گفتگو کرتے ہوئے ہم پر یہ بات عیاں کرتے چلے گئے ''کہ دراصل اُن کے تنقیدی رویے ایک ایسے مہذب آدمی کی طرح ہے جو دوسرے مہذب آدمی سے سرگرم گفتگو کر رہا ہو''۔ ان کے علاوہ دیگر احباب نے بھی وارث علوی صاحب کے مزاج اُن کے تنقیدی رویوں اور اُن کی شخصیت کی کئی پرتیں ہمارے سامنے بیان کیں۔

''ہمارا گشتی ادب'' ڈاکٹر معین قریشی صاحب نے اپنے اس مضمون میں جس مہارت سے گشتی ادب پر بھرپور روشنی ڈالی ہم اب تک اس سے محروم تھے۔ دیپک کنول صاحب کا 'ایک صدی کا قصہ' (لیش چوپڑہ) ایک معلوماتی اور دلچسپ انداز میں اُن کے بارے میں تفصیلی معلومات لیے ایک مکمل مضمون رہا جو ہمیں بے حد پسند اس لیے بھی آیا کہ وہ ہمارے پسندیدہ ڈائرکٹرز میں سے ایک ہیں اور ہم نے اُن کی تمام فلمیں دیکھی ہیں اس لیے اس کا لطف ہی الگ تھا۔ دیپک صاحب نے اس مختصر سے مضمون میں اُن کی پوری زندگی کی کہانی کو تفصیل سے بیان کر دیا۔ ستیہ پال آنند، پروفیسر خیال آفاقی، عبد اللہ جاوید، پروفیسر حسن عسکری کاظمی، مناظر عاشق ہرگانوی اور وشال کھلر صاحب کی شعری تخلیقات اچھی لگیں۔ 'خطوطِ غم' میں غالب عرفان، نصرت زیدی، نسیم سحر، صابر بدر جعفری، صفوت علی صفوت اور ڈاکٹر پنہاں کا کلام قابلِ تعریف ہے۔ میرے افسانے 'کوئے بہت ہیں' پر جن احباب نے اپنی رائے دی میں اُن سب کی بے حد ممنون ہوں اُمید ہے کہ آپ سب آئندہ بھی میری حوصلہ افزائی اور رہنمائی کرتے رہیں گے۔

رومانہ رومی (کراچی)

برادرم گلزار جاوید، تسلیمات۔

چہارسُو کی گونج چاروں طرف سنائی دیتی ہے، ہر دو مہینے کے بعد اتنا بھرپور جریدہ شائع کرنا اور اُس میں قرطاسِ اعزاز کے عنوان کے تحت کسی ایک شخصیت کے بارے میں اتنی جامع معلومات فراہم کرنا کوئی آسان کام نہیں، اور آپ اِس مشکل کام کو یوں آسان بنائے ہوئے ہیں کہ نہ صرف آپ پر رشک آتا ہے بلکہ تہہِ دل سے دُعائیں بھی نکلتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو یہ اہم ادبی کام کرنے کی توفیق ارزانی کرتے رہیں۔ تازہ شمارے میں پروفیسر وارث علوی کے لئے قرطاسِ اعزاز خود چہارسُو کے لئے بھی باعثِ اعزاز ہے کہ پروفیسر صاحب کی ادبی خدمات اتنی متنوع اور بیکراں ہونے کے باوجود اِس انداز میں اُن کے لئے کسی ادبی جریدے میں ایسا عمدہ گوشہ نہیں دیکھا تھا۔ جن الفاظ میں آپ نے خود اُن کے لئے اظہارِ ممنونیت کیا ہے وہ بھی کیا خوب ہے کہ ''پروفیسر وارث علوی نے پیرانہ سالی اور روز بہ روز گرتی صحت کے عالم میں اس اشاعتِ خاص کے لئے جس قدر تعاون، شفقت اور رہنمائی فرمائی اس کے بعد وہ تمام الفاظ، معنیٰ و مفہوم سے معذور ہو گئے جن کے ذریعے اظہارِ ممنونیت کیا جاتا ہے''۔

مَیں نے اُن کے بارے میں اِس شمارے میں شامل کچھ مضامین پڑھے ہیں اور کچھ ابھی باقی ہیں، یقیناً یہ بھی قابلِ مطالعہ ہیں اور اُس کے بعد یہ شمارہ میری کتابوں کی الماری کے اُس شیلف کی زینت بن جائے گا جس میں مَیں ایسی کتب اور جرائد اپنی نظروں کے سامنے رکھتا ہوں جن کی ضرورت حوالے کے لئے اکثر پڑتی رہتی ہے۔ اِس سے پہلے کسی ایک جگہ پر میرے پاس پروفیسر صاحب کے بارے میں اتنا مواد دستیاب نہیں تھا۔ اُن کے بارے میں صفحہ نمبر چار پر جو تفصیلات دی گئی ہیں اُن میں اُن کی تاریخِ پیدائش اور میٹرک بی اے، ایم اے وغیرہ کی ڈگری حاصل کرنے کا سال نہیں دیا گیا۔ آپ کے اُن کے ساتھ انٹرویو میں بھی اس بارے میں کوئی ذکر دکھائی نہیں دیا۔

نسیم سحر (جدہ)

..... احداحد .....

پروفیسر خیال آفاقی کی حمدیہ شاعری میں اُن کا لہجہ نہ صرف یہ کہ اوروں سے مختلف ہے بلکہ اُن کی پاکیزہ فکر میں ایک خاص حُسن اور ندرت کا عنصر نمایاں ہے۔ اُن کی حمدیہ شاعری میں نہ صرف اُن کے دل کی دھڑکنیں صاف سُنائی دیتی ہیں بلکہ بندگی کا اِک سلیقہ وقرینہ بھی نظر آتا ہے۔ انہوں نے تیرگی میں توحید کا اِک دیا جلایا ہے جس کی روشنی سے لوگ فیضاب ہوتے رہیں گے۔ میں پروفیسر خیال آفاقی کے مجموعہ حمد ''اَحداَحد'' کا قلب کی گہرائیوں کے ساتھ خیر مقدم کرتا ہوں اور ان کو مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ مجھے اُمید ہے کہ ان کا حمدیہ کلام بارگاہِ ربُّ العزت میں قبولیت کا درجہ حاصل کرے گا۔ ذوقِ حمد رکھنے والے صاحبان کے لیے یہ مجموعہ حمد، ایک رُوح پرور و دلنشیں تحفہ ہے، کیونکہ خیال آفاقی نے اپنی عقیدت کو عجز کے سانچے میں ڈھال کر ربِّ واحد کی بندگی کا حق ادا کرنے کی خوبصورت کوشش کی ہے۔ .....طاہر سلطانی

ایک سواڑسٹھ صفحات مجلد، سالِ نو کا یہ تحفہ ایک سو پچاس روپے کے عوض نوشین سینٹر، ۲/۱۹، اردو بازار، کراچی سے طلب کیا جاسکتا ہے۔

..... بے زمیں بے آسماں .....

یہ کہانی کریم الدین نامی ایک ایسے شخص کے گرد گھومتی ہے جو ناول کے شروع میں ایک جھلک دکھانے کے بعد دوبارہ اُس وقت نمودار ہوتا ہے جب وہ ساحلِ سمندر پر مچھلیاں پکڑنے میں مصروف ہے اور ناول کا ایک اور اہم کردار ضمیر احمد اُسے مسٹر اولڈ جینز کے نام سے یاد کرتا ہے۔ کریم الدین کو ہم اس ناول کی مرکزی کردار ''رابعہ'' کے بعد دوسرا بڑا کردار کہہ سکتے ہیں کہ یہ دونوں افراد ''دارا'' نامی جہاز کے دبئی کے سمندر میں ڈوب جانے پر بھی زندہ بچ گئے تھے اور پھر زندگی کے کسی موڑ پر ان کی ملاقات ہوگئی تھی جب وہ بوڑھا ہو چکا تھا اور رابعہ ایک جوان مطلقہ عورت تھی۔ کہانی کے معاون کردار ملک پرواز جؔ ادشاہ اور قادر بخش بھی ناول میں جیتے جاگتے، چلتے پھرتے انسان نظر آتے ہیں کہ ان کے رہن سہن اور غم وشادی کی جھلکیاں پورے طور پر دکھائی دیتی ہیں۔ چند لمحوں کے لیے سامنے آنے والی کردار مثلاً جولیا، جان کرانسکی، بیکری کا بوڑھا اور شالنی وغیرہ بھی قاری پر گہرا اثر چھوڑتے ہیں۔ ''بے زمیں بے آسماں'' کا اسلوب نہایت سادہ اور دل میں اُتر جانے والا ہے۔ اسے ہم جدید اُردو ناول نگاری میں ایک اضافہ قرار دے سکتے ہیں۔ ..... شاہد شیدائی

دوسو بائیس صفحات مجلد، ۲۰۱۲ء میں اشاعت پذیر یہ ناول چار صد روپے کے عوض بک سٹریٹ، ۲/۴۶، مزنگ روڈ، لاہور پر دستیاب ہے۔

..... نیرنگِ مزاح .....

جناب شجاع الدین غوری اپنے حلیے اور وضع قطع سے دیکھنے والوں کے ذہنوں پر حضرت اکبرالہ آبادی کا تصور مرتسم کرتے ہیں۔ لہٰذا اس میں حیرانی والی کوئی بات نہیں کہ انہوں نے اپنے جذبات واحساسات کے اظہار کے لیے مزاح کی روش کو اپنایا۔ اگرچہ نثر کی صورت میں اسے بھی ایک حسن اتفاق سمجھئے کہ ان کی زیرِ نظر کتاب ''نیرنگِ مزاح'' کا آغاز اکبرؔ ہی کے ایک مقبولِ عام شعر سے ہوتا ہے (پلاؤ کھائیں گے احباب۔۔۔) غوری صاحب ایک خوش مزاج زندہ دل، متواضع اور متوازن شخصیت کے مالک ہیں۔ گفتگو میں پھل جھڑیاں تو چھوڑتے ہیں لیکن دل کے ساتھ ''پاسبانِ عقل'' بھی رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ابتذال یا اشتعال ان کی طبیعت سے لگّا نہیں کھاتا۔ پہلی ہی ملاقات میں فریقِ ثانی کو یہ تاثر دینے میں کامیاب رہتے ہیں کہ گویا اس سے برسوں کی شناسائی ہو۔ چنانچہ ان کا حلقہ احباب وسیع سے وسیع تر ہوتا جارہا ہے۔ موصوف زبان ہی سے نہیں، قلم سے بھی لوگوں کو اپنا گرویدہ کرلیتے ہیں۔ ..... ڈاکٹر ایس ایم معین قریشی

ایک سواٹھائیس صفحات مجلد، سالِ نو کا یہ ڈکاہی تحفہ، سٹی بک، نوید اسکوائر، اردو بازار، کراچی سے دستیاب ہے۔

ماہنامہ
چہارسو
راولپنڈی
TIONAL URDU MARSIA CONFER
عالمی اردو